خدابخش لائبریری

جرنل

پٹنہ

۷۸ - ۸۰

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

خدابخش لائبریری

جرنل

پٹنہ

۷۸ — ۸۰

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر: ۲۲۳۲۳/۷۷
شمارہ: اٹھہتر تا اسّی
اس شمارہ کی قیمت: پچھتر روپے

سالانہ: ۳۰۰ روپے (ہندمیں)
۶۰ ڈالر ایشیا، ۱۲۰ ڈالر دیگر ممالک

۱۹۹۲ء

مصطفےٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دہلی میں چھپواکر، خدا بخش لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا۔

فہرست

جہانِ غالب

مخطوطات شناسی

تاریخ ہند: عہد وسطیٰ

جناح

جہانِ سرسید

جہانِ ودود

جہانِ آزاد

اشاریے

مراسلات

حصہ انگریزی

زمانہ کی

غالبیات

(دیا نرائن نگم کے)

'زمانہ' (۱۹۰۳ تا ۱۹۴۲) سے ایک انتخاب



زمانہ (کانپور) کا شمار اردو کے بڑے رسائل میں شمار کیا جاتا ہے۔ دیا نرائن نگم اعلیٰ درجہ کا ادبی علمی ذوق رکھتے تھے۔ نگم مرحوم کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اچھے لکھنے والے تو تھے ہی بہت اچھے ایڈیٹر بھی تھے۔ زمانہ میں مختلف موضوعات پر اتنا اچھا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے کہ کم ہی کسی دوسرے رسالے میں ہو گا۔

مرزا غالب پر رسالہ زمانہ سے ایک انتخاب پیشِ خدمت ہے۔

——• شرب

مشتملات



شبیہ مبارک نجم الدولہ دبیر الملک جناب مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب مرحوم

(زمانہ۔ جولائی ۱۹۰۹ء)

مطبوعہ زمانہ پریس کانپور

غالب مغفور

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کیلیے

غالب کو کیا دل و دماغ قدرت سے عطا ہوا ہے کہ سب شاعروں سے
اُنکا فکر سخن، تلاش معنی، ترکیب بندش، نشست الفاظ جُدا گانہ ہے انکی رنگین
بیانی اور معجز نگاری کے ڈنکے بجے ہوئے ہین غالب دراصل فارسی گو شاعر
ہین اور فارسی گو کیسے ترکی النسل اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب
تورابن فریدون تک پہونچتا ہے تو غالب کو شہزادہ کہنے مین کیا تامل ہی ایک
تو شہزادہ اور دوسرے فرمانروائے ملک سخنوری نور علی نور کی مثل صادق آگئی۔
غالب نے ادعائے سخنوری فارسی مین کیا ہے اور ایک موقع پر بادشاہ
سے آرزو کرتے ہین کہ شاہجہان کے عہد مین کلیم کو سیم و زر سے تولا گیا تھا مگر مین
صرف یہ چاہتا ہون کہ اور کچھ نہین تو میرا کلام ہی ایک مرتبہ کلیم کے کلام کے ساتھ

تول دیا جاے۔ غالب کا یہ ادعا نازیبا نہین ہے۔ اور غالب نے اپنی ایک مقطع مین خود کو حزین کے برابر کہا ہے۔ یعنی

تو بدین شیوۂ گفتار کہ داری غالب
گر ترقی نہ کنی شیخ علی را مانی

جو انصاف پسند سخن فہمی کو صحیح مذاق رکھتے ہین وہ غالب کے خیال سے اختلاف نہ کرین گے۔ غالب کے اصناف سخن پر غائر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کا درجہ سخنوری بہت ہی بلند اور حاوی ہے اور انکی قدر اُن اہل کمال نے کی ہے جو خود فن سخن مین کامل دستگاہ رکھنے والے تھے اور اب بھی غالب کے قدردان کثرت سے ہین اور یہ خیال ذہن نشین ہے کہ غالب نے جو جادہ سخن وری اختیار کیا ہے وہ حد درجہ دشوار گزار ہے مگر غالب کی ہمہ گیر طبیعت نے جس رنگ مین قلم اٹھایا اور جس خیال کی مصوری کی وہ تمام اہل نظر کے لیئے دلفریب ثابت ہوئی۔ غالب نے اپنی زندگی ہی مین معاصرین سے داد سخنوری حاصل کی۔ حکیم مومن خان مومن اور نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کے کمال سخنوری سے کون نہین واقف مگر یہ دونون بزرگوار غالب کو ظہوری اور عرفی کا ہمپایہ کہتے تھے اور نواب ضیاء الدین خان مرحوم کا قول تھا کہ ہندوستان مین فارسی کی ابتدا ایک ترک چین (امیر خسرو) سے ہوئی اور ایک ترک ایبک (غالب) پر اسکا خاتمہ ہوا اور غالب کی نسبت یہ رائے بھی دی گئی ہو کہ اگر یہ عربی شعر کی طرف توجہ کرتے تو متبنی یا ابو تمام ہوتے اور اگر زبان انگریزی کے شاعر ہوتے تو انگلستان کے مشہور شاعرون کا مقابلہ کرتے۔ دراصل یہ بیانات مبالغہ آمیز نہین ہین۔ اس لیئے کہ اگر شاعر قدرتی طور پر لائق ہے تو وہ ہر زبان مین کمال دکھا سکتا ہے۔ اور صائب الرائے اشخاص اُسے کامل تسلیم کر سکتے ہین۔ میر کا کلیات۔ سعدی کی گلستان۔ عمر خیام کی رُباعیان۔ دیوان حافظ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دُنیا کے علمی حلقو مین عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہین غالب کا مجموعہ کلام بھی اسی قابل ہو کہ اگر کوئی لائق شخص انکے چیدہ کلام کا ترجمہ انگریزی زبان مین کردے تو بہت رغبت سے انکا کلام دیکھا جائے۔ شاید یہ خیال مبالغہ آمیز نہین ہے کہ بمقابلہ دیگر اُردو شعرا (باستثنائے میر) کے غالب کا کلام جدید قابل تعلیم یافتہ اصحاب کے

نزدیک بھی زیادہ وقعت رکھتا ہو اور اسکی وجہ یہ ہو کہ غالب کی شاعری مین محض مبالغہ اور صرف رنگ آمیزی اور خیالات دور از قیاس کی ٹھونس ٹھانس نہین ہو - تغزل جسکی بنیاد زیادہ تر وصل اور ہجر اور باہمی رشک معشوق کی بیوفائی اور عاشق کی ایذا پسندی وغیرہ وغیرہ امور پر ہو اور یہی سلسلہ میر سے لیکر اسوقت تک برابر جاری ہو - جو شخص اُردو شاعری کے مختلف رنگوں کو گہری نظر سے دیکھ چکا ہو وہ تو ضرور یہ کہیگا کہ زیادہ تر پُرانے ہی مضامین کو نیا لباس پہنایا جاتا ہو اور بہت کم ایسے مضامین نکلینگے جو جدید کہے جا سکین - قدیم شعرائے اُردو کے کلیون پر تقلید آمد چلا آتا ہے مگر غالب نے اس حقیقت امر کو سمجھ لیا اور اسی وجہ سے اُنھون نے چمنستان شاعری مین ایک نئی کیاری لگائی اور جسطرح ایک ماہر فن باغبان نئے گُل بوٹے اور پودھون کی فکر مین ہتا ہے ایک درخت کی شاخ دوسرے مین لگاتا ہو تخمی آم (انبہ) سے قلمی بناتا ہے اسیطرح غالب نے ہندوستانی اُردو مین شیراز و اصفہان کی چاشنی دیدی اور وہ اُردو کے بعض قدیم کلیون سے ہٹے غالب نے برخلاف دیگر شعرا کے ہجر یار کو مکلف اور وصل کو راحت رسان نہین سمجھا یعنی وہ ہجر ہی مین لذائذ عشق کا احساس کرتے ہین اور درد محبت ہی کو دارو سمجھتے ہین - مین یہان غالب کو اور اساتذہ اُردو سے بڑھانا نہین چاہتا ہون بلکہ مین انکے خصوصیات طبعی کا ذکر کرتا ہون اُردو شاعری کے آخری دور مین حضرت امیر مینائی کا جو درجہ شاعری مین تھا وہ محتاج بیان نہین اور مشکل سے امید ہو سکتی ہے کہ اب پھر دوسرا امیر پیدا ہو اُنھون نے ایک شعر پار ہوتا اور نثار ہوتا مین کہا ہے اور خوب کہا ہے فرماتے ہین -

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیون چُرائی
وہی تیر کیون نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

اس شعر کے مفہوم سے یہ مترشح ہے کہ تیر کی خلش درد افزا ہے اور اسکو جگر کے پار ہونا چاہیئے تاکہ تکلیف سے نجات ملتی حد درجہ کا نازک اور عاشقانہ شعر ہے لیکن غالب نے اسی قافیہ کو اسطرح کہا ہے -

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیمکش کو
یہ خلش کہان سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

اس شعر مین غالب نے اس بات کو ثابت کیا ہو کہ تیر کا جگر مین چھدا رہنا ہی باعث لذت ہو عاشقانہ درد پسندی کا مقتضا بھی یہی ہے۔

مضمون آفرینی مین گہرے جذبات عشق و محبت کا رنگ پیدا کرنا نہایت ہی اہم کام ہو اور مبالغہ مین واقعہ کی صداقت کا قائم رکھنا سحر ہے۔ مضمون کی تلاش اور اسپر صحیح قیاس قائم کرنا کہ یہ نیا ہو یا پامال آسان کام نہین ہو اور یہ کام کاملین فن کا ہو۔ عاشق کے دل عاشق کے گھر کی ویرانی کے اکثر مضامین ناظرین نے دیکھے سُنے ہون گے لیکن غالب نے ذیل کے اشعار مین کیا بات پیدا کی ہو اور ویرانی کی تصویرین کیسی دلکش اُتاری ہین ۔ سو بار پڑھیئے تو سو ہی بار دل متاثر ہو۔ فرماتے ہین۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دشت کو دیکھ کے گھر کی یاد آنا عجیب بات ہو لطف معنی سمجھنے والے اسکی داد دے سکتے ہین کتنا نیا تقابل ہی اور یہ شعر بھی بالکل نیا ہے۔

اُگ رہا ہو در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیابان مین ہین اور گھر مین بہار آئی ہو

گھر کی ویرانی سے بہار ثابت کرنا غالب کا کام ہو۔ ویران گھر مین در و دیوار سے سبزے کا اُگنا بدیہیات سے ہو۔ مگر ہائے ری ناکامی کہ ایسی بہار بھی جب آئی کہ یہ گھر چھوڑ کر بیابان مین آئے اور کس مایوسانہ طرز سے گھر کی یاد کی ہے۔ غالب کی خیال آفرینی ہر جگہ اک نیا مزہ دیجاتی ہے اور عاشقانہ مضمون مین بلاغت کی جھلک پیدا کر دینا تو کوئی بات ہی نہین مثلاً غالب کا یہ شعر ہو تو عاشقانہ رنگ مین لیکن اُنھون نے تمین ایک سائنس دان کی حیثیت سے اظہار لیاقت کی ہے یعنی۔

ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا
باور آیا ہمین پانی کا ہوا ہو جانا

اور بندش تو دیکھیئے کتنی صاف دونون مصرعے سانچے مین ڈھلے ہوئے ہین۔ یہی وہ شاعری ہو جو کوشش سے بھی نہین آتی۔ طرز بیان کو سحر اور شعر کو حکمت اسی

بنیاد پر کہا گیا ہے۔
غالب کی مشکل پسندی کو ان کے معاصرین نے بھی تسلیم کیا ہوا ور حتیٰ کہ بعض قابل اشخاص کے نزدیک غالب کے بعض اشعار صرف شوکت لفظی ظاہر کرنے والے ہین۔ مگر نہین یہ خیال غلط ہی بات صرف اتنی ہو کہ غالب اُردو شاعری کے فرسودہ لباس کو اُتارنا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے وہ اپنے معاصرین کے مشاعرون مین جو غزلین پڑھتے تھے اسپر سرگوشیان ہوتی تھین اور یہ اس لیے کہ انکی سخن طرازی کا رنگ جُدا ہوتا تھا۔ اور لوگ میر و سودا وغیرہ کے رنگ کے عادی تھے۔ میرے خیال مین یہ خیال ابتک قائم ہو اَب بھی ایسے لوگ ملین گے جو غالب کے کلام کو عام فہم نہین کہتے مگر یہ اعتراض نہ کبھی درست تھا اور نہ اَب ہے اس لیئے کہ جدت پسند طبیعتین تو لکیر کی فقیر نہین رہ سکتین غالب نے اگر اُردو شاعری کے تراکیب اور خیالات مین کتر بیونت کی تو کوئی گناہ نہین کیا۔ اَب سو برس کے بعد اگر کسی کا دماغ زبردست اور دل طاقتور ہو تو کوئی اور نئی بات پیدا کرے مگر ہم تو دیکھتے ہین کہ یہ غالب ہی تھے جنھون نے اپنی جدت پسندی مین کامیابی حاصل کی اور زمانے نے یہ تسلیم کر لیا کہ ہان انکا طرز سخنوری الگ ہے۔ غالب نے اُردو کا بظاہر ایک مختصر سا دیوان لکھا ہے۔ لیکن وہ بڑے بڑے ضخیم اور حجیم دیوانون سے بھی بڑھا ہوا ہے کلام کا زیادہ ہونا اچھے ہونے کی دلیل نہین ہے بلکہ کلام کلام کی حیثیت سے ہونا چاہیئے چاہے وہ کم ہی کیون نہ ہو یہی خیال غالب کو مدنظر رہا ہے اُنھون نے اپنے کلام کی روح نکال لی ہو اور اسی کو اپنے نام سے چھپوایا اور یہ نہین کیا کہ غزل مین آم گھاس بھر دیا ہو پچاس پچاس شعر کی غزل کی جگہ چار چار پانچ پانچ کہین دس گیارہ پر اکتفا کی ہے اور کہین دو ایک ہی شعر لکھکر غزل تمام کر دی۔ اللہ اللہ کیا انتخابی لیاقت تھی غالب کا یہ انتخاب اورون کے لیے ہدایت نامہ ہو۔ غالب دراصل فارسی کے شاعر تھے اور گو وہ کسی کے شاگرد فن شعر مین نہین ہین لیکن وہ فارسی مین نظیری اور بیدل کے مقلد ہین اور وہی ترکیبین اور خیالات اِن کے دل و دماغ مین بسے ہوئے ہین اُردو مین بھی وہی تراش خراش موجود ہے اور غالب یہ کہتا ہو کہ

رنگ بیدل مین ریختہ لکھنا۔ اسد اللہ خان قیامت ہے۔

بالکل صحیح ہے عاشقانہ مذاق مین اُردو شعر کو معنی خیز بنا دینا بڑے عالی دماغون کا کام ہے غالب نے اپنے دیوان کا پہلا مطلع بجور حمد باری تعالی لکھا ہو لیکن سرسری نظر سے دیکھنے والے کو امتیاز نہوگا لیکن غور سے دیکھیے تو عجیب رنگ مین حمد لکھی ہے اور کسی کے خیال کی تقلید نہین کی ہے۔

نقش فریادی ہو کسکی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

مصرعۂ اولی مین نقش کی وسعت معنوی کو دیکھیے تحریر کی شوخی سے فریاد کی آمادگی کتنی نئی بات ہو کس لفظ کا نقش ایسا ہو جو معنی سے خالی ہو (مہملات کا ذکر نہین) اور لفظ کا نقش کاغذ پر ہونا ظاہر اور کاغذ سے ہر لفظ پیرہن کاغذی پہنے ہوئے مصرعہ ثانی مین تلمیح ہو یعنی ایران مین قاعدہ تھا اور شاید اب بھی ہو کہ فریادی پیراہن کاغذی پہنکر حاکم کے سامنے جاتا تھا۔ یہ مطلع مجاز اور حقیقت دونون پہلو لیے ہوئے ہے انسان کا کالبد خاکی کیا ہو کچھ بھی نہین یہ سارے کرشمے روح کے ہین یہ گویائی یہ تکلم عقل ادراک کس کی بدولت ہو روح کی؟ روح کس نے پھونکی ہو خدا نے پس آپ سمجھ لیجیے کہ روح کیا ہو اور ساری چہل پہل شور غل فریاد دم کے ساتھ ہو ورنہ خفتگان خاک جو بیروح ہین کیسے چپ ہین۔ کاغذ پر اگر نقش نہو بیقدر الفاظ کے معنی ہی تو بولتے ہین بولتے کیا فریاد کرتے ہین اور فریاد بھی کیسی کہ دوسرے سنکر دلھکر سر دھنتے ہین۔ کیا بامزہ شعر دکھے سنکر سخن فہم بیچین نہین ہوتے آہین نہین بھرتے اُف نہین کرتے۔ اُف کیسی کلیجہ تھام لیتے ہین۔ غالب کا مطلع اپنی شرح کے لئے وسعت بیان اور میدان چاہتا ہے اور یہان طول مقصود نہین۔ سخن فہم ناظرین خود سمجھ سکتے ہین۔ یہان غالب کے دیوان کی شرح لکھنا نہین مقصود ہے صرف مرحوم کی شاعری مذاق سخن کو تازہ کرنا ہو اور یہ ظاہر کرنا کہ اُردو شاعری کو کھیل نہ سمجھنا چاہیے۔ چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ ہون۔

حضرات صوفیہ کا قول ہے کہ آتش عشق ماسوا اللہ کو پھونک دیتی او، وہ سوا خدا کے دُنیا مین کسی کو موجود نہین جانتے حتی کہ خود کو بھی بھول جاتے ہین اور ہجر و وصل کا امتیاز نہین رہتا۔ اسی خیال کو غالب نے نظم کیا ہے۔

دلمیں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

غالب اور مسئلۂ عشق حقیقت کو یون نظم کرے۔ لیکن دراصل غالب نرے صوفی تمام ہی نہ تھے جیسا اُنھون نے خود کہا ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

غالب میکش تھے مگر مکار میکش نہ تھے انکا مشرب صلح پسند تھا واقعی وہ اس شغل سے سکر محوی اور سکر سہوی کی کیفیت حاصل کرتے تھے غالب اہل شریعت کے نزدیک جا ہے قابل معافی نہ ہون لیکن غالب کی راستبازی اور اسکا متصوفانہ مذاق قابل غور ہے وہ شرب مدام کو بُرا جانتے تھے لیکن تصوف اور توحید کے مسائل کو جس خوبی سے اُنھون نے نظم کیا ہے اُس کو انصاف سے دیکھنا چاہیئے۔ اُنھون نے دبی زبان سے ادعائے ولایت کیا ہے گویہ ادعا شاعرانہ ہے۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

سابق نواب صاحب رامپور نے شعر سُن کر کہا کہ ہم تو جب بھی ولی نہ سمجھتے غالب نے ظریفانہ جواب دیا کہ حضور تو اب بھی سمجھتے ہین۔

عاشقانہ رنگ مین ذیل کے اشعار کی نازکخیالی کی داد کہان تک دیجائے۔ اس زمین مین کون سا اُستاد ہے جس نے فکر سے غزل نہین لکھی لیکن ان اشعار کا اور ہی عالم ہے مطلع مین تصوف کا رنگ کس خوبی سے پیدا کیا ہے عشق حقیقی کی بے خودی مین جہان کو بھول جانا انتہائے محویت کو ثابت کر رہا ہے اور زاہد کی ستائش گری صرف اس بات کی دلیل ہو سکتی ہے کہ اسکو معشوق حقیقی کی یاد مین استغراقی حالت نہین ہے یعنی۔

ستائش گر ہے زاہد اسقدر جس باغ رضوان کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودون کے طاق نسیان کا

(عاشقانہ)

ویرانی

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویران ہوتا　　　بحر اگر بحر نہوتا تو بیابان ہوتا

توحید

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہوتا تو خدا ہوتا　　　ڈبویا مجکو ہونے نے نہوتا مین تو کیا ہوتا

خدا کی ازلیت اور ابدیت کو کس طریقے سے ثابت کیا ہو۔ اپنی ہستی کے افسوس مین کس رمز کو ظاہر کیا ہو۔ ظاہر ہو کہ ساری دُنیا اسی کے قدرت سے پیدا ہوئی اور یہ سب اجزا اسی کے قدرت کے ہین غالب کا خیال ہو اگر مین نہوتا تو پھر کیا ہوتا مطلب ظاہر ہو قبل از ظہور عالم خدا ہی خدا تھا اور ایک دن وہی وہ رہ جائے گا عجب خیال ہو اور ضمناً غالب نے کیا مبالغہ کیا ہے کہ مین کیا ہوتا۔ عدم کو وجود پر کیونکر ترجیح دی ہو۔

توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے ؎　　　آنکھوں مین ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہوا تھا

اسمین آنسو کو گوہر پر ترجیح دی ہو اور ثبوت یہ ہے کہ قطرہ اشک آنکھوں مین رہتا ہے اور گوہر صدف مین بالکل نیا مضمون ہو

عاشقانہ بیدلی

عرض نیاز عشق کے قابل نہین رہا　　　جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہین رہا

صبر

رات دن گردش مین ہین سات آسمان　　　ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائین کیا

توحید اور فنائیت

عشرتِ قطرہ ہے دریا مین فنا ہو جانا　　　درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

تماشائے نیرنگ قدرت

بخشے ہو جلوہ گل ذوق تماشا غالب　　　چشم کو چاہیئے ہر رنگ مین وا ہو جانا

ذوق فنا اور تحمل دیدار

کیون جل گیا نہ تاب رُخ یار دیکھکر　　　جلتا ہون اپنی طاقتِ دیدار دیکھکر

مصرعہ اولی مین رُخ یار کو دیکھکر فنا ہو جانے کی آرزو کی ہے۔ مصرعہ ثانی مین طاقت دیدار پر عتاب ہو کہ اس نے مجھے زندہ رکھا اور جلتا ہون کے ٹکڑے کو ملاحظہ کیجیئے کیا بات رکھی ہو تاب رُخ سے نہ جلے تو اس طور پر جل رہے ہین۔ سوز و گداز عشق کو

غالب کا یہ شعر بھی ذرا پیچیدہ ہے مصرعہ اولی صاف ہی یعنی دل ایسی شے مین شوق کو تنگی جا کا گلہ اس لئے کہ شوق کی کوئی حد نہین ہے اور دل ایک محدود جگہ کہی جا سکتی ہی اور کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہی کہ دل اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایسی شے ہی جسمین دونون جہان کے خیالات کی گنجائش ہے پس دلکی تنگی کو تسلیم نہین کیا جا سکتا اور اسوجہ سے یہ مصرعہ بھی کنجلک پیدا کرتا ہے۔ مصرعہ ثانی مین اگر گہر سے مراد دل سے لین اور اضطراب دریا سے مراد شوق سے تو محو ہونا جو اضطراب دریا (شوق) سے منسوب ہے چسپان نہین ہوتا اس لیئے کہ محویت مین اضطراب نہین ہوتا۔ اس اختلاف خیال سے مفہوم شعر سامع کو تسکین نہین دیتا اور سیدھے سادے معنی یون کہہ سکتے ہین کہ شوق کو تنگی دل کا گلہ تو ہے لیکن وہ رہتا دل ہی مین ہے اور اسوجہ سے شوق جو دریا کا سا اضطراب رکھتا ہی۔ وہ دل پر محو ہو رہا ہے۔ بہرحال یہ شعر بھی مثل دیگر اشعار غالب کے پیچیدہ ہی اور ایسے اشعار شعرائے فارسی کے یہان بھی ہین جنکے مختلف معنی بیان کیئے گئے ہین مگر غالب نے اُردو مین یہ بلاغت اور معنی آفرینی دکھا کر ثابت کیا کہ اردو بھی مضامین کے لیئے گنجائش رکھتی ہے۔ جناب حالی ایسے شخص نے خیالات عامہ کی تائید مین ذیل کے اشعار کو قریباً بے معنی کہدیا ہے۔

شمار سبحہ مرغوب بُت مشکل پسند آیا ... تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
ہوائے سیر گل آئینہ بے مہری قاتل ... کہ انداز بخون غلطیدن بسمل پسند آیا

ایضاً

لیگئے خاک مین ہم داغ تمنائے نشاط ... تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستان ہونا
شب خمار چشم ساقی رستخیز اندازہ تھا ... یا محیطِ بادہ صورت خانہ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درس دفتر امکان کھلا ... جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

ان اشعار پر بےمعنی ہونے کا الزام لگانا میرے نزدیک تو انتہا کی بیدردی ہی جس جانسوز فکر سے یہ اشعار غالب نے موزون لیئے ہین ممکن ہی انسے پوری تسکین نہو لیکن غور کامل سے معانی کا پتہ چلتا ہی۔ مثلاً شمار سبحہ والا شعر ملاحظہ ہو غالب کہتے ہین کہ میرے بُت (معشوق) کو سبحہ صد دانہ کا شمار پسند آیا ہی اور یہ اس سبب سے کہ اُن

سوداؤن کو سودل (دل اور دانۂ تسبیح مین کچھ مشابہت ہی) سمجھتا ہے اسوجہ سے اسنے سبحہ کو ہاتھ مین لے لیا ایک معشوق دلستان کے لئے سودلون کا ایک بار نچانا عجب بات ہی اور تسبیح کے دانون کو زاہدون کا دل کیون نہ سمجھے ورا اس لحاظ سے اس شعر کی عمدگی اور بھی بڑھ گئی۔

ہوائے سیر گل الخ مین بالکل فارسی کی ترکیب ہے۔ اس شعر مین عاشقانہ مذاق دکھایا گیا ہے۔ دیوانگان عشق سیر گل سے بھی بیقرار ہوتے ہین اور اسی طرح بیمہری قاتل کا آئینہ دیکھکر طپان۔ مصرعۂ ثانی مین کہ کاف بیانیہ نہین ہے بلکہ اسکے معنی یا کے لئے جائین تو غالباً بیجا نہو گا اور اس لئے اس شعر کے یہ معنی کہے جائین تو قرین قیاس ہین۔

ہوائے سیر گل اور آئینہ بیمہری قاتل یا انداز بخون غلطیدن بسمل پسند آیا اور پسند کسکو آیا عاشق کو۔ عاشق کو مقدر ماننیے۔ مین نے جو خیال اس شعر کی نسبت ظاہر کیا ہی ممکن ہی کہ بعض اصحاب کو اس سے اتفاق نہو۔ یہ اختلاف اکثر فارسی اشعار مین شارحین نے کیا ہی غالب کا یہ شعر بھی فارسی ہی ہے۔

لے گئے خاک مین ہم الخ اس شعر کا مفہوم میرے خیال مین یہ ہے کہ "ہم داغ تمنائے نشاط کو خاک مین لے گئے یعنی آرزو پوری نہ ہوئی اور موت آگئی۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ دوسرے مصرعہ مین معشوق کو مخاطب کر کے کہتے ہین کہ اب تمکو اپنا گلستان صد رنگ مبارک ہو اسکی بہار دیکھو اور خوش ہو عجب عاشقانہ پیرایہ مین اظہار شکایت کیا ہے اور اس شعر کی ضمیر معشوق حقیقی کی طرف بھی راجع ہے اور گو اسمین مذہبی استخفاف کی بو آتی ہی۔ لیکن شاعرانہ تخیل کو کون روک سکتا ہی۔ غالب نے اس قسم کی شوخی ایک اور شعر مین بھی کی ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

الغرض جو اشعار غالب باعتبار مفہوم گرے ہوئے معلوم ہوتے ہین انکو غالب کے رجحان طبیعت کے موافق دیکھنا چاہیئے غالب کے معاصر بھی اس دقت پسندی سے الجھتے تھے دبی زبان سے اور کبھی علانیہ اعتراض بھی کرتے تھے۔ غالب کے اس شعر پر انکے ایک ہمعصر نے اعتراض کیا ہے۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

اسپر اعتراض یہ ہو کہ مصرعہ ثانی مین اے کی جگہ جز ہو تو معنی صاف ہو جائین اور اس دخل کو جناب حالی نے بھی جائز رکھا ہو لیکن میرے خیال یہ دخل دخل درمعقول سے زیادہ وقعت نہین رکھتا۔ ناظرین اے اور جز کے فرق کو ملاحظہ فرمائین اگر جز کہا جائے تو یہ مطلب ہو کہ سوا نالہ کے (جس سے مراد قمری و بلبل ہے) نشانِ جگر سوختہ کیا ہے لیکن قابلِ غور یہ بات ہو کہ جگر مین نالہ نہین ہوتا نالہ کی جگہ دل ہے غالب قمری اور بلبل کو جگر سوختہ کا نشان بتا رہے ہین اور اے سے مراد اے نالہ دل ہو یعنی اے نالۂ دل جگر سوختہ کا نشان قمری اور بلبل ہو یہ تشبیہ باعتبار رنگ کے ہے قمری اور بلبل کا رنگ خاکی ہو۔ قمری اور جگر سوختہ کا رنگ بھی خاکی ہو تو اس لحاظ سے میرے ذہن ناقص مین اے جز سے اچھا ہو اردو و فارسی مین نالہ کشی دل سے منسوب ہو جگر سے درد و زخم و ناسور منسوب اور دل سے آہ و نالہ وغیرہ شعرائے فارسی نے قمری اور بلبل کو اپنا نالہ مجسم کہا ہو۔ ایک شاعر کا مصرعہ ہے۔

نالہائے دل بہم کردند و بلبل ساختند

غالب نے قمری و بلبل کو جگر سوختہ کا نشان کہا ہے۔ گو غالب ان اعتراضات کو بے حقیقت جانتے تھے اور بعض اشعار مین دفع اعتراض بھی کیا ہو لیکن تاہم ابتدائی غزلون کا سا رنگ انکی آخری غزلون مین نہین ہو مگر غالب نے صاف اور عاشقانہ رنگ مین بھی جو اشعار موزون کیئے ہین وہ لاجواب ہین لیکن لطفِ معنی کی جھلک انمین بھی موجود ہے ذیل کے شعر ملاحظہ ہون۔

مین اور بزم مے سے یون تشنہ کام آؤن | گر مین نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
ہو ایک تیر جس مین دونون چھدے پڑے ہین | وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

اول شعر مین لطفِ بیان اور شوخی کی کچھ حد نہین ہو ساقی سے شکایت ہے کہ اگر مین نے توبہ بھی کی تھی تو اُسے زبردستی پلا دینا تھا دوسرے شعر مین مصرعہ ثانی یعنی وہ دن گئے۔ الخ تیر عشق کی دستبردی کو ظاہر کر رہا ہے اور دل جگر کا ایک ہی تیر مین چھد کر رہ جانا کس قیامت کی بے کسی ہے

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیری جلوے نے   کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستان کا

نازکخیالی

مری تعمیر مین مضمر ہی اک صورت خرابی کی   ہیولیٰ برق خرمن کا ہی خون گرم دہقان کا

خون گرم دہقان کو برق خرمن کا ہیولیٰ قرار دینا اور اس سے تعمیر جسمانی کی خرابی عجیب بات ہی اُردو مین یہ مضمون آفرینی اور ایسی جدت پسندی غالب کا حصّہ ہے۔

معرفت

محرم نہین ہے تو ہی نواہاے راز کا   یان ورنہ جو حجاب ہی پردہ ہی ساز کا

دنیا کی مذمت

دہر مین نقش وفا وجہ تسلّی نہوا   ہے وہ لفظ جو شرمندہ معنی نہوا

حُسن و عشق کا تعلق

مین نے چاہا تھا کہ اندوہ وفاسے چھوٹون   وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہوا

کمی اخلاق کی شکایت

بس کہ دشوار ہی ہر کام کا آسان ہونا   آدمی کو بھی میسر نہین انسان ہونا

کتنا سچا مضمون اور کیسا اچھوتا خیال ہی۔ ہر انسان انسان ہے لیکن اگر اسمین آدمیت نہو تو کچھ بھی نہین اس خیال کو دیگر شعرا نے بھی لیا ہے لیکن غالب کا یہ شعر لاجواب ہے۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا   نہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

غالب نے فطرتِ انسانی کی تصویر اپنے خیال کے موافق خوب کھینچی ہے کہ انسان آمادہ نشاط و سرور اس لیئے ہی کہ وہ جانتا ہی کہ ایک دن مرنا ہو لہذا جہان تک ہوسکے زندگی کے مزے حاصل کرنا چاہیئے۔ اگر مرنے کا خوف نہوتا تو جینا بیہودہ ہو جاتا۔

شوخی بیان

جمع کرتے ہو کیون رقیبون کو   اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

اعتراف عجز و قصور

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

گلہ ہی شوق کو دل مین بھی تنگی جا کا   گھر مین محو ہوا اضطراب دریا کا

کیونکر ثابت کیا ہے۔

عاشقانہ

ان آبلون سے پاؤن کے گھبرا گیا تھا مین
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھکر

گرنی تھی ہمپہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہین بادہ ظرف قدح خوار دیکھکر

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھکر

ایضاً

بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اِک ہوائے تند ہے خاک شہیدان پر

نہ لڑنا ناصح سے غالب کیا ہوا گر اسنے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریبان پر

شوخی

فلک سے ہمکو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہین قرض رہزن

اس شعر مین عجیب شوخی طبع دکھائی ہے فلک سے تقاضائے عیش رفتہ چور کو قرض دینا اور پھر مانگنا ہے سبحان اللہ کیا بات پیدا کی ہے۔

اظہار ناکامی

حریف مطلب مشکل نہین فسون نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

کیا نازک خیالی اور کیا فکر ہے۔ مصرعۂ اولی مین کہتے ہین کہ میرا افسون ساز حریف مطلب مشکل ہو ہی نہین سکتا۔ دوسرے مصرع کی شوخی قیامت کی ہے خدا سے التجا کرتے ہین کہ میری دعا قبول ہو کونسی دعا کہ حضرت خضر کی عمر دراز ہو خضر کی درازی عمر ظاہر ہے اور اُسکے لیئے دعا تحصیل حاصل ہے۔

عاشقی اور صبر

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کرون خون جگر ہونے تک

دُنیا کے مصائب

دام ہر موج مین ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھین کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

محبت اور بے بسی

ہمنے مانا کہ تغافل نہ کروگے ہمسے
خاک ہو جائین گے ہم تمکو خبر ہونے تک

حالت زندگی

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ مین جلتی ہی سحر ہونے تک

دیگر

مجکو دیار غیر مین مارا وطن سے دور — رکھ لی مری خدا نے مری بیکسی مین شرم
وہ حلقہائے زلف کمین مین ہین اے خدا — رکھ لیجیو میرے دعوی وارستگی کی شرم

درد پسندی

زخم سلوانے سے مجپر چارہ جوئی کا طعن ہے — غیر سمجھا ہی کہ لذت زخم سوزن مین نہین

غیر کی بدگمانی کو کس پہلو سے ثابت کیا ہی کہ دشمن یہ سمجھتا ہے کہ زخم مین ٹانکے اچھے ہونے کی غرض سے دلوائے ہین، حالانکہ میری غرض یہ ہی کہ نوک سوزان سے جو تکلیف زخمون کو پہونچتی ہے وہ میرے لیے باعث لذت ہی -

رندانہ شوخی

قرض کی پیتے تھے مے اور دلمین کہتے تھے کہ ہان — رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایکدن

غالب کے اس شعر نے انتہا درجے کی شہرت حاصل کی ہے اور شعر بھی تو کیسا ہے -

تسلیم و رضا

ملتی ہی خوے یار سے نار التہاب مین — کافر ہون گر نہ ملتی ہو راحت عذاب مین

اضطراب اور مزاج شناسی

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھون — مین جانتا ہون جو وہ لکھینگے جواب مین

رندانہ

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہون روز ابر و شب ماہتاب مین

منصور پر طنز

قطرہ اپنا بھی حقیقت مین ہی دریا لیکن — ہمکو منظور تنک ظرفی منصور نہین

ہجر اور بے بسی

یہ ہم جو ہجر مین دیوار و در کو دیکھتے ہین — کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہین

عاشقانہ

وہ آئین گھر مین ہمارے خدا کی قدرت ہی — کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہین

کہین نظر نہ لگے انکے دست و بازو کو — یہ لوگ کیون مرے زخم جگر کو دیکھتے ہین

بادر فنگان نیچرل رنگ مین

سب کہان کچھ لالہ و گل مین نمایان ہوگئین — خاک مین کیا صورتین ہونگی کہ پنہان ہوگئین

اسی زمین مین غالب کا یہ عاشقانہ شعر کتنا خوب ہی

نیند اُسکی ہی دماغ اُسکا ہی راتین اُس کی ہین — تیری زلفین جسکے بازو پر پریشان ہوگئین

اسی زمین مین ایک شعر غالب نے عجیب مذاق کا نکالا ہی موحدانہ رنگ بھی مترشح ہی اور موجودہ زمانہ کے تعلیمیافتہ جو ہندوستان مین قومیت کے طالب ہین اور اسی قومیت کو باعث ترقی خیال کرتے ہین لیکن اختلاف مذاہب و رسوم سے یکرنگی نہین ہوسکتی اور یہی بڑا باعث اختلاف ہے اگر یہ مٹ جاوے تو دو قومون کا جھگڑا نہ رہے اور ایک موحد ان اختلافات سے ضرور الجھتا ہے ۔ غالب کے یہ خیال کس لطف سے قلمبند کیا ہے ۔

ہم موحد ہین ہمارا کیش ہی ترک رسوم — ملتین جب مٹ گئین اجزائے ایمان ہوگئین

صحرا اور عالم وحشت

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہی وبال دوش — صحرا مین اے خدا کوئی دیوار بھی نہین

دیگر

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال — ہم انجمن سمجھتے ہین خلوت ہی کیون نہو

اس شعر مین جو متضاد حالت دکھائی ہی اسکی تصدیق ہر شخص کو ہو سکتی ہے آدمی کا بجائے خود محشر خیال ہونا بدیہی امر ہے اور خلوت مین بھی تو صدہا قسم کے خیال پیش نظر ہوتے ہین خلوت کو انجمن کس خوبی سے ثابت کیا ہے ۔

جب میکدہ ہی چھٹ گیا پھر کیا جگہ کی قید — مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اس شعر مین میکدہ چھٹنے کا صرف افسوس ہی نہین کیا بلکہ زندگی ہی بیکار سی معلوم ہوتی ہی اور اب مسجد مدرسہ خانقاہ صرف پڑ رہنے کے لیے ہے لطف زندگی میکدہ ہی کے قیام تک تھا ۔

ذیل کے اشعار مین غالب نے اس حالت کی تصویر اُتاری ہی جسمین انسان

فرطِ غم و یاس سے ایسی تنہائی ڈھونڈھتا ہے جہان کوئی اُس تک پہونچ نہ سکے اور
جب انسان مصائب سے تنگ اور اپنے اعزہ و احباب کی بیوفائی سے مایوس ہو جاتا
ہے تو وہ سب سے قطع تعلق چاہتا ہے یہ بالکل نیچرل مضمون ہے مگر یہ حالت
کبھی کبھی پیش آتی ہے۔

رہیئے اب ایسی جگہ چلکر جہان کوئی نہو | ہم سخن کوئی نہو اور ہمزبان کوئی نہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے | کوئی ہمسایہ نہو اور پاسبان کوئی نہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہو بیماردار | اور اگر مر جایئے تو نوحہ خوان کوئی نہو

ذیل کے شعر مین کتنا گہرا رنگ تغزل ہے اس شعر کی ترکیب مین نظیری کے
رنگ تغزل کی شان ہے۔

یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجیئے | یا پردہ تبسم پنہان اُٹھایئے

اسیری اور ناامیدی

خزان کیا فصل کتے مین کسکو کوئی موسم ہو | وہی ہم ہین قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

متصوفانہ عشق

ڈھونڈھے ہے اک مغنی آتش نفس کو جی | جسکی صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے

عاشقانہ

رگون مین دوڑنے پھرنے کے ہم نہین قایل | جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

لطف زبان

ہوا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا | وگرنہ شہر مین غالب کی آبرو کیا ہے

رندانہ شوخی

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم | دھوئے دھبے جامہ احرام کے

ذیل کے شعر مین محویت تصور یار کی حالت کس خوبی سے نظم کی ہے اور
حصول وصال مین تعویق کی وجہ سے ناامیدی کے اثر سے کسطرح الجھا جاتا ہے۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے | کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھسے

اور اس دوسرے شعر مین بھی تصور یار کی حالت خوب دکھائی ہے۔

دل ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن | بیٹھے رہین تصور جانان کیے ہوئے

غالب کے یہ دونوں شعر دلی کے اس مشہور شعر سے لطف میں کم نہیں ہیں۔

در بزمِ وصال تو بہنگامِ تماشا — نظارہ ز جنبیدن مژگان گلہ دارد

ذیل کا شعر ملاحظہ ہو اسکے رنگ تغزل کو دیکھیے لطف زبان حسن بندش پر نظر کیجیے اور پھر مفہوم کے اعتبار سے نہ صرف عشق مجازی بلکہ عشق حقیقی کا رنگ بھی جھلک رہا ہے اسی کا نام سحر طرازی ہے۔

اک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں — پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

اس زمین میں یہ شعر بھی لاجواب ہے کوہ طور کے واقعہ پر سب ہی شعرانے طبع آزمائی کی ہے لیکن غالب نے بالکل جداگانہ طریقے سے حسن طبیعت دکھایا ہے مصرعۂ اول کا لطف بیان دیکھنا چاہیئے زبان کی خوبیاں دیکھنے والے تو ہزاروں بار پڑھکر بھی تازہ حظ حاصل کرتے ہیں۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو — مدت ہوئی ہے دعوتِ مژگان کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق — سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی ہوس — عرض متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے — بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

مرزا کی یہ غزل جواہر میں تولنے کے قابل ہے۔ میرے خیال میں اگر نظیری غالب کے عہد میں ہوتے تو وہ انکے کلام کی داد معاصرانہ دیتے نظیری کی ادابندی اور لطف زبان پر سخن شناس لوٹ ہیں انصافاً غالب کے ان اشعار کو دیکھو کہ یہ کیا چیز ہیں۔ یہ دردمندی اور یہ گہرا سوز و گداز تو اردو کیا فارسی میں بھی مشکل سے ملے گا۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کیلئے

اس شعر کا مضمون شعر متذکرۂ بالا کرتا ہوں جمع الخ سے ملتا ہوا ہے ترکیب میں

فرق ہو۔ اسی زمین مین ایک اور شعر بھی خوب نکالا ہے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی ۔ اٹھا اور اٹھ کے قدم مین نے پاسبان کے لیے

عجیب مضمون ہو شوخی اور ظرافت کی کیا حد ہو جب تک پاسبان انکو گدا سمجھا اسوقت تک چپ رہا مگر جب اُنھون نے اُٹھکر قدم لئے تو وہ سمجھ گیا کہ یہ غالب ہین اور ان کی شامت آگئی ضمناً یہ بات ثابت ہو گئی کہ پاسبان کو سمجھا دیا گیا تھا کہ غالب حضور مین نہ آنے پائین۔

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی ۔ مشکل کہ تجھسے راہ سخن وا کرے کوئی
ناکامی نگاہ ہے برق نظارہ سوز ۔ تو وہ نہین کہ تجھکو تماشا کرے کوئی

یہ دونون شعر بھی متصوفانہ ہین پہلے شعر مین ثابت کیا ہے کہ بغیر دہان زخم پیدا کیئے ہوئے تجھسے کوئی گفتگو نہین کرسکتا یعنی جب تک انسان عشق سے زخمی نہو معشوق سے مکالمت اور رسم و راہ محال ہے دوسرے شعر مین تماشائے حسن یار کو محال ثابت کیا ہے لیکن عاشقانہ رنگ ہاتھ سے نہین جانے پایا یعنی تجھکو بغیر دیکھے ہی بصارت چلی جاتی ہے تو تجھکو بے پردہ کون تماشا کرسکتا ہے۔

تادیبِ عشق

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ ۔ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

ذیل کے شعر مین میکشی کی حسرت اور نزع کی بے بسی کا نقشہ کس خوبی سے کھینچا ہے اس سے زیادہ خوبی پیدا کرنا محال ہے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہین آنکھون مین تو دم ہے ۔ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

غالب نے جس رنگ مین قلم اُٹھایا شان قادر الکلامی دکھا دی اب اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہو وہ کون سخن دوست ہو جو غالب کی نیرنگی خیال کا شیدا نہین ان اشعار کے لکھنے سے غالب کی مدح سرائی مقصود نہین ہے اس لئے کہ غالب مستغنی عن المدح ہین۔ آفتاب کو روشن کہنا تحصیل حاصل ہے۔ لیکن غالب کی سخن طرازی کی یاد دو فائدون سے خالی نہین نقادان سخن کا مذاق سخن فہمی تازہ ہوتا ہے اور جو لوگ فن شاعری کے دلدادہ ہین اُنکے لیئے غالب کی شاعری کارنامہ ہدایت ہو میرے خیال مین اب اردو شاعری کا رنگ بالکل ہلکا اور ادھورا ہے۔ شعر مین

صرف پوست و استخوان نہین بلکہ مغز ہونا چاہیئے۔ غالب کے کلام مین جو جامعیت ہے وہ قابل غور اور لائق تقلید ہی۔ لیکن قدرت کی فیاضیون سے دور نہین کہ پھر کوئی غالب کا ثانی پیدا کرے مگر ابتک تو انتظار اور اُمید ہی ہے۔ شعرائے اُردو مین باعتبار مجموعی کمالات غالب ایک خاص امتیاز رکھتے ہین ہرچند غالب نے میر کی اُستادی کو تسلیم کیا ہے ؎

غالب اپنا بھی عقیدہ ہی بقول ناسخ   آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہین ہا

لیکن مرزا کی طرز روش جُداگانہ ہی اور انکی زبردست طبیعت نے مثل دیگر اساتذہ اُردو کے صرف غزلون اور مختصر مثنویات پر اکتفا نہین کی بلکہ اصناف شاعری پر قدرت رکھتے تھے۔ شعرائے اُردو مین غالب کی سی پُرزور نثر کس نے لکھی اور نثر مین نظم کے مزے کس نے بھرے پُرانے طریق کی نثر کو کسنے بدلا۔ مختصر نویسی کی ایجاد کس نے کی؟ یہ کام غالب ہی نے انجام دیا۔ اگر سچ پوچھیے تو مرزا نے عود ہندی۔ اور اُردوے معلی لکھکر لوگون کو اُردو نثر لکھنا سکھایا۔ زمانہ کا رنگ اور مذاق ہمیشہ بدلتا رہا ہے اس زمانے کی تعلیم یافتہ جس دلاویزی سے عود ہندی کو دیکھین گے کسی لمبے چوڑے القاب و آداب والی انشا کو نہ دیکھین گے۔ مرزا نے اپنے دوست و احباب کو جو رقعے لکھے ہین انکے فقرے ریزہ ہاے جواہر ہین کیسے دلچسپ اور کتنے دلاویز جملے کہ طبیعت وجد مین آتی ہے۔ غالب کی نسبت جیسا ظاہر کیا گیا ہی کہ وہ کوئی فاضل اجل نہ تھے جھوٹ نہین لیکن وہ حد درجہ وسیع النظر تھے انکے رنگ کلام سے معلوم ہوتا ہی کہ اُنھون نے مطالعہ کتب مختلفہ خصوصًا دواوین فارسی کو بہت ہی غور و خوض سے مطالعہ کیا ہے اور انکا حافظہ بہت قوی تھا انکو معمولی اور غیر معمولی مضامین مین امتیاز کا خاص ملکہ تھا دیکھ لیجیے کہ غالب کے دیوان مین پامال اور روندے ہوے مضامین کا پتہ نہین چلتا اور ریجا بالعجب انکے کلام مین شاید ہی کہین ہو۔ غالب دراصل اُردو غزل گوئی کو زیادہ دقیع نہ جانتے تھے لیکن وہ اپنے اُردو معاصرین اور نیز بادشاہ کی ملازمت اور فرمائش سے اُردو کہتے تھے غالب فارسی شاعری کے دلدادہ تھے اور انصاف بھی یہی ہی کہ فارسی اشعار مین جیسے لطیف مضامین ہین وہ اُردو مین نہین غالب نے اپنے ایک ہمعصر

(ذوق) کو یہ قطعہ لکھا تھا۔

فارسی بین تا ببینی نقشہاے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است
راست می گویم من و از راست سر نتوان کشید — ہرچہ در گفتار فخر تست آن ننگ من است

اس سے یہ غرض نہین کہ غالب نے شعراے اردو کی ہجو کی ہے بلکہ ایک امر حق بیان کر دیا ہو ورنہ ذوق خود ایک زبردست شاعر تھے اور انکی تحصیل بھی معمولی نہ تھی اگر سچ پوچھیے تو ذوق نے بھی اُردو مین جو کمالات خیال آفرینی دکھاے ہین وہ انھین کا حصہ ہین اور قصائد مین بھی وہ زور اور شان پیدا کی ہے جو مسلم ہے۔ بہر حال غالب بڑے خوش نصیب تھے جنھون نے اپنی معاصرین کی زبان سے یہ کہلوا دیا کہ وہ ظہوری اور عرفی کا درجہ رکھتے ہین اور نظیری اور بیدل کے رنگ مین غزل لکھکر غالب ہی نے کچھ کامیابی حاصل کی نظیری وہ شخص ہو جسکی نسبت صائب نے کہا ہو۔

صائب چہ محالست شوی مثل نظیری — عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

اسمین شک نہین کہ اگر غالب اکبر کے وقت مین ہوتے تو انکی قدر بھی فیضی سے کم نہوتی افسوس کہ آباد دہلی لکھنؤ غالب ایسے اہل کمال سے خالی ہے۔

اثر۔ لکھنوی

'زمانہ' جولائی ۱۹۰۹ء

مرزا غالبؔ کی اردو فارسی شاعری

مرزا غالب نے اپنی شاعری میں جو محاسن پیدا کیے تھے وہ ان کی موت کے بعد اور زیادہ قدر کی نظر سے دیکھے گئے۔ زندگی میں تو بعض لوگ ایسے تھے جو مرزا غالبؔ کے معاصر از مضحکہ اس بات پر کرتے تھے کہ وہ اردو شاعری میں ایک شاہراہ جدید قائم کر رہے ہیں۔ اردو میں فارسی کا پیوند لگا رہے ہیں۔ مرزا کے ہمعصر زیادہ تر عشق و عاشقی کے ترانے غزل کے پیرایہ میں بلند کیا کرتے تھے۔ لطفِ زبان اور محض سادگی پر لوگ لوٹ تھے۔ دراصل یہ خوبیاں بھی شاعری کی جان ہیں اور سادگیٔ بیان پر قادر ہونا سہل کام نہیں ہے لیکن ایک ایسا شخص جو جدت آفرینی پر اپنے کو فنا کرنا چاہتا ہو وہ کب لکیر کا فقیر رہ سکتا ہے۔ غالب کی شاعری کو قدیم مذاق کے لوگوں کے سوا جدید تعلیم یافتہ اصحاب بھی حد سے زیادہ پسند کرتے جاتے ہیں اور یہ بات صرف مرزا ہی سے زیادہ مخصوص ہے۔ مرزا کے واقعاتِ زندگی اور ان کے مذاق طبعی کی شہرت بھی حد کو پہونچی ہوئی ہے۔ غالب متصوفانہ مذاق کے ساتھ فلسفہ تصوف کے بھی رمز شناس تھے۔ اس مختصر مضمون میں تصوف پر کوئی بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ بالاختصار یہ بیان کرنا ہے کہ مرزا کی اردو اور فارسی شاعری میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ انھوں نے اردو میں جو مضامین لکھے ہیں، وہ معنی خیزی کے لحاظ سے شعرائے فارس کے پُر مضمون اشعار سے کسی طور پر کم نہیں ہیں اور بعض حالتوں میں وہ فارسی سے بھی ممتاز ہیں۔ چند مختلف اردو و فارسی کے اشعار تفننِ طبع ناظرین کے لیے درج کیے جاتے ہیں:

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل　　　گرمیٔ بزم ہے بس رقصِ شرر ہونے تک

اس شعر میں انھوں نے نہ صرف ہستیٔ انسان بلکہ تمام موجوداتِ عالم کی ہستی کی بے اعتباری اور بے ثباتی کو بیان کیا ہے مگر لطفِ بیان نے خدا جانے کیا مزہ اس شعر میں بھر دیا ہے۔ مطلب اس کا بہت صاف ہے، کہتے ہیں کہ اے غافل تیری ہستی ایک نظر (طرفۃ العین) "پلک مارنا" سے زیادہ نہیں ہے۔ اتنی دیر میں تیرے لیے فنا ممکن ہے کہ ادھر آنکھ جھپکی اور تیرا خاتمہ ہے۔ کیا واقعات اس بات کو نہیں ثابت کرتے کہ ایک دم میں انسان فنا ہو جاتا ہے۔ مصرعِ ثانی میں مثال کتنی برجستہ ہے

کہتے ہیں کہ تیری بزم ہستی کی گرمی رقص شرر سے مشابہ ہے کہ وہ ادھر چمکا اور اُدھر غائب ہوا۔

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر　　　　ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اس شعر میں عجیب تعلقات ظاہر کیے ہیں۔ توحید کے مضمون کو بالکل اچھوتے رنگ میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دریا کا ہر قطرہ سازِ انا البحر بجا رہا ہے مگر قطرہ کی آواز غیر محسوس کو کون سُنتے؟ یہ کام خاص موحدین کا ہے۔ مگر دراصل قطرہ ایک جزو بحر کا ہے اور اس لیے کہ وہ کل سے جدا نہیں اور اس پر قطرہ ناز کر سکتا ہے۔ مصرعِ ثانی میں صاف رنگ تغزل پر آ گئے ہیں اور ناز کر رہے ہیں کہ ہم اس کے (شاہدِ حقیقی کے) عاشق ہیں اس لیے ہماری شان اور رتبہ کو کوئی کیا سمجھ سکتا ہے اور ہم اس کو کیا بیان کر سکتے ہیں۔ توحید کے مضامین اور بھی غالب نے خوب **خوب** لکھے ہیں۔ یہ شعر بھی اسی قبیل سے ہے:

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن　　　　ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

غالب نے اس شعر میں بہت بڑا دعویٰ کیا ہے اور منصور پر بڑی چوٹ کی ہے۔ مضامین تصوف کے سوا جس مضمون کو غالب نے لکھا ہے وہ دل پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتا۔ غالب نے یہ ثابت کر دکھایا کہ اُردو میں ہر طرح کی فصاحت و بلاغت، فلسفہ، حکمت اور نیچرل جذبات کی گنجائش ہے۔ غالب نے شاعری کے اصلی مقصد کو خوب پہچانا ہے وہ صرف غزل سرائی سے اپنے محدود جذبات کو خوش کرنے والے نہ تھے غالب نے وہ روش اور وہ اسلوب بیان اختیار کیا جس کے باعث وہ شاعر اور حکیم دونوں کہے جا سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض جدید تعلیمیافتہ اصحاب نے غالب کو بعض یورپین مصنفین سابق کا ہم پلہ کہا ہے۔ حکیمانہ خیال کے مصنف اپنے اشعار سے دوسروں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ یہی حال غالب کا ہے۔ گو بعض لوگ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ غالب خود رند مشرب تھے وہ دوسروں کی کیا اصلاح کر سکتے ہیں۔ تسلیم کیا جاتا ہے کہ غالب ایک قابل ترک عادت میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن ان کی صداقت شعاری میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا وہ چھپ کر پینے والوں اور دھوکہ باز پرہیزگاروں سے بدرجہا اچھے تھے۔ وہ غرور اور تکبر سے پاک تھے اور اپنے کو گنہگار بھی سمجھتے تھے اور اپنی عادت پر منفعل۔ مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان کے کلام میں تصوف، توحید، حکمت، فلسفہ کی کمی ہے ان کے طرز کلام سے ظاہر ہے کہ وہ حد کے منکسر اور راستباز تھے۔ وہ شاعری کے فرائض ادا کرنے میں کسی بڑے سے بڑے شاعر سے کم نہیں ہیں وہ فارسی اور اردو میں یکساں قلم اٹھاتے ہیں۔

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا　　　　تا محیطِ بادہ صورتخانۂ خمیازہ تھا

فرماتے ہیں کہ رات کو شوق ساقی کا خمار قیامت کے انداز کا تھا اور میرا صورت خانۂ خمیازہ محیطِ بادہ تک پہنچا ہوا تھا بالکل صاف الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جس شب میں ساقی تک نہ پہنچ سکا تو میرا خمیازہ کا صورت خانہ (نقشہ سے مراد ہو سکتی ہے) محیطِ بادہ یا شراب خانہ تک مجسم ہو کر پہنچا اسکی شرح کافی کیجائے تو دو ایک صفحہ بھر سکتے ہیں لیکن نوعیت تخیل کے شناسا سمجھ سکتے ہیں کہ غالب نے اس شعر میں جن جذبات کی مصوری کی ہے وہ بالکل نئے ہیں اور ان کو اپنے تصورات ذہنی کے ظاہر کرنے میں جو جگر کاوی کرنا پڑی ہوگی اس کی تصدیق ہر نقاد سخن کرے گا میرے نزدیک غالب کے مذکورہ بالا شعر کا مفہوم گو بخوبی ذہن نشین اور تسکین

بخش نہ ہو مگر ایک عجیب و غریب معنی آفرینی ہے۔ رندانہ خمار و خیانہ کی حالت کو اس نئے انداز سے لکھا ہے کہ دل اور خیال پر خاص اثر پڑتا ہے۔

(خودداری اور مودبانہ استغنا)

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم   الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

غالب اپنی خودداری کا اقرار کرتے ہیں لیکن درِ کعبہ کو بند دیکھ کر اس کے کھلوانے کی جرأت نہ کرنا بھی ادب شناسی میں داخل ہے اور اس لئے یہ ادعائے خودبینی بالکل نیا اور ذو معنی ہے۔

غالب نے اپنے اُردو دیوان میں دقیق اشعار کے سوا جو صاف و سادہ شعر کہدیئے ہیں ان میں بھی بے حد مزہ بھر دیا ہے اور ان کا بھی جواب نہیں ہو سکتا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ غالب گویا نرے فارسی شاعر تھے ان کی اردو بھی فارسی ہے اور فارسی تو بالکل ٹکسالی فارسی ہے اور ان کا یہ کہنا کہ:

بیا ورید گر اینجا بود زباں دانے   غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

گو ایک قسم کے انکسار کو ظاہر کرتا ہے لیکن دراصل بہت بڑا دعویٰ کیا ہے وہ ایک ایسے زباں داں کی تلاش کرتے ہیں جو ان کے کلام کو سمجھے اور داد دے۔ غریب شہر اپنے کو اسی لئے کہتے ہیں کہ باوجود پارسی النسل ہونے کے ان کی تعلیم و تربیت ہندستان میں ہوئی۔ غالب کے اُردو اشعار بہت کچھ مشہور ہیں۔ اسوقت ان کے بعض فارسی اشعار بھی ملاحظہ ناظرین کے لیے درج کیے جاتے ہیں۔

ذیل کے شعر میں غالب کی شوخی ملاحظہ ہو:

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت   پرسد چرا کہ نرخِ مے لعل فام چیست

اس شعر کے ایک معنی تو مذاق غالب کے موافق یہ ہوئے کہ ایک خرقہ و مصحف جائداد کے طور پر تھا اگر ان کو اس نے فروخت نہیں کیا تو شراب کا نرخ کیوں دریافت کیا۔ اس میں رندانہ شوخی استخفاف مذہب کی حد سے بھی گذر گئی ہے لیکن دوسرے معنی یہ بھی ہوئے کہ جو لوگ خرقہ پہن کر اور مصحف پر ایمان لا کر بھی شراب کی طرف مائل ہیں وہ کسواسطے مائل ہیں یعنی ان کا ایمان اور عقیدہ یکساں نہیں ہے مصرع اولیٰ میں استفہامی حالت ہے خرقہ و مصحف کے فروخت کرنے کا یقین نہیں ہے لیکن شراب کا نرخ دریافت کرنے سے شک ہوتا ہے کہ شاید ایسا کیا گیا ہے۔ جو لوگ خرقہ و مصحف رکھ کر پابند شریعت نہیں ہیں وہ گویا اس شعر کے حسب حال ہیں۔

رضواں چو شہد و شیر بغالب حوالہ کرد   بیچارہ باز داد و مئے مشکبو گرفت

یہ شعر بھی رندانہ رنگ میں ہے مگر اصل حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ مےنوش کو شہد و شیر سے کیا تسکین ہو سکتی ہے اس لئے اس نے اس کو واپس کر کے مے مشکبو کی خواہش کی اور پردہ رضواں پر عدم مزاج شناسی کا اعتراض کیا ہے۔ مصرع ثانی میں مئے مشکبو سے مراد دنیاوی شراب تو ہو ہی نہیں سکتی مے مشکبو سے مراد شراب طہور لیجا سکتی ہے کہتے ہیں کہ جب میں مرکھپ کر ایسے مقام تک پہنچا ہوں تو مجھے شہد و شیر کے عوض مشکبو شراب ہی کیوں نہ دی جائے بیچارہ کا ٹکڑا ریزہ الماس سے بھی زیادہ قیمتی ہے اور اس کے معنوں میں جو لطف ہے وہ لفظوں میں نہیں ادا ہو سکتا عجب عاجزی اور بے کسی ٹپکتی ہے۔

(تصوف)

ریزد آن برگ و این گل افشاند ہم خزان ہم بہار در گنداست

کہتے ہیں کہ دنیا کی خزاں و بہار میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ ایک میں پتے گرتے ہیں دوسرے میں پھول اور مآل دونوں کا فنا ہے اسلیے نہ خزاں سے رنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے نہ بہار سے بے حد خوش ہونے کی۔

نومیدی ما گردش ایام ندارد روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

کتنا صاف اور سچا شعر کہا ہے کہتے ہیں کہ ہماری ناامیدی گردش ایام سے بری ہے اس لیے کہ ناامیدی میں خوشی اور غم دونوں یکساں ہو جاتے ہیں اور پھر گردش ایام کی شکایت ہی نہیں رہتی۔ دوسرے مصرعہ میں مثال دیکر سمجھاتے ہیں کہ جب گھنگھور گھٹا میں دن تاریک ہو جاتا ہے تو اُس کو سحر و شام یکساں ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں اپنی ناامیدی دکھائی ہے اور دوسرے میں ایک واقعہ کو موزوں کر دیا ہے۔

بوصل لطف باندازۂ تحمل کن کہ مرگ تشنہ لبود آب چوں ز سر گزرد

کیا مزہ کی بات پیدا کی ہے کہ وصل میں مجھ پر اتنی ہی مہربانی اور لطف کرو جس کا میں متحمل ہو سکوں اور اگر میرے اندازہ تحمل سے زیادہ لطف ہوگا تو میں خوشی کے مارے جی نہ سکوں گا، شادی مرگ ہو جاؤں گا۔ مصرعہ ثانی میں مثال دیکر سمجھاتے ہیں کہ جب دریا میں پانی کسی کے سر سے گزر جاتا ہے تو موت پیاسی ہو جاتی ہے یعنی وہ ڈوب جاتا ہے۔ کس قدر سچا مضمون ہے۔ معشوق سے کہتے ہیں کہ تو مجھ پر وصل میں زیادہ لطف نہ کر۔ یہ فرمائش عام مذاق عشاق کے تو خلاف ہے لیکن دراصل غالب کا خیال بہت صحیح ہے۔

عشوۂ مرحمت چرخ نخر کاس عیار یوسف از چاہ برآورد کہ ببازار برد

اس شعر میں فلک کی دھوکہ بازی سے بچنے کی ہدایت کرتے ہیں اور مثال دیکر سمجھاتے ہیں کہ دیکھو کہ جب حضرت یوسف کنوئیں سے نکالے گئے تو بطور غلام بازار میں گئے اور یہ سب گردش فلکی کا اثر تھا۔

ذیل کے شعر میں فلک کی شکایت ظلم و عداوت دوسرے طریقہ سے کرتے ہیں۔

از رشک کرد آنچہ بمن روزگار کرد در خستگی آن لطمرا دید و خوار کرد

ہائے کیا پاکیزہ مضمون ہے اور کتنی پسندیدہ معنی آفرینی ہے۔ کہتے ہیں کہ فلک نے میرے ساتھ جو کچھ کیا وہ رشک اور عداوت سے۔ جب اس نے مجھے خستہ حالی میں بھی خوش دیکھا تو اس نے مجھکو خوار کرنے کی فکر کی۔ اس سے ضمناً یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ فلک نے اگر میری خستگی کو پسند کیا تھا تو خیر لیکن اسے مجھے ذلیل نہ کرنا تھا۔

بوسہ از لبانم دہ عمر خضر از من خواہ جام مے بہ پیشم نہ عشرت جم از من پرس

غالب کا یہ شعر بادی النظر میں رندانہ ہے لیکن دراصل اس میں متصوفانہ جھلک نظر آرہی ہے۔ کہتے ہیں کہ مجھے اپنے لب جان بخش کا بوسہ دے اور عمر خضر کی مجھ سے چاہ یعنی مجھکو بوسہ لب جاں بخش سے عمر خضر حاصل ہو جائے گی۔ مصرعہ ثانی میں

جام عشق پیکر عشرت جم کی حقیقت بیان کرنا چاہتے ہیں۔

خدارا وقت پرسش نیست گفتم بگذر از غالب — کہ ہم جان بر لب ہم داستانہا بر زبان دارم

غالب نے اس شعر میں عجیب لطف پیدا کیا ہے۔ ایسے شعر تو بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ مصرعہ اولی میں "خدارا وقت پرسش نیست" کا جملہ ایسا وسیع المعنی ہے کہ کئی صفحوں میں اسکی شرح کی جا سکتی ہے۔ وہ اپنے "معشوق حقیقی" سے عالم نزع میں یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ وقت پرسش حال یا اعمال کا نہیں ہے یعنی یہ وقت محض کرم کا ہے۔ بگذر از غالب یعنی غالب کو معاف کردے۔ دوسرے میں وجہ بیان کرتے ہیں کہ گو جان لب پر ہے لیکن تیری یاد اب تک زبان پر ہے پس ایسی حالت میں پرسش بیکار ہے اور ایک لطیف معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ میں عالم نزع میں بھی تیری داستان بیان کرکے ذوق حاصل کر رہا ہوں اب مجھے کوئی دوسری بات نہ پوچھ تاکہ میں لطف داستان سے محروم نہ ہوں۔ کیا محویت اور کیا گہرا تعلق ہے اس شعر میں متصوفانہ مذاق بھی حد درجہ کا ہے۔

گر جلوہ رخ تو بر ساغر ندیدہ ایم — چندیں بذوق بادہ دل از جا چہ میرود

غالب کی قادر الکلامی کی کیا حد ہے وہ ایک رندانہ مذاق کے شعر میں بھی تصوف و توحید کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں اپنے ساغر میں جلوہ رخ یار دیکھتا ہوں ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرا دل ذوق بادہ میں اسقدر از خود رفتہ نہ ہوتا۔ گو اس شعر کا مضمون بہت بلند نہیں ہے لیکن حسن بیان نے اس میں بھی ایک خاص کیفیت پیدا کر دی ہے۔

نازم فریب صلح کہ غالب ز کوے تو — ناکام رفت و خاطر امیدوار برد

غالب نے اس شعر میں جو مزہ بھرا ہے وہ عرفی کے اس شعر سے باعتبار رنگ تغزل کسی طرح کم نہیں ہے:

از در دوست چہ گویم بچہ ساماں رفتم — ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

غالب معشوق کے فریب صلح پر ناز کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ میں اسکی گلی سے ناکام تو گیا ہوں لیکن میرا دل امیدوار ہی رہا۔ عجیب کلیہ عشق بیان کر گئے ہیں۔ دراصل عاشق صادق کا یہی کام ہے کہ وہ کسی حال میں بھی اپنے معشوق سے ناکام اور مایوس نہ ہو۔ عرفی یہ کہتے ہیں کہ میں کیا کہوں کہ در دوست سے کس طرح پھرا ہوں۔ میں ہمہ تن شوق بن کر گیا تھا لیکن معشوق کی بے مہری سے ہمہ تن حرماں ہو کر پھرا۔ غالب نے یاس سے کنارہ کیا ہے مگر عرفی نے اپنے دل میں حرماں کو جگہ دی اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ گویا اپنے معشوق سے ناامید ہو گئے ہیں۔ عرفی کا شعر اپنے رنگ میں بہت بلند اور بے نظیر ہے مگر غالب نے معاملات حسن و عشق کے غیر منقطع ہونے کو کس درد اور نیاز مندی سے بیان کیا ہے۔ یہ شعر محض عاشقانہ نہیں ہے بلکہ انتہائی مذاق تصوف کو لیے ہوئے ہے۔ غالب نے اپنی ہر غزل بلکہ ہر شعر میں یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ ادبی لیاقت بہت خاص درجہ کی رکھتے ہیں۔ انشاپردازی اور بلیغ معنی آفرینی کی دھن میں ان کا دل و دماغ اعلیٰ ترین دستگاہ رکھتے ہیں مثلاً ذیل کے شعر میں بھی انھوں نے کیا لطف اور شوخی پیدا کی ہے۔

ذوقی است ہمدمی بفغانم اگر ز رشک — خار رہت بپای عزیزاں خلیدہ باد

کہتے ہیں کہ میرے پاؤں میں جو خار عشق چبھا ہے اور تنہا فغاں کر رہا ہوں یہ کچھ زیادہ لطف کی بات نہیں ہے بہتر ہو کہ میرے

ساتھ اور لوگ بھی فغاں کریں تاکہ فغاں کا لطف بڑھ جائے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں بلکہ میری دعا ہے کہ تیری گلی کا خار عزیزوں کے بھی پاؤں میں چبھے تاکہ ہمدمی کے ساتھ فغاں کی جائے۔ اور ہنگامہ عشق میں گرمی پیدا ہو۔ دوسری بات یہ بھی نکلتی ہے کہ وہ عزیز جن کو میری فغاں سے ہمدردی نہیں ہے اور وہ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں پھر نہ سمجھیں گے۔ کیا خیال آفرینی اور کیا جدت ہے۔

رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد　　　محرم آنست کہ رہ جز باشارت نرود

یہ شعر محض متصوفانہ نہیں ہے بلکہ اسمیں فلسفۂ حکمت کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ کہتے ہیں کہ رمز شناسی کا ملکہ پیدا کرو ہر نقطہ (باریک بات یا ادنیٰ ادنیٰ شے میں) ایک ادا یا رمز مخفی ہے اگر تو نے اسکو نہ پہچانا تو کچھ کام نہ کیا اور تو عقل و فراست سے خالی ہے۔ محرم بھید فرلیں وہ ہے کہ اشارہ پر کام کرے اور مصلحت وقت کو پہچانے زمانہ یا نیچر کی ہدایت کو خضر راہ بنائے۔

ذیل کا شعر نہیں زہر میں بجھایا ہوا نشتر ہے اس سے زیادہ بامزہ شعر کہنا مشکل ہے۔

ز من بجرم طپیدن کنارہ میکردی　　　بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

کہتے ہیں کہ میرے تڑپنے کے جرم میں تو مجھ سے الگ رہتا تھا لیکن اب تڑپتے تڑپتے میرا دم نکل گیا اور مجھ کو خاک میں دفن کر دیا گیا اس لیے اب تو میری خاک (قبر) پر آ اور دیکھ کر کس آرام سے سو رہا ہوں۔ ہائے کس دردناک طریقہ سے معشوق کے آنے کی تمنا کی ہے۔ اور پھر رضا جوئی معشوق کے لیے طپش کا موقوف کر دینا کیا شان عاشقی ہے۔

——— ا۔ ز

زمانہ مارچ ۱۹۱۵ء

فلسفۂ غالب

(از مسٹر جگدیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی)

شاعری روحانی غذا کا سامان مہیا کرتی ہے، شاعر کو فطرت کے ہر ذرہ میں عرصۂ دو عالم کی وسعت ہر آواز میں صدائے جاں نواز اور ہر قطرہ میں دریا نظر آتا ہے۔ ہر وہ شے جو بادی النظر میں تمام دلفریبیاں کو زائل کر چکی ہو، شاعر کے سازِ روح کو اپنی مضراب سے ایسے اچھوتے نغموں سے مالا مال کر دیتی ہے کہ سامعہ کان ملاحت بنجاتا ہے۔

شاعر کی دنیا وسیع و غیر محدود ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی طبع آزمائی کسی خاص مضمون یا موضوع کی پابند نہیں۔ لیکن اس کے باوجود دنیا کی شاعری ان چند مضامین کی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکی

(۱) معرکۂ حسن و عشق (میر، سودا، ناسخ، آتش، ذوق، مومن اور غالب)

(۲) رزم و بزم اور مرثیہ خوانی (انیس اور دبیر)

(۳) نعت و مذہب (خسرو وغیرہ)

(۴) مدح و ہجو (سودا وغیرہ)

(۵) مصوری فطرت (آزاد اور اُن کے مقلدین)

(۶) حب وطن و ملت پرستی (حالی اور اُن کے مقلدین)

(۷) فلسفہ و اخلاقیات (غالب وغیرہ)

اپنے معصر شعرا کی طرح مرزا غالب نے بھی (ہجو گوئی کو چھوڑ کر) قریب قریب ہر عنوان پر زورِ طبع دکھایا ہے۔ اگر اردو میں بیدل کا تتبع کر کے وہ میر، سودا، جرأت، انشا اور ذوق سے بازی لے گیا ہے تو فلسفی شعرا کی دنیا میں اُسے ہائنے اور گوئٹے جیسے بلند پایہ سخن سنجوں کی ہمنوائی کا فخر حاصل ہے

فارسی میں جو نسبت ظہوری اور نظیری کے کلام کو عرفی اور طالب کے کمال سے ہے بعینہ وہی علاقہ مرزا کی اُردو شاعری کا میر اور سودا سے ہے۔ غالب کا فارسی کلام سلیمان، ظہیر، انوری، خاقانی نظیری، عرفی، طالب اور عمر خیام کے کلام کے ہم پلہ ہے۔ نثر میں بھی مرزا نے ابوالفضل اور ظہوری جیسے مسلّم الثبوت ادیبوں کی صف میں نمایاں جگہ حاصل کی ہے

یہاں مرزا کے کلام پر بحیثیتِ مجموعی تبصرہ کر کے اُس کے محاسن کو نمایاں کرنا مقصود نہیں بلکہ اسکی حقیقت مشاہدہ کو "دیدۂ عبرت نگاہ" کے روبرو عریاں کرنا اور اُسکی فلاسفی کو "گوشِ نصیحت نیوش" تک پہنچانا ہے۔ فلسفۂ غالب سے لذت آشنا ہونے کے لئے یہ امر بہت ضروری ہے کہ اس ماحول سے واقفیت حاصل کر لی جائے اس کے بغیر کسی شاعر کی عظمت کا صحیح اندازہ کرنا ناممکن ہے

یہ حقیقت ہے کہ مرزا نے فنِ شعر کی تحصیل فارسی شعرا سے کی اور اپنے کلام میں بھی ان کا تتبع کیا، اس لئے یہاں فارسی ادب کے اُس حصہ کا مختصر تذکرہ نامناسب نہ ہوگا جو غالب کے عہد تک عرصۂ ظہور میں آتا رہا۔

جہاں تک بہاریہ کلام کا تعلق ہے دنیا کی شاید ہی کوئی دوسری زبان فارسی کا مقابلہ کر سکے یہی وجہ ہے کہ فارسی شعرا نے غزلگوئی کو دیگر اصنافِ سخن پر ترجیح دی اور حسن و عشق کی ہنگامہ خیزی و معرکہ آرائی کے لئے اس سے بہتر صنف اور ہو بھی کیا سکتی تھی؟

غزل گو شعرا نے بالعموم پردۂ مجاز میں عشقِ حقیقی کا اظہار کیا ہے، اس قسم کے عشقیہ مضامین کا نادر نمونہ سعدی حافظ اور خسرو کے یہاں بکثرت موجود ہے۔ جس پایہ کے رزمیہ مضامین فردوسی اور نظامی کی مشہور عالم مثنویوں (شاہنامہ اور سکندر نامہ) میں ملتے ہیں اُدنیا کی بہت کم زبانوں میں ایسا بیش قیمت ذخیرہ نظر آئیگا۔ فلسفہ اور اخلاقیات کی تعلیم صوفی مشرب شعرا اور سعدی و خیام کے یہاں ملتی ہے۔ فطرت کے حسنِ ملیح میں فارسی شعرا کے لئے کوئی کشش نہ تھی یہی وجہ ہے کہ یہاں اس کے مصوروں اور ترجمانوں کی کمی ہے۔

تصوف اور غالب | مسلکِ صوفیا کی بنیاد بھی مصوری کی طرح صنفِ نازک کی نگاہِ ناز کی رہین ہے بصرہ ۷۵۲ء سے اس رندانہ مشرب کی ابتدا ہوئی، اور عائشہ خاتون کی تبلیغی سرگرمیوں نے اس کی نشر و اشاعت کو

قابل قدر وسعت دی۔ صوفیوں نے بھی ویدانت کی تلقین (आत्मन विद्धि) کے مطابق اپنی حقیقت کو معلوم کرنے کو مقدم سمجھا اور ترک لذات کی عادت ڈالی۔ یونان سے یہی صدا آتی ہے :۔ (Gnothi Santon) اور قرآن کا بھی ارشاد ہوتا ہے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ"

عائشہ کے معتقدین اس لئے صوفی (پشم پوش) کہلائے کہ انھوں نے بیش بہا لباس جو دنیا داروں اور عیش پسندوں کو مرغوب تھا یکلخت ترک کر کے سادگی اختیار کی اور صوف یا اُون کو زیب تن کیا۔ صوفیوں کا مذہب کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ وہ اسلام ہی کا ایک جزو ہے

دنیا کے فلاسفروں نے صرف اِن دو طریقوں پر کاربند ہو کر عالمِ موجودات کی حقیقت، روح و مادہ اور خدا کی ہستی وغیرہم اہم مسائل سے بحث کی ہے :۔

(۱) تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ظاہر اشیاء کے وجود کے متعلق نتائج اخذ کرنا۔

(۲) تخیلات و تصورات کو دلائلِ عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر انسانی وجود کی حقیقت و علت وغیرہ معلوم کرنا

ان میں سے دوسرا طریقہ زیادہ آسان و مفید مانا گیا ہے۔ صوفیوں نے بھی اسی شاہراہ پر گامزن ہو کر منزلِ مقصود کی جستجو کی ہے۔ مسٹر براؤن کی رائے ہے کہ آریوں کی تعلیم و تلقین اور ناستکوں (منکروں) کے عقائد کا صوفی مذہب پر بہت کچھ اثر ہوا ہے۔ بعض صوفی شعراء کے یہاں (جن کا فارسی ادب تا ابد منت کش رہیگا) اس حقیقت کے ثبوت موجود ہیں کہ ہند و مسلمانوں کے ارتباط باہمی سے ہی "صوفی ازم" کی جڑ مضبوط ہوئی یہاں صرف یہی مثال کافی ہوگی کہ صوفیوں نے انتہائی خلوص و رواداری سے کام لیکر ہندوؤں کی بت پرستی کو کفر و لعنت کے بجائے اصلِ ایمان قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

مسلماں گر بدانستی کہ بت چیست ۔۔۔ بدانستی کہ دیں در بت پرستی ست (گلشنِ راز)

مزید ثبوت کے لئے ایم۔ ضیاء الدین، وان کریمر (Von Kremer) اور ڈوزی (Dozy) وغیرہ اصحاب کی آراء بھی پیش کی جاسکتی ہیں مگر یہاں ایک ہی ثبوت کافی ہے۔

صوفیوں کے فلسفہ کی توجیہ و تشریح تو ایک مبسوط تبصرہ کی محتاج ہے، یہاں صرف اس حصہ کا بالاختصار تذکرہ کیا جاتا ہے جس کا نفسِ مضمون سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ہے۔

جبر و اختیار دونوں عقیدوں پر ایمان رکھنے والے صوفی اس بارے میں بالکل متفق ہیں کہ خدا کی ذات "وحدہٗ لاشریک" ہے اور اسی کے ایک اشارہ (کُن فیکون) پر ظاہری دنیا اور خالق کے وجود کی مظاہر اشیاء عالم وجود میں آئیں۔ ان کے اعتقاد کے موافق دنیا کی ہر شے ایک بے حقیقت فریب و طلسم ہے صرف خدا کی ذات قادر و قیوم ہے، دوسری ارواح اور مادی اشیاء اسی لافانی ذاتِ پاک کا جزو ہیں۔ آگے

بلکہ اس عقیدہ میں تراش وخراش ہوئی ہے، اور دنیا اور اُس کے لوازمات کو خالق کے صفاتِ حمیدہ کے مظہر و جزو قرار دیا گیا ہے۔ منصور اس سے بھی آگے گیا اور "انا الحق" کا ادعا کر کے سزاوارِ دار ہوا۔

منصور کا "نعرۂ انا الحق" ہندو[1] فلسفہ سے بہت کچھ مشابہ ہے، حالانکہ تفصیلات کے لحاظ سے اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ ہندو فلسفہ خالق دو عالم کے تین صفات (۱) ستیہ (۲) چت اور (۳) آنند بتاتا ہے، اور روح کو تیسری صفت کے علاوہ باقی دونوں پر قادر مانتا ہے، اور بعض ناقابلِ تردید دلائل کی بنا پر مدعی ہے کہ روح باہم کشاکش اور مسلسل جد و جہد کے بعد اس تیسری صفت پر بھی قابو پا سکتی ہے اسی لئے روح کا ازلی اور غیر فانی ہونا ضروری ہے۔ مشہور جرمن مصنف اور فلسفی کانٹ بھی روح کو لافانی ثابت کرنے کے لئے قریب قریب اسی طریقہ پر استدلال کرتا ہے اور روح کو بشر کا منتہائے نظر قرار دیکر منصور کی ہمنوائی کا دم بھرتا ہے[2]

گو کانٹ اور منصور دونوں کے خیالات ہندو فلسفہ کی طرح جامع نہیں، پھر بھی حقیقت سے قریب ہیں۔ ہندو فلاسفی کے متذکرہ بالا نظریہ کے صحیح مفہوم کو شمس تبریزی نے خوب ادا کیا ہے ۔

جنبش ہر ذرہ باصلِ خودت است — ہر چہ بود میل کسے آں شود
جان و دل از جذبۂ میل و ہوش — ہم صفت دلبر و جاناں شود

"ہمہ اوست" صوفیوں کا عام عقیدہ ہے؛ دنیا کی حقیقت اُنکی نظروں میں اس کے سوا کچھ نہیں ہے

جہاں خود جملہ امر اعتباری ست — بہ آں یک نقطہ کاندر دور ساری ست

روح اور خالق کے مابین جو رشتہ صوفیوں نے قائم کیا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو:۔

آنانکہ طلبگار خدائید خدائید — حاجت بطلب نیست شمائید شمائید
چیزیکہ نگردید گم از بہر چہ جوئید — کس غیر شما نیست کجائید کجائید
وجودِ اولیا او را چو عضو اند — کہ او کلیست و ایشاں ہمچو جزو اند
جنابِ حضرتِ حق را دوئی نیست — دراں حضرت من و ما و توئی نیست
من و ما و تو و او ہست یک چیز — کہ در وحدت نباشد ہیچ تمیز

---

[1] अहम ब्रह्म व्दितीय न अस्ति (अव्दैत वाद)

[2] "Act as a member of the Kingdom of ends."

"……………… Society is the Kingdom of ends."

"سوسائٹی حیاتِ بشری کے حقیقی مقاصد کا شیرازہ ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم اسی منظم شیرازہ کے جزو لاینفک کی حیثیت سے فرائض کلیت کی تکمیل کریں۔"

غالب کو نہاں خانۂ ازل سے شاعر کا دل اور فلسفی کا دماغ ودیعت ہوا تھا۔ اس کشتانِ حقیقت نے صوفیوں کے عقائد سے بہت کچھ استفادہ حاصل کیا، چنانچہ کلامِ غالب زبان حال سے اس امر کی شہادت دیتا ہے، کہیں عالمِ ناسوت میں وہ صوفیوں کا ہم زبان ہے ع

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

کہیں عالمِ جبروت میں ان کا ہمنوا ہے ؎

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اور کہیں عالمِ لاہوت میں وحدت الوجود کا حامی اور مدعی ہے ؎

نہ ہو یہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود — ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

اولیاء کی طرح غالب بھی صرف خدا کی ہستی کو ازلی تسلیم کرتا ہے اور عالمِ موجودات کے ذرہ ذرہ کے عدم و وجود کو اسی ایک ذات سے وابستہ سمجھتا ہے۔ ملاحظہ ہو ع

نہ تھا جب کچھ خدا تھا اور نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ہے تجلی تری سامانِ وجود — ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

دنیا کی حقیقت بھی غالب کی نظروں میں بالکل وہی ہے جو صوفی شعراء کی نگاہ میں ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

منصور کی طرح غالب بھی روح و خالق کے رشتہ کی حقیقت سے آشنا ہے ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو منظور تنک ظرفیِ منصور نہیں

نہ تھا کچھ تو خدا تھا اور نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

مرزا نے عام صوفیوں کی طرح خالق کو "کل" اور روح و مادہ کو "جزو" مانا ہے۔ ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل — کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

عمر خیام اور غالب | متصوفین کے علاوہ ایک اور بھی بزرگ ہستی ہے جس کا فلسفہ غالب رہینِ منت ہے اور یہ خراسان کا مشہور حکیم عمر خیام ہے (ہر چند خیام کا سنِ ولادت یقین کے ساتھ تعین نہیں کیا جا سکتا مگر عام طور پر اس کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۰۱۵-۱۰۲۰ء بیان کی جاتی ہے)

اس میں شبہ نہیں کہ ایرانی خیام اور ماقبل الاسلام بھی فانی انسان اور ازلی خدا کے باہمی رشتہ کی

دریائے ت میں غلطاں و پیچاں تھے۔ چنانچہ زرتشت کے مذہب کے دوران فروغ میں بھی مانی و مزدک کی تحریکات کو قبولیت عامہ کا فخر حاصل تھا۔ ادھر بدھ اور ویدانت کے فلسفہ نے حدود خراسان میں اپنا سکہ جما رکھا تھا۔ کچھ ایرانیوں کی ذہنیت بھی ایسی تھی کہ متصوفین کے معتقدات میں حزن و ملال، یاس و حسرت کے عناصر شامل ہو گئے۔ چنانچہ فارسی ادبیات میں خیام سے بہت پہلے ایک محزون و ملول شاعر گذرا ہے جس کا نام شہید بلخی تھا اور جو رودکی کا ہمعصر خیال کیا جاتا ہے، اس کے کلام سے حزن و یاس کے اشارات پائے جاتے ہیں، جو غالباً گوتم بدھ کی تلقین کا نتیجہ ہیں۔ گوتم کی نظروں میں کائنات کے تمام مناظر و مظاہر عارضی، ناکارہ اور ہیچ تھے۔ اور زندگی کا مقصود اعلیٰ ہوا و ہوس کو مٹا کر نروان حاصل کرنا تھا۔

اس کے علاوہ یونانی فلسفہ بھی یونان اور دیگر اقطاع مغرب سے ایرانی ذہنیت کو من حیث المجموع متاثر کرتا رہا۔ ۴۳۵-۳۵۶ ق م میں سیرین کا مشہور فیلسوف ارسٹیپس (Aristippus) ایک نئے فلسفۂ حیات کی تبلیغ میں مصروف تھا۔ اس نے دنیا کی ناپائداری و بے ثباتی، مستقبل کی تاریکی اور انسانی عقل کی نارسائی و معذوری سے متاثر ہو کر طربیہ زندگی کو مقصود ہستی قرار دیا۔

ارسٹیپس کی وفات کے چند سال بعد (۳۴۱-۲۷۰ ق م) ایپکیورس (Epicurus) نے بھی قدرے تغیر و تبدل کے ساتھ اس کی تبلیغی سرگرمیوں کو از سر نو تازہ کرنے کی سعی کی۔ اور قریب قریب اسی نظریہ کی تائید کی جو اس کے پیشرو کا مقولہ تھا۔ مادھو آچاریہ "سرو درشن سنگرہ" کے باب اول میں رقمطراز ہیں کہ ہند قدیم میں چرواک منی نے بھی اپنے پیروؤں کو یہی تلقین کی تھی، ان کی تعلیم کا بنگال میں صدہا سال تک چرچا رہا۔ بہرحال یہ خیالات زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہندی اور یونانی تہذیب کی جائے اتصال (ایران) تک بھی جا پہونچے، اور رنگین مزاج خیام، ہوریس (Horace) ہائن اور بائرن کی طرح موج حیات کی اس طغیانی میں بہہ گیا۔

دسویں صدی کے مشہور طبیب ابو جعفر نے پہلے پہل ایرانی ذہنیت کی جبلی افسردگی و انقباض کا ردِ عمل تلاش کیا اور غالب کی طرح مے و نغمہ کو "اندوہ ربا" کہہ کر جو دم عیش و مسرت میں گذرے اسے غنیمت جانا۔ بلاشبہ خیام صوفیوں کی تعلیم کی طرح ان خیالات سے بھی متاثر ہوا۔

اگرچہ خیام کے کلام کے ظاہری مطلب کو مدنظر رکھ کر اس کے خلاف کفر و الحاد کا فتویٰ صادر کیا گیا اور اسے موردِ عتاب ٹھہرایا گیا ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ خود خیام کی رباعیات شاہد ہیں کہ وہ بھی اہل ایمان کی طرح خدا کی ہستی کا قائل ہے ؎

در صومعہ و مدرسہ و دیر و کنشت ترسندہ ز دوزخند و جویائے بہشت

آنکس کہ ز اسرارِ خدا باخبر است   زیں تخم درِ اندرون دل ہیچ نکشت

صرف یہی نہیں بلکہ اُسے رام (خدائے قدیر) کے رحیم ہونے میں بھی مطلق کلام نہیں ہے۔

خیام از بہرِ گنہ ایں ماتم چیست   در خوردن غم فائدہ بیش وکم چیست

آں را کہ گنہ نکرد غفراں نبود   غفراں ز برائے آمد غم چیست

خیامؔ جب دنیا کی نیرنگیوں کی جانب آنکھ اٹھاتا ہے تو اُسکے دل ودماغ میں بیقرارانہ شکوک کی بے شمار لہریں اٹھتی ہیں، اور وہ عالم اضطراب میں یہ سوال کرنے لگتا ہے ؎

ہر چند کہ رنگ وبوئے زیباست مرا   چو لالہ رخے چو سرو بالاست مرا

معلوم نشد کہ در طرب خانۂ خاک   نقاشِ من از بہرِ چہ آراست مرا

اور جب کوئی طمانیت بخش جواب نہیں ملتا تو وہ کاؤنٹ گوبینو کے خیال کے مطابق ایرانیوں کی فطری زندہ دلی کے مطابق مے نوشی و مدہوشی کی ظلمتوں میں حیات انسانی کا منتہائے مقصود تلاش کرنے لگتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان وجہان سب کچھ فانی ہے اور مستقبل بحرِ ذخار کی نامعلوم گہرائیوں سے بھی زیادہ مبہم و نامعلوم! پس وہ وفورِ یاس اور جوشِ دیوانگی میں پکار اٹھتا ہے۔

زاہد گوید بہشت با حور خوش است   من می گویم شراب انگور خوش است

ایں نقد بگیر دست از آں نسیہ بدار   آوازِ دہل شنیدن از دور خوش است

چوں عہدہ نمی شود کسے فردا را   خالی خوش کن تو ایں دلِ سودا را

مے نوش بنورِ ماہ اے ماہ کہ ماہ   بسیار بیاید و نیابد ما را

لیکن خیامؔ مے گساری کو گناہ خیال کرتا ہے، اسی لئے اس نے یہ اعلان بھی کیا ہے ؎

مے خوردنِ من نے از برائے طرب است   نے بہرِ فساد و ترکِ دین و ادب است

خواہم کہ بہ بیخودی برآرم نفسے   مے خوردن و مست بودنم زیں سبب است

حیات و ممات کے مسائل کا حل دریافت کرنے میں وہ ارسٹیپس اور آپی کیورس کا ہمخیال نظر آتا ہے

چوں مردن تو مردن یکبارگی است   یک بار بمیر ایں چہ بیچارگی است

خونے ونجاستے وشتے رگ وپوست   در کار نبود ایں چہ غم خوارگی است

خیامؔ راحت وآرام کی آرزوئے خراب کو امیدِ موہوم سمجھے ہوئے ہے اور اس بارے میں دنیا سے جو اس کے نزدیک نمود بے بقا اور دار المحن ہے قطعاً مایوس ہے ؎

شادی مطلب کہ حاصلِ عمر دمے است   ہر ذرہ ز خاک کیقبادے وجمے است

احوالِ جہاں و اصلِ این عمر کہ ہست　　　　خوابے و خیالے و فریبے و دمے است

پنیٹر، ہوریس اور ایکلیسسٹز (Ecclesiastes) کی طرح اس کی دانست میں بھی اسی سرائے کا ایک ایک تشنہ لب ذرہ تغیر پذیر اور جادۂ عدم و فنا پر بسرعت گام زن ہے۔ ہوریس (مشہور اطالوی شاعر) کہتا ہے:-

"دوشیزۂ بہار کے ناز پرور دہ پھول اپنی آب و تاب، ہمیشہ اسی طرح قائم نہیں رکھ سکتے، ماہتاب کا روئے رنگین اسی طرح درخشاں و تاباں نہیں رہتا، نہ بارشِ نور میں وہ یکسانیتِ جمال نظر آتی ہے۔ پھر بنائے دوام کے تیرہ و تار تصور کی کیا حقیقت ہے؟ کون جانے ...."

ہر چند خیام کی نظروں میں رونا بے سود ہے اور حال کی عارضی مسرت، زندہ دلی اور ہنستا ہنسانا زندگی کا ماحصل ہے، مگر میرا خیال ہے کہ اُس نے بھی اسٹوا کس (سقراط وغیرہم) اور ہتنکس (زینو وغیرہم) اور ناگوں کی طرح رنج و راحت سے بے نیاز رہنے کی کنایۃً حمایت کی ہے۔ شاید اسی لئے وہ حال کی عارضی مسرت یعنی گناہ آلود طربیہ زندگی سے برگشتہ ہو کر خود فراموشی و بیخودی کی تمنائے حصول میں شراب کا طالب نظر آتا ہے۔ اور ترک لذات کا دوسرا پہلو لئے خداوند دو عالم کی لازوال رحمت کے توکل کے رنگین گھر میں کھویا رہتا ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ خیام کا فلسفہ ہائین اور بائرن کی طرح حال کی عارضی مسرت تک محدود ہے مگر جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے یہ فیصلہ ہنوز ناقص و تشنۂ تحقیق ہے۔

بہر حال غالب پر خیام کی رباعیات کا بھی براہ راست اثر ہوا ہے۔ غالب کا فلسفہ اس وقت تک تقریباً نامکمل ہے جب تک کہ خیام کے فلسفۂ حیات کے اثرات کو ذہن نشین نہ کر لیا جائے چنانچہ حتی الامکان سطور بالا میں اُن نکات کو مجموعی طور پر یکجا کر دیا گیا ہے جن کو مرزا نے بے چون و چرا قبول کر لیا ہے۔ یہاں غالب کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن کا خیام کی رباعیات سے موازنہ کرکے معلوم ہوگا کہ مرزا نے حکیم موصوف سے کس قدر استفادہ کیا ہے۔

خیام جنت کو "نسیہ" قرار دیکر اُس کے وجود سے منکر ہے مگر غالب ببانگِ دہل کہہ رہا ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　　　دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ابتداً مرزا نے بھی خیام کی طرح عیش و نشاط کو زندگی کا مقصدِ اعلیٰ قرار دیا ہے ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے　　　　عاقبت کی خبر خدا جانے

بعد ازاں مایوس ہو کر کہتا ہے ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے[۱]

مرزا نے خیام سے بڑھکر ترکِ لذات کی تلقین کی ہے، کہتے ہیں ؎

ترکِ لذت بھی نہیں لذت سے کم کچھ مزا اس کا بھی چکھا چاہیئے

ترکِ لذات کی وادیِ بے پایاں میں غالب کے پائے عقل نے بھی خیام کی طرح لغزش کی ہے خود مرزا بادۂ انگور کے ایک جرعہ کا طالب ہے مگر اسی نیک نیتی کے ساتھ ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

ایک اور بات بھی ہے جس میں غالب اور خیام باہم ہمخیال ہیں۔ وہ دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کے بھی مقر ہیں کہ "رنج وراحت" کے ناخوشگوار و پسندیدہ اثرات ہی تکلیف کا باعث ہیں، پس عیش کی تمنا نہ کرنا ہی غم سے نجات پانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

غالب کا فلسفہ میر سودا اور ان کے سلسلہ کے شعراء نے غزل کو عشق حقیقی و مجازی کے دائرہ میں محصور کر دیا تھا، لیکن مرزا نے ان تمام قیود کو توڑ کر غزل کی تنگیٔ دامن کی پردہ پوشی کی اور اسے قدما کے خلاف فلسفۂ حیات و اخلاقیات کی نازک خیالیوں سے مالامال کر دیا۔ تاہم غالب کی تخیل، ساکی بلند پروازیوں کو جس کشادہ دامانی کی ضرورت تھی، عروسِ فکر آج بھی اس کی تمنائے حصول میں لرزاں ہے؛

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ جب ہم میر، سودا اور ذوق وغیرہ کے مطالعہ سے مضمحل ہو جاتے ہیں تو روح کی تشنگی دور کرنے کے لئے ہمیں غالب کی صحبت یاد آتی ہے۔

پیدائشِ عالم کی ساعت سے لیکر آجتک، بشر تکوین و تخلیق کائنات اور اپنے وجود کی علت غائی دریافت کرنے کی متواتر کوششوں میں منہمک رہا ہے، مرزا کے روبرو بھی یہی عقدۂ لاینحل درپیش تھا مگر وہ دنیا کے عالمِ اسباب ہونے (اور :- कारण भावात कार्य भाव) کے عالمگیر قانون کی حقیقت کا رازداں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں فخر رازی، افلاطون، جلال رومی، حافظ اور غزالی علم یاس میں "ماعرفنا" پکار اٹھتے ہیں غالب بکمال سکون کے ساتھ کہتا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غالب متصوفین کی طرح توحیدِ وجودی کا معتقد ہے ؎

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

---

[۱] دیکھئے مکمل قطعہ۔

وہ اس راز کا محرم بھی ہے کہ تخلیقِ عالم خالق کے نگرِ عمل کی محتاج ہے۔ اسی لئے کہتا ہے ع

"ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں"

اس کی نظروں میں کائنات کی پیدائش کی علت حسن کی خود بینی کے سوا اور کچھ نہیں ؎

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں ۔ ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

غالبؔ مادّہ کے وجود سے منکر ہے اور روح کو خالق کا ایک جزوِ منفک تسلیم کرتا ہے ؎

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ۔ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا ۔ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

دوسرے شعر کی تفسیریں تو بہت ہوئیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان میں سے ایک بھی غالبؔ کے صحیح مفہوم کی ترجمانی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ صاف شعر ہے جس میں فیلسوف شاعر نے تصویر کے پردہ میں روح اور مادّہ کی ماہیت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اور کاغذی پیرہن سے پیکرِ تصویر (روح) کے جسمِ خاکی کو تشبیہ دیکر مادّہ کی بے ثباتی کا ثبوت پیش کیا ہے، نہ کہیں خیال فریادی ہے نہ فضول تلاشِ مطالب کی گنجائش۔

غالبؔ روح اور خدا کی ہم رشتگی کے لئے اعلان کرتا ہے ؎

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

کمار انبھٹ اور سوامی شنکر اچاریہ کا نظریہ بھی بالکل یہی ہے اور بائبل میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے[۱]

اپنی حقیقت کو پہچان اپنا مرزا کی نظروں میں خدا تک رسائی حاصل کر لینے کے مرادف ہے ؎

پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار ۔ جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

یہ اس لئے کہ ع ۔ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے

---

[۱] ایک مشہور تامل شاعر نے غالباً سوامی شنکر آچاریہ کی تلقین سے متاثر ہو کر بعینہٖ یہی مفہوم نظم میں ادا کیا ہے۔ یہ تامل گیت گوور (Gover) کی زبان سے سنیئے:۔

The wise man saith
That God, the omniscient essence, fills all space.
And time, He can not die or end, In him all things exist.

تامل کا قول ہے کہ وہ عالم کی وسعت کا ذرہ ذرہ اور وقت کا ایک ایک ناممکن التقسیم لمحہ خدائے قیوم کی تجلی سے معمور ہے۔ وہ ہر جگہ موجود اور بقائے دوام کا مالک ہے۔ اسی کی ذاتِ پاک پر تمام اشیاء کے وجود کا انحصار ہے۔"

فرانس کا مشہور فلاسفر اسپینوزا اس بارے میں تامل شاعر کا ہمخیال نظر آتا ہے۔

غالب اپنی حقیقت کے بارے میں یوں گویا ہے ؎

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے　　جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

چونکہ صوفیاء کے نزدیک ما سوا، قطعاً معدوم ہے اس لئے غالب اس نئے انداز سے اپنی لاعلمیِ حقیقت کا اعتراف کرتا ہے ؎

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

پھر کہتا ہے ؎　　ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

گو وہ حیاتِ انسانی کو عارضی و فانی تصور کرتا ہے (ع ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے) لیکن چونکہ روح کو جزوِ خالق تسلیم کر چکا ہے اس لئے اس کے لافانی ہونے میں ایمان رکھتا ہے ؎

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا　　میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

اس شعر کی تشریح بھی صحیح نہیں ہوئی ہے، ورنہ مرزا نے مسئلۂ تناسخ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بلاشبہ شاعر نے مصرعۂ ثانی میں بالِ عنقا سے مادّہ مراد لی ہے جو اس کی نظروں میں معدوم ہے۔ اس طرح کمال خوبی کے ساتھ مادّہ کی فنا اور روح کے ثبات پر استدلال کیا ہے۔ اور یہ یقیناً ہند۔ وفلسفہ کا ناقابل تردید اثر ہے جس کا رنگ غالب پر بھی غالب ہے۔

مرزا گوتم بدھ کی تعلیم سے بھی متاثر ہوا ہے، چنانچہ خود بھی اسی کی طرح دنیا کو آلائش و آلام کی بستی قرار دیتا ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

یہی وہ تاثر ہے جو شیلے کی زبان زد ہے:-

"ابر باراں کے گنجینۂ پنہاں میں کوئی ایک قطرہ بھی ایسا نہیں جو کبھی انسان کی رگ و پے میں خون بنکر موجزن نہ ہوا ہو، نہ خاک کا ایک ذرہ بھی ایسا ہوگا جو کبھی کسی فرد کا جزو نہ ہوا ہو۔"

اُپنشدوں نے ہستی کے وجود کو "مایا" سے تعبیر کیا ہے۔ ڈے کارٹ جیسے مادّہ پرستوں کے خلاف برکلے نے بھی اس بعید از تردید نظریہ کی تائید کی ہے[1]۔ غالب کی ہمہ گیر طبیعت سے یہ توقع کرنا کہ وہ ثباتِ عالم کے بارے میں کوئی جداگانہ رائے رکھتا ہو موجِ ہوا پر طلسمِ فریب باندھنے کی سعیِ لاحاصل کے سوا کچھ نہیں۔ غالب نے بارہا کہا ہے ؎

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور　　جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

[1] (Nothing exists beyond a perceptient mind)

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا　　کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل　　گرمیِ بزم ہے یک رقصِ شرر ہونے تک

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشہ باختن　　چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم　　لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

یہاں اس اعتراض کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ آخر خالق کو ایک فضول شے کی تعمیر کے لئے خواہ مخواہ دردِ سر مول لینے کی کیا ضرورت تھی؟ غالب اس اعتراض سے بے خبر نہ تھا اس لئے اُس نے پیش بندی کر لی ہے ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

گوتم بودھ کی طرح زیست کا ماحصل غالب کے نزدیک بھی بیش از رنج و غم اور کچھ نہیں ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ　　دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

انسان روزِ ازل ہی سے اس غمکدہ میں بارِ الم اُٹھانے کے لئے با دیدۂ پُر نم آیا ہے اور اُسے روزِ اول سے موت کا کھٹکا لگا ہے ؎

خوشی کیا، کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے　　سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برق خرمن کو

مرزا کو خیالِ مرگ ہی ملول و آزردہ خاطر رکھتا ہے چنانچہ رقمطراز ہے۔ ع

خیالِ مرگ کب تسکین دلِ آزردہ کو بخشے

اور ؎

تمنا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی　　عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

غالب کے یہاں ہراس فنا کی رسائی دنیائے دنی کے اُس پار عدم تک ہے ع

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل

موت کے علاوہ حزن و ملال کی ایک اور وجہ بھی ہے جو غالب نے ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے نمایاں کی ہے، اور وہ یہ کہ ہماری بیشتر تکالیف کا سرچشمہ تعیش پرور خواہشات نفسانی ہی ہیں۔ دو حقیقت آرام طلبی جوانی کا ایک دلفریب خواب ہے جس کی تعبیر طوفانِ اضطراب ہے۔ چنانچہ ابتداءً (غالباً عنفوانِ شباب میں) مرزا نے بھی فکرِ مآل کو ہر فِ عدم التفاتی قرار دیا اور خیام اور بلبہ سامی کی طرح نفس پرستی و شکم پروری کو دوائے دردِ دل تجویز کر کے کھاؤ پیو اور خوش رہو کا نسخہ تحریر کر دیا ع

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں

کیونکہ ؎ رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
مگر جب انجام کی جانب نگاہ کی تو ہوش ہوا کہ ع

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی

چنانچہ پھر خیال آیا ع ہے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
جبکہ دنیا سرائے فانی ہے اور ؎

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل گرمیِ بزم ہے یک رقصِ شرر ہونے تک

بالآخر فیصلہ کیا کہ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہاں غالب نے غم کو جان کا ساتھی اور موت کو وبائے غم کا علاج مان لیا ہے، اور اس طرح خوفِ فنا کو بے سود ثابت کر دیا ہے۔ مرگ کے جاں گسل مسئلہ پر مرزا نے اپنے خیالات کو ذرا شرح و بسط کے ساتھ واضح کیا ہے۔ غالب کے پہلو بہ پہلو براؤننگ کو بھی رکھ لیجئے اور ایک ہی مسئلہ پر دونوں کے خیالات کا موازنہ کر کے غالب کی اہمیت کا اندازہ کیجئے ع

نہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟

The best is yet to be ......

The last of life for which the first was made.

(وہ انتہائی مقصودِ حیات، ابتدائے زیست جس کی منت کشِ احسان ہے ابھی دُور ہے
ہاں مآلِ زندگی کا اتمام ہونا باقی ہے)

غالب مہاتما سقراط کی طرح حذرِ مرگ کو وہم ذمیم تصور کرتا ہے اور یہ اس لئے کہ ؎

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟

غالب ایک محرمِ حقیقت کی حیثیت سے پتہ دیتا ہے کہ حیاتِ انسانی کا مقصودِ حقیقی عارضی عیش کے سراب سے گذر کر مسرتِ دوام حاصل کرنا ہے ع

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اسی کا نام حیاتِ جاوید ہے اور اسی کو ہندو فلسفی واصلِ حق ہونا یا نروان کا حصول کہتے ہیں۔ مرزا ان حقائق سے بدرجۂ اتم واقف تھا کہ

حال و قالی از ورائے حال و قال غرق گشتہ در جمالِ ذوالجلال

غرقۂ نے کہ خلاصی باشد شش   یا بجز دریا کسے بشناسد سی

اِسی لئے کہہ گیا ہے ؎

قطرہ دریا میں جو ملجائے تو دریا ہوجائے   کام اچھا ہے وہی جسکا مآل اچھا ہے

اس لافانی سکون ومسرت کے حصول کے جو وسائل وذرائع مرزا نے بتائے ہیں اُن میں سے ایک ترکِ لذات ہے۔ اپنی گذشتہ زندگی پر نقادانہ نظر کر کے شاعر نے جو ناخوشگوار نتیجہ اخذ کیا اس نے اس کے عقائد وعزائم میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ ع

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

تو اُس پر رازِ حقیقت کا انکشاف ہوئے بغیر نہ رہا اور اس معرفت آشنا نے "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کی جدوجہد پر غالب آ کر کہہ ہی دیا ؎

ترکِ لذت بھی نہیں لذت سے کم   کچھ مزا اس کا بھی چکھا چاہیئے۔

سجوک اور رِل کا بھی یہی مذہب ہے۔ انگریزی کا مشہور شاعر لانگ فیلو دامنِ زندگی کو تمام دلچسپیوں سے لبریز پاتا ہے، لیکن براؤننگ اور غالب اُسے تمام مسرتوں سے عاری دیکھتے ہیں۔ ان کے لئے وہاں کچھ خوبصورتی نہیں اور نہ کوئی دلکشی ہے۔ اول الذکر کی طرح آخر الذکر بھی ہمت واستقلال کے ساتھ زندگی سے عمر بسر کرنے کے حامی ہیں۔ لیکن ان کے عقائد میں بڑا فرق ہے۔ خدا کا توکل[1] تو سبھی کو ہے لیکن غالب کی بزرگی یہ ہے کہ اُس نے تلاشِ حق کا صحیح راستہ دریافت کر کے اس کا احساس کیا ہے اور ہر دو حریفانِ مغرب دائرۂ عقیدت سے باہر نہ نکل سکے۔

غالب اور براؤننگ دونوں کے لئے دنیا مصائب اور کلفتوں کی دُنیا ہے۔ لیکن دونوں میں سے ایک بھی ان آفات وصعوبات سے ہراسان ونڈھال ہو کر جادۂ مستقیم سے کبھی نہیں ہٹتا۔ براؤننگ کو ہمتِ مرداں کا خیال ہے:۔

Bear the brunt, in a minute pay glad life's arrears,

of pain, darkness and cold."   (Prospice).

Then, welcome each rebuff
That turns earth's smoothness rough.
Each sting that bids nor sit nor stand but go,

---

[1] براؤننگ، کانٹ کے نظریہ کا مؤید ہے:۔ "Trust god" "god is in heaven"
یہی کلمات غالب کے بھی وردِ زبان ہیں۔ ع گر کوئی نہیں ہے تو مری جان خدا ہے۔

Be our joys three parts pain."
(Rabbi Ben Ezra)

(کشمکش حیات کے مصائب برداشت کرو، اور ایک ہی لمحہ میں رہی سہی دشواریوں کا قرض بر وسِ خنداں بیباق کردو)
(راستے کے ہر اس روڑے کا خیر مقدم کرو جو ہموار سطح زمین کو دشوار گذار بنادے اور ہر اس چسکی کا جو اٹھنا بیٹھنا محال کردے۔ کاش ہماری تکالیف مسرتوں سے سہ چند ہوتیں۔)

اور بقول غالب:-

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب — لطمۂ موج کم از سیلیِ اُستاد نہیں
نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں — ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن — غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

ع سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے

غالب کا مقولہ ہے کہ

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

یہاں مرزا نے ایک ایسی زبردست حقیقت کا انکشاف کیا ہے جس کی مثال براؤننگ کے یہاں بھی نہیں ہے۔ غالب کا فلسفہ ہرزہ سرائی سے قطعاً پاک ومعرا ہے۔ دختِ رز کی مدح سرائی میں وہ خیام اور حافظ کا ہم پلہ ہے۔ مگر ع

رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے، خوشا موجِ شراب

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی — کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

یہاں ختر انگوری اس لئے روا نہیں کہ وہ "دارو ئے اندوہ ربا" ہے بلکہ اس لئے کہ وہ بیخودی کی کیفیت طاری کردیتی ہے اور بیخودی قطرہ کو واصل دریا کردیتی ہے، چنانچہ کہا بھی ہے کہ "بزمِ قدح سے عیش تمنا نہ رکھ" مے پرستی وبادہ خواری کے باوجود بھی مرزا کی طبیعت اتنی بے لوث ہے کہ اس کے دامن تقویٰ پر اس نجس چیز کا ایک بھی دھبہ نظر نہیں آتا۔

وجودِ عالم کی طرح اُسے فردوس و عدم سے بھی انحراف ہے ؎

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا ۔۔۔ وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

ہے غیبِ غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود ۔۔۔ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب سے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب ۔۔۔ آخر تو کیا ہے ؛ اے نہیں ہے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم

یہ کرم کی فلاسفی ہی کا نتیجہ ہے جو غالب جنّت و عدم کے وجود سے منحرف ہے ۔
میر نے تو ترکِ اسلام ہی پر قناعت کی تھی مگر ذرا مرزا کو بھی دیکھئے ع

نہ حشر و نشر کا قائل نہ دین و ملت کا

وہ موحد ہے اور اس کا کیش ترک رسوم ہے اور حقیقت میں ہونا بھی یہی چاہیئے ۔ کیونکہ ع

عاشقاں را مذہب و دیں نیستی

نیز ؎ مرد خدا زاں سوئے کفر است و دیں ۔۔۔ مرد خدا را چہ خطا و صواب

مرزا کا ایمان وفاداری و استواری کے مقدس جذبہ میں مستور ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے ۔۔۔ مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

متذکرہ شعر کو پڑھکر گمان ہوتا ہے کہ مرزا نے گیتا کی تعلیم کی مستغنی عن التعریف تشریح کردی ہے
خدا کی بندگی اس کے نزدیک بے وقعت و فضول شغلہ میں تضیع اوقات کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ؎

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ۔۔۔ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

پھر ع ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے

ہاں خداوندِ بے نیاز کی بے غرض عبادت میں کوئی مضائقہ نہیں ؎

گر تجھکو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ ۔۔۔ یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

مخلصانہ و بے غرضانہ اپنے فرائض کی تکمیل کرنا ہی حقیقی مذہب ہے جس پر خیر عالم کا صحیح معنوں میں انحصار ہے ۔ بقول ملٹن

"They also serve who only stand and wait"

(J. Milton, on his blindness.)

(وہ بھی اس احکم الحاکمین کے وفادار خدام ہیں جو انتظار کی خاموش گھڑیاں صبر و سکون کے ساتھ گذار دیتے ہیں ۔)

مشہور جرمن فیلسوف کانٹ بھی تکمیل فرائض کو زندگی کا اہم ترین پہلو تصور کرتا ہے اور"ادائیگی فرض بہ حیثیت فرض" پر زور دیتے ہوئے اس حقیقت کو بھی فراموش کر دیتا ہے کہ "God is love" خدا محبت مجسم ہے۔ مگر غالبؔ کے یہاں ایسی بات ہونا محال ہے، اُس نے ہندوؤں کے بے عدیل ولافانی فلسفہ سے استفادہ کیا ہے جہاں بھگوان کو بھی پریم کے بس میں بے بس مانا گیا ہے۔ گوسامی تلسی داس جی کی شہرہ آفاق تصنیف اسی پریم پرچا سے پُر ہے۔ غالبؔ کو اسکا بھی وثوق تھا یعنی یہ کہ

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں سازسے ۔۔۔ انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

غالبؔ کے بعض معتقدات بظاہر اسلام کے منافی ہیں لیکن اس نے حقیقت کو بے نقاب کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ اسلام نے قدم قدم پر جنت کا لالچ دیا ہے مگر غالبؔ پکار رہا ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ ۔۔۔ دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

الغرض غالبؔ بادۂ حب وطن سے سرشار، تعمیر قوم، مذہبی رواداری اور آزادیٔ ملک کے درد سے مضطرب نوجوانوں کو پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے:-

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ! ۔۔۔ میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے!!

وہی درد، وہی لگن اور وہی اضطراب جو گویئٹے کو خدمتِ وطن کے لئے اُبھار رہا ہے، وہی جوش اور وہی جذبہ جس نے نپولین، جون آف آرک، پرتاپ، ٹیپو، نانا اور لکشمی بائی کو حیاتِ دوام بخشی اور جو اب بھی تا ابد اسی طرح بروئے کار رہے گا، غالبؔ کی رگ رگ میں جاری و ساری ہے۔ اگر ایک طرف یہ التزام ہے تو دوسری طرف خود حقیقت بے نقاب ہو کر چشمِ حقیقت بیں کو دعوتِ نظارہ دے رہی ہے۔ دریں صورت اگر دیوانِ غالبؔ کو ایک الہامی کتاب کہا جائے تو بیجا نہیں ہے۔

'زمانہ' اگست ۱۹۳۱ء

مرزا غالب اور دیگر شعرا

(از جناب طالب کاشمیری)

مرزا غالب کے کلام پر بیشمار مضامین لکھے گئے ہیں، ان کے دیوان کی بیسیوں شرحیں ملک میں موجود ہیں، اُن کی شاعری کے محاسن و معائب پر طویل تحریریں شائع ہوئیں۔ مداح اہل ادب نے ایک ایک شعر کی شرح کرتے ہوئے بال کی کھال نکالی حتی کہ بعض علم دوست اور باریک بین احباب نے مرزا کے اصلی خیالات و جذبات اور معانیِ اشعار کو بہت بڑھا دیا اور بخلاف اس کے ان کے کمالِ فن سے انکار کرنے والوں نے ان کی معمولی لغزش کو مبالغہ آمیز اور رنگین پیرائے میں نمایاں کیا۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے طالبانِ ذوق، نقادانِ فن اور شعر و سخن سے ہر قسم کے مطالب پیدا کرنیوالے تشنہ لب ہیں، اور مرزا کے کلام کی باریکیوں کو پورے طور پر سمجھنے اور سمجھانے کے لئے یا دل کھول کر اس پر نکتہ چینی کرنے کی غرض سے مزید سامان بہم پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مرزا کا کلام بحیثیت مجموعی قابلِ قدر ہے۔ بعض صورتوں میں بے نظیر ہے۔ ان کی جدتِ موضوع، تنوعِ مضامین، زورِ تخیل، فلسفہ تصوف اور دیگر محاسنِ کلام ہر شاعر کے لئے باعثِ رشک خصوصیات ہیں۔ لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے ابھی تک مرزا کی شاعری کے متعلق بعض امور کی طرف اہلِ قلم کا ذہن پورے طور پر منتقل نہیں ہوا ہے مثلاً اس امر کے متعلق کہ مرزا نے دیگر شعرا کے کلام سے کس حد تک استفادہ کیا ہے، یا یہ کہ دیگر شعرا نے ان سے اکتسابِ فیض میں کس قدر حصہ لیا ہے بہت کم لکھا گیا ہے۔ ان امور کے علاوہ مرزا کے کلام میں تکرارِ مضمون کا عیب بھی موجود ہے۔ آج ہم ان کے عام محاسن و معائب سے قطع نظر کر کے متذکرہ صدر خصوصیات پر ایک غیر جانبدارانہ سرسری نظر ڈالتے ہیں، اس سے ہماری مراد نہ بیجا نکتہ چینی ہے نہ بلا وجہ مدح سرائی یا طرفداری۔ کوئی صاحبِ عقل اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا کہ بقول الانسان مرکب من الخطاء والنسیان مرزا سہو و خطا سے بالکل مبرا تھے یا یہ کہ ان کے کلام میں بمقابلۂ دیگر مستند اور ہر دلعزیز شعرا کے زیادہ عیوب پائے جاتے ہیں۔ نہیں! ہرگز نہیں!! متقدمین و متاخرین میں سے کوئی شاعر ایسا نہیں جس نے اپنے پیشرو اور ہمعصر اساتذہ کے دواوین اور تصانیف سے

فیض نہ حاصل کیا ہو (جس طرح بعد میں آنیوالے شعرا نے خود مرزا کے کلام سے فائدہ اُٹھایا) یا ان کے یہاں مضمون کسی نہ کسی صورت میں مکرر نہ بندھا ہو۔ اس تحریر سے فقط یہ دکھانا مقصود ہے کہ مرزا جیسے مسلم الثبوت اور نازک خیال شاعر بھی ان خصوصیات سے مستثنیٰ نہیں۔

مرزا نے متقدمین اور معاصر شعراء کے بعض خیالات و مضامین اپنے کلام میں اس طرح جذب کئے ہیں کہ عام لوگ جن کا مطالعہ وسیع نہیں، ان کو مرزا کے زور تخیل ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور عش عش کرتے رہ جاتے ہیں، حال آنکہ بعض موقعوں پر وہ سرقہ کے الزام سے بھی نہیں بچ سکتے، بعض اشعار میں توارد واقع ہوا ہے، بعض ترجمے کے تحت میں آجاتے ہیں، اور بعض ایسے بھی ہیں جن کا مضمون تو انھوں نے کسی اور شاعر سے لیا ہے مگر اپنے اسلوب بیان اور مخصوص طرز میں ادا کر کے اس کو بلند تر کر دیا ہے، یا بیان میں شوخی اور وسعت پیدا کر دی ہے۔ ذیل میں ہم اس قسم کے اشعار درج کرتے ہیں جن میں ان خصوصیات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں:-

فارسی کے ایک شاعر میر عبداللہ یحییٰ کا شعر ہے ؎

بیم از وفا دار بدہ وعدہ کہ من — از ذوقِ وعدۂ تو بہ فردا نمی رسم

مرزا کہتے ہیں ؎

ترے وعدہ پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

یہ شعر قریب قریب مندرجۂ بالا فارسی شعر کا ترجمہ ہے، لیکن مرزا نے اپنے شعر میں مقابلتہً زور پیدا کیا ہے

میر تقی میر کا شعر ہے ؎

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا — دم کے جانے کا نہایت غم رہا

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر بھی مضمون بالفاظ دیگر ادا کرتا ہے ؎

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی — دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

ان دو شعروں کے مطلب میں کوئی نمایاں فرق نہیں، مرزا کا انداز اگرچہ دلچسپی سے خالی نہیں لیکن میر کا شعر زیادہ سلیس اور سلجھا ہوا ہے۔

مصطفےٰ علی خاں خوشدل کا شعر ہے ؎

بوسم منِ بے برگ و نوا برگِ حنا را — تا بوسہ بہ پیغام دہم آں کفِ پا را

مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر کا مضمون اس کے ساتھ لڑ گیا ہے ؎

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا — کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

عرفی شیرازی فرماتے ہیں ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ — ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر اسی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ذوق کا شعر ہے ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں — کوئی معشوق ہے اِس پردۂ زنگاری میں

مرزا کہتے ہیں ؎

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُسکو یاد اسدؔ — جفا میں اُس کی ہے انداز کار فرما کا

ان دو اشعار کے مضمون میں زیادہ باریک فرق نہیں، بلکہ ذوقؔ کا شعر مقابلتاً بہتر ہے۔

مرزا سوداؔ کے ایک ہمعصر نوجوان شاعر کا شعر ہے ؎

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے — اِس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مرزا کے ذہن میں اس شعر کی کیفیت سمائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی رنگ ان کے اس شعر سے ٹپکتا ہے ؎

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

مرزا کا شعر مذکورہ بالا شعر کے مقابلے میں پھیکا نظر آتا ہے۔

انشاؔ کی مشہور غزل کا شعر ہے ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر اسی خیال کو ظاہر کرتا ہے ؎

غم فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

دونوں شعر اپنی اپنی جگہ خوب ہیں، اگرچہ مضمون واحد ہے۔ اس کو توارد سے منسوب کر سکتے ہیں۔

ذوقؔ فرماتے ہیں ؎

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا — کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

مرزا نے یہی مضمون ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اپنے شعر میں یوں ادا کیا ہے ؎

یہ لاش بے کفن اسدِؔ خستہ جاں کی ہے — حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

نظیریؔ کہتے ہیں ؎

نشاطِ رفتہ زدوراں بہ صبر بستانم — کہ بہ معاملہ آزردہ از تقاضا نیست

مرزا اسی مضمون کو خفیف سے فرق کے ساتھ یوں باندھتے ہیں ؎

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہو — متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

میر تقی میر کہہ گئے ہیں ؎

نہ تسلی ہوا دلِ بے تاب — نہ تھا چشمِ تر سے خونِ ناب

مرزا کا شعر اسی خیال کو یوں پیش کرتا ہے ؎

جگر تشنۂ آزار، تسلی نہ ہوا — جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس[ملہ]

ذوق کا ایک اور شعر ہے ؎

کیا اعتبارِ ہستی ناپائدار کا — چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

مرزا نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے[ملہ] ؎

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل — گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

ایک فارسی شاعر نے کہا ہے ؎

زضعفِ تن عجب حال است بیمارِ محبت را — کہ نتواند کشید از ناتوانی بارِ منت را

مرزا تھوڑے سے فرق کے ساتھ اُردو میں اسی خیال کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

ہوں فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود — قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

ذوق فرماتے ہیں ؎

جو ہے سو پہلے میرے اُٹھانے کی فکر میں — محفل میں اس کی کیا کوئی چوسر کا رنگ ہوں

مرزا نے دوسرے رنگ میں اسی مطلب کو بیان کیا ہے ؎

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے — لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

فارسی کا ایک شعر ہے ؎

تو ملولی زما و ما مشتاق — دل بدل میرود چہ حال است ایں

مرزا کہتے ہیں ؎

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

[ملہ] یہ شعر غالب کے کلامِ مطبوعہ میں نہیں ہے (زمانہ)

[ملہ] ذوق و غالب ہمعصر تھے لہٰذا ان پر سرقہ کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ (زمانہ)

یہ شعر فارسی شعر کا ترجمہ ہے، جو خفیف سا فرق مصرعۂ ثانی میں باعتبار معنی پایا جاتا ہے، بحر کی پابندی اور ترجمے کی قید سے لازمی تھا۔

مثنوی بدماوت میں عبرت کا ایک شعر ہے ؎

نزاکت سے شکم میں بچہ اُس کا — نظر آوے تھا جوں مینا میں صہبا

مرزا نے اس مضمون کو لے کر فارسی میں اس طرح باندھا ہے ؎

چوں صورتِ آئینہ ز افراطِ لطافت — آید بنظر بچۂ او از شکم او

عُرفی شیرازی فرماتے ہیں ؎

کے لازم است بادہ کشیدن ز جامِ زر — مقصود تو گر اینست قصورِ سفال چیست

مرزا کا شعر ہے ؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

مرزا کا یہ شعر مشہور ہے اور عرفی کے شعر کے مقابلے میں زوردار بھی ہے، لیکن مضمون اس میں بھی ان کا نہیں ہے۔

فسونی تبریزی کا شعر ہے ؎

با وجو میرسم آسودہ می شوم از دور — ندیدہ حال مرا وقتِ بیقراری حیف

مرزا کا شعر ملاحظہ ہو ؎

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یہ شعر مرزا کے بلکہ اُردو زبان کے بہترین اشعار میں سے سمجھا جاتا ہے اور فی الواقع ہے بھی خوب، لیکن اس میں بھی سوائے زبان اور بندش کے مرزا کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

حسن بیگ رفیع کا ایک شعر سنیئے ؎

خوش دلم زیں کہ با و نامہ نویسم شب و روز — مقصدم نیست کہ مکتوب رسد یا نرسد

مرزا ہو بہو اُردو میں کہتے ہیں ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو — ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

مضمون یکساں ہے اور طرزِ بیان میں بھی کوئی خاص فرق نہیں۔

عرفی شیرازی کا ایک اور شعر ہے ؎

بیار بادہ کہ جانم دمے ز نالہ برآید — ہزار زمزمہ از دل بیک پیالہ برآید

مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر کا ماخذ عرفی کا یہی شعر ہے ؎

پھر دیکھیے انداز گل افشانیِ گفتار　　رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

عاقل خاں رازی کہتے ہیں ؎

نہ مرا کرد رقیب از سرِ کوئے تو جدا　　اول ایں حادثہ بر آدم و حوا بگذشت

مرزا کا مشہور شعر ہے ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن　　بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہ شعر بھی قریب قریب فارسی شعر کا ترجمہ ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ مرزا کے شعر میں اندازِ بیان نے جان ڈال دی ہے۔

متاخرین ایران میں سے کسی کا شعر ہے ؎

مشاطہ را بگو کہ براسبابِ حسنِ دوست　　چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر اسی مطلب کو برنگِ دیگر ادا کرتا ہے ؎

زمانہ عہد میں اُسکے ہے محوِ آرایش　　بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ممنون کہتے ہیں ؎

تفاوت قامتِ یار اور قیامت میں ہے کیا ممنون　　وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

مرزا نے یہی مضمون اپنے کلام میں اس طرح داخل کیا ہے ؎

ترے سروِ قامت سے اِک قدِ آدم　　قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

ذوق کا ایک نہایت مشہور شعر جس کی مرزا بھی خود بڑی تعریف کیا کرتے تھے، یہ ہے۔ ؎

اب توگھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائینگے　　مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مرزا نے اپنے الفاظ میں اسی خیال کو جامہ پہنانے کی یوں کوشش کی ہے ؎

ہائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا　　لیگیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

گفتم بگو نہ کُشی و زندہ میکنی　　از یک نگاہ کُشت و نگاہِ دگر نہ کرد

مرزا یہی مضمون یوں باندھتے ہیں ؎

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ　　کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

فیضی کہتے ہیں ؎

نوشدارو ئے محبت را مپرس اجزا کہ چیست　　　　سودۂ الماس در زہر ہلاہل میکنند

مرزا ہو بہو اُردو میں اسی کا ترجمہ یوں پیش کرتے ہیں ؎

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا　　　　کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

شرف قزوینی کا شعر دیکھئے ؎

ہست صد منت بجاں از غیبت بد گو مرا　　　　چوں بایں تقریب من آرد بیاد او مرا

مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر کا ماخذ یہی فارسی شعر ہے، جو مقابلتہً زیادہ واضح ہے ؎

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ　　　　ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے[51]

ایک فارسی شاعر کہتا ہے ؎

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود　　　　خوش بود گردانہ نبود دام را

مرزا کا یہ شعر اسی فارسی شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

مرزا کے فارسی کلام میں بھی اس قسم کے بہت سے اشعار پائے جاتے ہیں جن کا تذکرہ بطورِ خود ایک علیحدہ مضمون چاہتا ہے۔ ہم اس سلسلہ کو یہاں بخوفِ طوالت قلم انداز کرتے ہیں، صرف نمونے کے طور پر ایک دو شعر نذرِ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

حافظ شیرازی کا شعر ہے ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل　　　　کجا دانند حالِ ما سبکبارانِ ساحلہا

مرزا کا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز　　　　گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتہ است

مرزا کے مصرعۂ ثانی میں بجائے اس کے کہ سبکبارانِ ساحل کو حال معلوم نہیں انھیں مشکلات اور سختیوں کا بیان پایا جاتا ہے جن کا ذکر دونوں شاعروں کے مصرعۂ اول میں موجود ہے۔

خواجہ حافظ کے اور دو شعر مختلف بحروں میں ملاحظہ فرمائیے ؎

حلاج بر سر دار ایں نکتہ خوش سراید　　　　از شافعی مپرسید امثال ایں مسائل

رازِ درون پردہ ز رندانِ مست پرس　　　　کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را

---

[51] مرزا نے اسی مضمون کو دوسرے رخ سے بھی کہا ہے ؎

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں　　　　غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں　　(زمانہ)

مرزا نے انہی دو شعروں کے مضمون کو ایک کر کے دوسرے لباس میں اس طرح جلوہ گر کیا ہو ے

آں رازکہ در سینہ نہان است نہ وعظ است　　　　بردار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

اس میں کلام نہیں کہ مرزا نے یہ شعر اختصار اور خوبی کے ساتھ بہتر الفاظ میں لکھا ہے، ناظرین خود اس فرق کو محسوس کر سکتے ہیں۔

رہا یہ کہ مرزا کے کلام سے کن شاعروں نے خیالات اور مضامین اخذ کئے ہیں اس کے متعلق اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ ان کی تعداد بے انتہا ہے، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک کے وہ تمام شاعر جو شاعری میں نام پیدا کر گئے اور خاصکر غزل گوئی میں شہرہ آفاق ہوئے کم و بیش مرزا سے استفادہ کرنے میں بے نیاز نہیں رہے اور بلا واسطہ و باواسطہ مستفیض ہوئے۔ اگر ان تمام اشعار کا ذکر کیا جائے تو یقیناً ہمارا مضمون ایک ضخیم کتاب کی صورت اختیار کرے گا۔ لہٰذا ہم نمونے کے طور پر فقط انہی چند شعراء کا حوالہ دیں گے جن کے اشعار ہماری یادداشت میں محفوظ ہیں۔

مرزا کا مشہور شعر ہے ے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے　　　　تمہیں بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نثار علی خاں نثار مرزا کا یہ شعر تقریباً لفظ بہ لفظ یوں چرا لیتے ہیں ے

مجھ سے کہتے ہیں وہ کہ تو کیا ہے　　　　کوئی پوچھے یہ گفتگو کیا ہے

سرقۂ ظاہر کی اس سے بڑھکر اور کونسی دلیل ہو سکتی ہے؟

مرزا ے

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق　　　　پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

مومن خاں مومن کے مندرجۂ ذیل شعر کا ماخذ مرزا کا یہی شعر ہے[1] ے

کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے　　　　کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

مرزا ے

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی　　　　ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

مولانا حسرت موہانی نے اس سے ایک باریک اور عمدہ مضمون پیدا کیا ہے ے

چھپے ہو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی　　　　وہ چاہتے تھے: دیکھے کوئی ادا میری

آرشد دہلوی کا مندرجۂ ذیل شعر بھی مرزا کے اسی شعر سے ماخوذ ہے ے

---

[1] دونوں معاصر تھے اس لئے سرقہ و اخذ کے بجائے توارد کا محل ہے۔ (زمانہ)

حسن اُن کا تابِ سوزِ نگہ اپنی ناتواں ۔۔۔ وہ بے حجابیوں پہ بھی ہیں سو حجاب میں

مرزاؔ: نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن ۔۔۔ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ارمانؔ دہلوی نے یہی مضمون یوں باندھا ہے ؎

نکالے کیا گئے ان کے مکاں سے ۔۔۔ زمیں پر گر پڑے ہم آسماں سے

مرزاؔ: وہ آیا انجمن میں بجز نہ کہیو یہ کہ غافل تھے ۔۔۔ شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمایش ہے

سالکؔ نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

وہ زیبِ شبستاں ہوا چاہتا ہے ۔۔۔ یہ مجمع پریشاں ہوا چاہتا ہے

مولانا حالیؔ نے بھی استاد کا یہ مضمون اپنے ایک شعر میں داخل کیا ہے ؎

دل چاہتا ہے بزمِ طرب میں انھیں مگر ۔۔۔ وہ انجمن میں آئے تو پھر انجمن کہاں

مرزاؔ: حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ ۔۔۔ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دے کہ سمجھائیں گے کیا

مولانا حالیؔ نے بالکل یہی مضمون دو شعروں میں باندھا ہے ؎

واعظ آتا ہے تو آنے دو اُسے ۔۔۔ پر مزا آنے کا یاں کیا پائے گا

آئے گا اور بکو اُٹھ جائیگا مفت ۔۔۔ اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا

مرزاؔ: قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے ۔۔۔ اسکی خطا نہیں تھی یہ میرا قصور تھا

عالیجاہ نظام آصف نے یہی مضمون اپنے شعر میں جلوہ گر کیا ہے ؎

ایلچی کو بھی کوئی قتل کیا کرتا ہے ۔۔۔ میں خطاوار تھا قاصد تو خطاوار نہ تھا

مرزاؔ: شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز ۔۔۔ ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

مولانا حسرت موہانی کا یہ شعر مرزا کے شعر سے کتنا مشابہ ہے ؎

شوق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے ۔۔۔ مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا

مرزاؔ: تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو ۔۔۔ دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

آٹھ نو سال کا عرصہ ہوا کہ لالہ سری رام ایم۔اے دہلوی مرحوم مؤلف "خمخانۂ جاوید" بغرض سیر و تفریح کشمیر تشریف لائے تھے اِس تقریب میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا، منجملہ دیگر شعرا کے منشی سراج الدین احمد خاں صاحب نے ایک غیر طرحی غزل پڑھکر سنائی، اس کا ایک شعر جس کی حاضرین جلسہ نے داد دی تھی مرزا کے اسی شعر کا چربہ ہے ؎

دکھائی ایسی ہمدردی کہ بے کھٹکے رقیبوں نے ۔۔۔ سنا دی داستاں اپنی سمجھ کر رازداں مجھکو

مرزاؔ غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی — کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

منور خاں غافلؔ نے یہی خیال یوں ظاہر کیا ہے ؎

گرم بازاریِ الفت ہے مجھی سے ورنہ — کوئی لینے کا نہیں نامِ وفا میرے بعد

مرزاؔ مجھ تک کب اُنکی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اخبار "شاعر" آگرہ مورخہ یکم جنوری ۱۹۳۱ء میں لالہ گوپرن لال صاحب نامی کی ایک طرحی غزل نظر سے گزری جس کا یہ شعر مرزا کے شعر سے ماخوذ ہے ؎

کچھ بے طرح سے آج تو لطفِ خمار ہے — ساقی نے جانے کیا ہے ملایا شراب میں

مرزاؔ ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

اکبر الہ آبادی کے مندرجۂ ذیل شعر میں اسی شعر کی جھلک پائی جاتی ہے اگرچہ دونوں کے مفہوم میں فرق ہے ؎

میرے سکوت سے مجھے ناداں نہ جانیئے — الفاظ کی کمی ہے خیالات کی نہیں

مرزاؔ اے پرتوِ خورشید جہاں تاب ادھر بھی — سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

حالیؔ اسی مضمون کو لیکر اپنی نظم موسوم بہ "عرضِ حال بجناب رسول صلعم" میں ذرا سی تبدیلی کے ساتھ یوں لکھتے ہیں ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے — اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

مرزاؔ پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا — اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

ڈاکٹر اقبالؔ کی قابلِ قدر نظم "نوائے غم" کا پہلا شعر مرزا کے اسی شعر کا مولود ہے بلکہ ساری نظم کا محرک یہی شعر کہا جا سکتا ہے ؎

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش — جسکے ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش

مرزاؔ غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے — غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

حالیؔ نے یہ مضمون مرزا سے لیا ہے، اور کسی قدر پہلو بدل کر یوں بیان کیا ہے ؎

دل نہ طاعت میں لگا تب تو لگایا غمِ عشق — کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا

مرزاؔ ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود — قد کے جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن میں نہیں

مومنؔ نے اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے ؎

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو — ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اُٹھا جائے ہے

آرشند دہلوی نے بھی یہی مضمون اس طرح ادا کیا ہے ؎

ضعف میں مرنا بھی مشکل ہو گیا — جان اُلجھی ہے نفس کے تار سے

ماتم مضمون ہذا کا ایک شعر ہے ؎

خواہش سجدہ ہے سنگِ آستانِ یار پر — پھوڑنا سر کا ہے گویا نقش پیشانی مجھے

اپنے استاد نامدار قبلہ علامۂ کیفی دہلوی کے سمجھانے سے ہمیں یہ ماننا پڑا کہ یہ شعر مرزا کے منہ، جو ذیل شعر سے لڑ گیا ہے، بلکہ یہ کہ یہی مضمون شعر کہتے وقت غالباً ہمارے ذہن میں جاگیر تھا ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

ہمارا ایک اور شعر ہے ؎

ہے اضطراب شوق نقابِ رُخ امید — تا بنگاہ پردۂ مژگاں سے کم نہیں

اپنے ایک سخن فہم دوست نے ہمیں مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ ہمارے شعر کا مضمون دراصل مرزا کا ہے ہمارا نہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں ؎

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن — غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

مرزا ؎ ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب — رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

امیر مینائی نے مرزا کے اس مضمون کو اپنے رنگ میں اس طرح رنگا ہے کہ سطحی نظر سے کام لینے والے احباب اس کو امیر کا ہی مضمون سمجھیں گے ؎

دل آپ کا کہ دل میں جو کچھ ہے سب آپ کا — دل لیجیے مگر مرے ارماں نکال کے

یہ شعر واقعی مرزا کے شعر سے بدرجہا بہتر ہے۔

مرزا ؎ وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے — تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

حالی یہی خیال دوسری صورت میں یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

شب وعدہ ہے بار عام ان کے در پر — مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

مرزا ؎ زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے — دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

اقبال نے مرزا سے یہ مضمون لیکر ذرا سی تبدیلی کر کے اسمیں جدت پیدا کی ہے ؎

ایسی ذلت ہے مرے واسطے عزت سے سوا — خود وہ اُٹھکر مجھے محفل سے اُٹھا دیتے ہیں

اب ہم ان اشعار کا ذکر کریں گے، جنہیں مرزا کے یہاں تکرار پائی جاتی ہے۔ اس نقص سے بھی غالباً کسی شاعر کا کلام مبرا نہیں، ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ بعضوں کے یہاں کم اور بعضوں کے

یہاں زیادہ ہے۔ اصطلاح شعرا میں اسے "تمغا" کہتے ہیں۔ محققین کے نزدیک اس کا کچھ مضائقہ نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تکرار سے مضمون میں بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے۔ مرزا کے کلام میں جو اشعار ایسے ہیں ملاحظہ ہوں ؂

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہ مضمون مرزا نے فارسی میں بھی باندھا ہے ؂

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت
میتواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

تا ہمارے کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

یہی مضمون دوسرے رنگ میں یوں جلوہ گر ہے ؂

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

یہی مضمون بالفاظِ دیگر ملاحظہ ہو ؂

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

یہی مضمون ذیل کے شعر میں ہو بہو اس طرح باندھا گیا ہے ؂

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اسکے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

یہی خیال اس شعر میں ظاہر کیا گیا ہے ؂

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

یہی مضمون معنی میں کسی قدر تخفیف کے ساتھ یوں لکھتے ہیں ؂

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

یہی خیال مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر سے مترشح ہوتا ہے ؂

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

اسی مضمون کو دوسرے شعر میں ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی — شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

یہی مضمون مرزا کے مندرجۂ ذیل چار اشعار میں پایا جاتا ہے ؎

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب — آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

اس آخری شعر میں کسی قدر وسعتِ معنی پیدا کر دی گئی ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اس کا مضمون مصرعۂ اول میں معنی کا پہلو بدل کر یوں ادا کیا گیا ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب — یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

ہو بہو یہی مضمون ذیل کے شعر میں دہرایا گیا ہے، بلکہ الفاظ میں بھی نمایاں فرق نہیں ؎

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے — خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں — ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

ذیل کا شعر بھی اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، البتہ اسکے معنی میں وسعت پیدا کی گئی ہے ؎

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو — شکوۂ جور سے سرگرمِ وفا ہوتا ہے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی — منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

اسی مضمون کو دوسرے شعر میں دیکھیے ؎

وہ پردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی — ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر — جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

یہی مضمون بصورتِ دیگر مکرر بندھ گیا ہے ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے — میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

قریب قریب یہی مضمون بہ رنگِ دیگر یوں پیش کیا گیا ہے ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

ذیل کی رباعی اسی مضمون کو دوبارہ پیش کرتی ہے ؎

مشکل ہے ز بس کلام میرا اے دل — سُن سُن کے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار — اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

یہی خیال ذیل کے شعر میں دوبارہ جلوہ گر ہوا ہے ؎

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے — مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

ہم بخوفِ طوالت اس مضمون کو یہیں ختم کرتے ہیں، لیکن معزز ناظرین سے یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مرزا کے وقت میں شاعری جس قسم کی تھی وہ ترجمے یا توارد سے بچ نہیں سکتی تھی[1] اس لئے اس مضمون کے لکھنے کی غرض غالب یا دوسرے شعراء پر نکتہ چینی نہیں ہے بلکہ عوام کی واقفیت کے لئے اسکو لکھا گیا ہے۔

---

[1] سرقہ و توارد کی بحث میں ہمارے کرم دوست حکیم [illegible] صاحب مکشوفی کا مضمون مطبوعہ زمانہ بابتہ مارچ ۱۹۳۱ء ملاحظہ فرمائیے۔ یہ مضمون اس بحث کے متعلق ایک فیصلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ (زمانہ)

(زمانہ جون ۱۹۳۱ء)

براؤننگ اور غالب

(از سید مقبول حسن احمد پوری بی۔ اے۔)

اشعار کا مطالعہ عموماً تفریح طبع کے لئے کیا جاتا ہے مگر طبائع کے میلان کا انحصار سوسائٹی پر ہے۔ اور سوسائٹی کی حالت کبھی یکساں نہیں رہتی کبھی وہ تمدن ہند کی صورت میں روحانیت کے ساتھ انہماک ظاہر کرتی ہے کبھی عقل یونان کی ہیئت میں تخئیل و تمثیل کا نتیجہ ہوتی ہے، کبھی تمدن اسلام کی برکت سے وہ حریت و اخوت کی علمبرداری کرتی ہے، کبھی مادیت سے ملوث ہو کر ہر چیز میں فائدے کا پہلو مدنظر ہوتا ہے۔ نوع انسان کے دماغ میں یہ باتیں نسلاً بعد نسل جاگزیں ہو کر تخئیل کا جزو لاینفک ہو جایا کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ دماغی تفریح پر انہیں باتوں کا اثر پڑنے لگتا ہے۔ مثلاً عہد حال میں تفریح میں بھی فائدہ حاصل کرنے کا خیال شامل ہو گیا ہے۔

سوسائٹی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو اُن قوموں سے متعلق ہے جن پر ابھی لفظ سوسائٹی کا اطلاق کم از کم اہل مغرب کے نقطۂ نظر سے نہیں ہو سکتا۔ ہم ہندوستانی بھی انہیں اقوام کے زمرے میں شامل ہیں جو ابھی تک اُسی پرانے خدا کی خدائی کے قائل ہیں جس کو اہل مغرب نے آثار قدیمہ میں شمار کر کے صرف روایات تک محدود کر رکھا ہے۔ شکر ہے کہ ہماری سوسائٹی نے اس معاملہ میں بہت زیادہ ترقی نہیں کی۔ اسی لئے اگر ہم کو خدا کی بنائی ہوئی چیزوں میں کوئی خاص شان نظر آتی ہے تو ہمارا خیال فوراً صانع حقیقی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

غرض ہماری تفریح طبع یا تو حقیقت پر مبنی ہے یا ایسے مجاز پر جو حقیقت نما ہوتا ہے چنانچہ ہماری شاعری میں بھی یا تو اسرار و معارف ہیں یا گل و بلبل اور خط و خال سے متعلق خیالات، لیکن یہ بھی اسرار حقیقی سے الگ نہیں ہیں، مثال کے طور پر یہاں خسرو کی ایک غزل کے چند اشعار کافی ہوں گے ؎

اے ز خیالِ ما بروں در تو خیال کے رسد　　یا صفتِ تو عقل را لافِ کمال کے رسد

کنگرِ کبریائے تو ہست فراز لامکاں　　طائرِ ماورانِ ہوا بے پر و بال کے رسد

بر درِ بے نیازیت صد چو حسینِ کربلا　　تشنہ بماند در گذر تا بہ زلال کے رسد

ہست بہ تختگاہِ دل جلوۂ تو بروز و شب　　لیک بجلوۂ چناں چشمِ خیال کے رسد

آیت رحمت از حرم بست برلب حاجیاں　　　خسرو بت پرست را جز خط و خال کے رسد

ان دو شاعرانہ پہلوؤں کے علاوہ ابھی تک فلسفہ اور افادیت کے خیالات صرف چند شعرا کے کلام تک محدود رہے، مثلاً ایران میں نظیری اور سعدی اور ہندوستان میں غالب و حالی اس سلسلہ میں راقم الحروف کی رائے میں تو یہی ہے کہ غالب کا مقابلہ شعرائے مغرب میں ابھی تک کوئی نہیں کرسکا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ غالب شعرائے مغرب سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔ انگریزی شاعر براؤننگ کے خیالات غالب سے ملتے جلتے ہیں مگر بعض جگہ غالب براؤننگ سے آگے نکل گئے ہیں تاہم براؤننگ کو انگلستان کا غالب کہنا نامناسب نہ ہوگا۔

یہاں پر بیجا نہ ہوگا اگر براؤننگ کی چند ایسی خصوصیات پر نظر ڈالی جائے جو غالب سے ملتی جلتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر "برڈو" صاحب جو لوگ براؤننگ کے کلام کا مطالعہ محض تفریح طبع کیلئے کرتے ہیں انکو عموماً خوشی ہوتی ہے کیونکہ براؤننگ کے اشعار اس شخص کو کبھی بھلے نہ معلوم ہونگے جو دماغ پر زور دینے کے خوگر نہیں۔ مگر براؤننگ سے وہ شخص ضرور مستفید ہو سکتا ہے جو ان کے کلام کو ایک بار تفریحاً پڑھے اور دوسری مرتبہ استفادہ حاصل کرنے کے لئے غور سے پڑھے۔ پھر تیسری مرتبہ اس کو عقل و بصیرت حاصل کرنے کے لئے دیکھے، چوتھی بار پڑھنے پر ہر شخص براؤننگ کا ہم خیال و معتقد ہو جائے گا۔ غالب کے کلام کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ڈاکٹر "برڈو" نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جو طالب علم براؤننگ کا بغور مطالعہ کرے گا وہ اپنی محنت سے ہزار چند فائدہ اٹھائیگا۔

غرض اہل مغرب کے خیال کے مطابق براؤننگ کا کلام تخیل انسانی و دقیق مسائل سے لبریز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی شاعری سے وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو اپنے تخیل کی ترتیب پر قادر ہونے کے علاوہ اس کو عملی جامہ پہنانے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ براؤننگ کی تلقین یہ ہے کہ پہلے آنکھیں کھول کر غور سے دیکھو اس کے بعد زبان کھولو۔ شاید اسی فلسفیانہ نصیحت سے متاثر ہو کر ڈاکٹر فرنوال نے براؤننگ کی بابت کہا ہے کہ وہ ایک جوانمرد، بہادر، زندہ دل اور عمیق خیالات رکھنے والا شاعر ہے جس کے کلام کا مطالعہ ہر صاحب فہم و بصیرت کے لئے ضروری ہے۔

غالب کی طرح براؤننگ نے اپنے زمانہ کی سوسائٹی کو خوش کرنے کا خیال کبھی نہیں کیا، اس کا مسلک تھا کہ زمانۂ ماضی کو بھلا دینا چاہیئے اور حال کی پیچیدگیوں سے بھی بالاتر رہنا چاہیئے لیکن آئندہ کا خیال ضروری ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"ہماری کیا حالت ہوگی، ہمارا مذہب، ہمارا اخلاق، ہماری تصانیف، ہمارے بچوں کی تعلیم اور ہمارے قوانین ہمیں کس طرف لئے جا رہے ہیں اور اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ یہ فکر ہمارے لئے ضروری ہے"

اس مسلک کو براؤننگ نے اپنی شاعری میں خاص طور پر مدنظر رکھا ہے، چنانچہ اپنی مشہور نظم "گرامرینس فونیرل"

میں لکھتا ہے :-

"کم ظرف آدمی جو کچھ تھوڑا بہت کرنا چاہتا ہے کر دکھاتا ہے، عالی ظرف آدمی کی بڑی تمنائیں ہوتی ہیں مگر وہ ان کے پورا ہونے سے پہلے ہی مرجاتا ہے۔ معمولی آدمی ایک ایک کرکے جوڑتا رہتا ہے اور اس کے سَو بہت جلد ہو جاتے ہیں۔ لیکن بلند حوصلہ آدمی کے لئے جو ایک کروڑ پتی بننے کی آرزو رکھتا ہے۔ اکائی کی کمی رہ جانا تعجب کی بات نہیں۔"

غالب نے اس شرح و بسط کے ساتھ کبھی اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا ہے، وہ اسی بات کو رمزی رنگ میں مجمل طور پر اس طرح بیان کرتے ہیں :-

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا　　حباب موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

اسی مطلب کو مصرعۂ ذیل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے

"وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے"

براؤننگ نے ارتقاے روحانی کے حدود پر بہت کچھ خیال آرائی کی ہے۔ غالب اُس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ کہتے ہیں

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہاے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

براؤننگ کہتا ہے "شکوک سے دل کو خوشی حاصل ہونی چاہیئے، کیونکہ ان سے تلاش و تجسس کا ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے" اسی اعتبار سے ہر حجاب پردۂ ساز ہے کیونکہ حجاب ہی ذریعۂ انکشاف اور حجاب ہی سعی و کوشش کا باعث ہے۔ اس خیال کی مزید تشریح براؤننگ نے اپنی نظم "ربی بن عذرا" میں اس طرح کی ہے :-

"میں جو ہونا چاہتا تھا　　اور نہ ہو سکا　　(یہی) میرے اطمینان کا باعث ہے"

لیکن اس سے مطلب یہ نہیں کہ سعی کو چھوڑ دیا جائے۔ غالب کا شعر ہے ؎

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز　　ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا

کیونکہ اگر وہ گرہ کٹھن ہے تو اس کے کھولنے میں کوشش بلیغ کے علاوہ غیر معمولی قوت ارادی بھی درکار ہوگی، بالفاظ دیگر جتنا گہرا حجاب ہوگا اتنا ہی زیادہ انکشاف کا ذوق ہوگا۔ مگر اولوالعزمی کا تقاضا یہی ہے کہ کسی کام کو ادھورا نہ چھوڑا جائے "گرہِ نیم باز" کا قرض ادا ہو جانا چاہیئے "ناخن کو خواہ مخواہ قرضدار نہ رکھنا چاہیئے، کیونکہ "کام گر رک گیا روا نہ ہوا" اس لئے براؤننگ کے "گریمرین" نے مرتے دم تک قواعد صرف و نحو حل کئے کہ یہاں جو ہو سکے ہو: باقی جو کچھ رہ جائے گا دوسری زندگی میں ہو گا۔ غالب بھی انھیں

خیالات سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں:-

بقدر ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی ۔۔۔ جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی ۔۔۔ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

دنیوی حجابات کو براؤننگ (Limitations) کہتا ہے جن کے دُور کرنے کی براؤننگ یہ دلچسپ ترکیب بتاتا ہے کہ وقت کا پہیا گھومے یا رک جائے مگر خیالات کو کبھی محدود نہ ہونے دو۔ کمہار (خالق) اور مٹی (مخلوق) پر وقت کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔" (ربی بن عذرا) نیز یہ کہ "دماغی توہمات کا (جو تخئیل کی تکمیل میں سدراہ ہوتے ہیں) بہادری سے مقابلہ کر کے ان کو شکست دو (کیونکہ زندگی کا وہ حصہ جسکے لئے یہ (یعنی موجودہ حصہ) بنا ہے ابھی آنے کو ہے۔ خدا نے تو ہمیں مکمل بنایا ہے اور ہماری موجودہ ہستی، ہماری زندگی کا صرف ایک ادنیٰ جزو ہے۔ بقول میر تقی

"یعنی آگے چلیں گے دم لیکر"

تکمیل کی آرزو کو مستحکم کرنے اور آگے چلنے کے لئے تیار رہنے کے متعلق غالب کا خیال ہے کہ

"دیتے ہیں ظرفِ بادہ قدح خوار دیکھ کر"

اس پر بھی وہ یہی کہے جاتا ہے کہ

"حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا"

ہر نوع براؤننگ کو ایک قسم کا اطمینان ہے، غالب میں بجائے اطمینان کے عزم زیادہ ہے۔ براؤننگ کے پیام کا انحصار زیادہ تر اس عقیدے پر ہے کہ دنیا کی ناکامیاں اور مختلف قسم کے شکوک ہی کامیابی اور اطمینان کی دلیل ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "میں تو شکوک کی قدر کرتا ہوں کیونکہ یہ انسانیت کا خاصہ ہیں۔ جانور شکوک سے متاثر نہیں ہوتے کیونکہ وہ راکھ کا ڈھیر ہیں جس میں کوئی چنگاری نہیں۔"

مسئلہ ارتقا کے متعلق براؤننگ کی نظمیں حضرت مولانا روم کے خیالات سے ملتی ہیں، مولانا فرماتے ہیں

تو ازاں روز یکہ از ہست آمدی ۔۔۔ آتشی یا خاک یا بادی بُدی

گر بداں حالت ترا بودے بقا ۔۔۔ کے رسیدے مر ترا ایں ارتقا

براؤننگ ایسی کوئی تشریح نہیں کرتا، وہ صرف اپنی حالت کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور خدا کا شکر کرتا ہے کہ:-

"(اے خدا) میں تیرے طریق عمل کو نہایت کامل سمجھتا ہوں، اور اس کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ میں انسان ہوں۔" ——— (ربی بن عذرا)

زمانہ ستمبر ۱۹۳۲ء

کلیم اور سلیم

(دونوں شراب کے نشے میں)

غالب کے ایک شعر کے متعلق

(از میر ولی اللہ صاحب بی۔ اے ایل ایل۔ بی ایڈووکیٹ پنجاب)

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟

کلیم اور سلیم دونوں ایک ہی شہر بلکہ ایک ہی محلہ کے رہنے والے' اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت بھی بعید۔ لیکن افیونی اس درجہ کے ہیں۔ کہ کئی کئی مہینے اور بعض دفعہ پورے سال بھر ایک دوسرے کو دیکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ کہاں گذشتہ جنوری کا نصف اور کہاں اب ستمبر کا خاتمہ۔ پھر بھی غنیمت ہے۔ کبھی تو مل بیٹھتے ہیں۔ کل رات دونوں دوست مدت کے بعد ملے۔ سلیم نے کھانا بھی کلیم کے ساتھ کھایا اور کھانا کھاتے کھاتے حسب معمول کچھ کچھ پیتے بھی گئے۔ جب بقول شخصے دونوں "آؤٹ" ہونے کے قریب ہوئے تو اثنائے گفتگو میں ادبیات پر اتر آئے۔ ملاحظہ ہو۔

سلیم: بھائی کلیم! آپ کو معلوم ہے آجکل مرزا غالب کے متعلق عجب لے دے ہو رہی ہے۔

کلیم: بندہ پرور! اس بیچارے کو دنیا چھوڑے مدتیں ہو گئیں۔ یقیناً وہ اپنی زندگی ہی میں اپنے لینے دینے کا تصفیہ کر گیا ہوگا۔ اور اگر کچھ باقی بھی رہا ہوگا تو اب عرصے سے زائد المیعاد ہو چکا ہوگا۔ آجکل پھر یہ لے دے کیسے شروع ہوئی۔

سلیم۔ آپ تو ہر وقت آسمان پر ہوتے ہیں اور اس وقت بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور عرشِ معلیٰ پر ہیں۔

کلیم: اور آپ بھی کرسی سے نیچے نہیں معلوم ہوتے۔ عرش معلیٰ کے ذکر کا یہاں کونسا مقام تھا۔

سلیم: مقام یہ تھا کہ میں نے سیدھی سادی بات کی اور آپ نے تمسخر اُڑانا شروع کر دیا۔ میں نے فقط یہ عرض کیا تھا کہ غالب کے ایک شعر پر آجکل اُردو رسالوں میں عجیب بحث مباحثہ شروع ہو گیا ہے۔

کلیم: یہ بحث و مباحثہ آج شروع نہیں ہوا۔ غالب کے ہر ایک شعر پر اس شعر کے کہے جانے کی تاریخ سے

بچ تک مباحثہ جاری رہا ہے۔ بیچارا زندگی میں بھی ان باتوں سے تنگ تھا۔ اب قبر میں بھی غالباً آرام سے نہ سوتا ہوگا۔ ان نقاد حضرات سے کون کہے کہ اُس مرحوم کا پیچھا چھوڑ دو، دنیا میں اور بھی بہت کام ہیں۔ ہاں یہ تو فرمائیے وہ شعر کونسا ہے؟

تسلیم: آپ اُردو کے رسالے نہیں خریدتے ہیں؟

کلیم: خریدتا ہوں، لیکن پڑھتا نہیں، اور یہ اسٹل کالج میگزین یا اور ایک آدھ رسالہ اگر کہیں پڑھ لیا تو پڑھ لیا ورنہ خیر ما و خیر شما۔

تسلیم: اگر پڑھتے نہیں تو منگواتے کیوں ہو؟

کلیم: اس لئے کہ ادبیات کے رطب و یابس پر روپیہ ضائع کرنے کی عادت ہے وقت ضائع کرنے کی عادت نہیں۔

تسلیم: اچھا خوب! وہ شعر یہ ہے:-

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟

کلیم: اس (کیا ہے) کا خدا بھلا کرے، شعر کو بالکل اُردو بنادیا ہے۔ کیا اور ہے دونوں اُردو لفظ ہیں۔

تسلیم: آپ کو معلوم نہیں غالب کے بعض اُردو شعروں میں صرف ایک لفظ اُردو کا ہوتا ہے باقی سب فارسی۔ یہاں تو دو لفظ اُردو کے ہیں۔

کلیم: غنیمت ہے لیکن سچ پوچھو تو یہاں بھی خالص اُردو لفظ صرف ایک ہی ہے۔

تسلیم: خالص اُردو لفظ سے کیا مراد ہے، کیا اور ہے میں سے کونسا لفظ خاص اُردو کا نہیں ہے۔

کلیم: ہے خالص اُردو لفظ نہیں ہے، کیونکہ یہ اُردو اور فارسی دونوں میں مشترک ہے۔

تسلیم: ہے اُردو اور فارسی میں مشترک ہے؟

کلیم: بیشک مشترک، چنانچہ خواجہ حافظ فرماتے ہیں:-

ساقی اگرت ہوائے ماہے　　　جز بادہ میار درمیاں تے

تسلیم: (حیران ہوکر) تعجب ہے۔

کلیم: تعجب پر تعجب یہ کہ ہے۔ ہستید۔ ہستی۔ ہستید۔ ہیم اور ہستیم۔ پوری گردان بھی ہو سکتی ہے

تسلیم: مثلاً

کلیم: مثلاً یہ کہ مولانائے روم مے فرماید:

گفت یارب کہ ترا خاصاں ہستید　　　کہ مبارک دعوت و فرخ پے اند

تسلیم: بجے تو خیر، یہ ہے، ہبنبہ، ہبی، ہبیہ، تبیم اور ہبیم عجیب طرفہ معجون ہے. لیکن ہم کدھر جا رہے تھے اور کدھر چل پڑے، میرا مطلب یہ تھا کہ غالب کے اس شعر کے عجیب عجیب معنے بتائے جا رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غالب کا یہ شعر شعر نہیں بلکہ چیستان ہے اور اس کی شرح کرنا محال ہے۔

کلیم: لاحول ولاقوۃ۔

تسلیم: الا باللہ العلی العظیم۔

کلیم: ہاں بے شک الا باللہ العلی العظیم، اس شعر میں کونسی چیستان والی بات ہے۔

تسلیم: بڑے بڑے عالم اور مبصر و نقاد تو اس شعر کو حل کرتے کرتے تھک گئے اور کچھ نہ سمجھ سکے۔ آپ کے سامنے یہ شعر بالکل صاف ہے۔ کیوں نہ ہو اس وقت آپ کے سامنے چودہ طبق روشن ہیں۔

کلیم: آپ ناحق ظلمات فوق ظلمات میں گرے جا رہے ہیں۔ چودہ طبق روشن ہونے کی ضرورت نہیں صرف یہ دو ہی طبق روشن ہوں تو شعر سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ہاں یہ تو کہو کہ یہ عالم فاضل مبصر اور نقاد کتنے گیا ہیں۔

تسلیم: کہتے یہ ہیں کہ خواجہ الطاف حسین حالی نے خود ایک دفعہ اس شعر کے معنی مرزا غالب سے پوچھے تھے۔

کلیم: پھر کیا اس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ شعر چیستان ہے۔

تسلیم: اور کیا اگر شعر مشکل نہ ہوتا تو حالی کیوں اس کے معنی پوچھتے۔

کلیم: اچھا مشکل سہی، یہ تو فرمائیے کہ مرزا غالب نے جواب کیا دیا؟

تسلیم: فرمایا کہ "سے" کی جگہ جز پڑھو معنی خود سمجھ میں آ جائیں گے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری جو ایک کف خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفس عنصری سے زیادہ نہیں۔ ان کے جگر سوختہ ہونے کا ثبوت ان کے چھکنے اور بولنے سے ہوتا ہے:

کلیم: واہ وا واہ! یہ صرف ایک فقرہ پورے تین آدمیوں کی تصنیف ہے۔

تسلیم: آپ پھر آسمان پر چڑھے جا رہے ہیں، میں نے یہ فقرہ یادگار غالب سے آپ کو سنایا ہے، اپنی طرف سے اس میں کچھ نہیں ملایا۔

کلیم: آپ نے کچھ نہ ملایا ہوگا، پھر بھی اس فقرے کی تصنیف میں کم از کم تین آدمی برابر کے حصہ دار ہیں: (۱) مرزا اسد اللہ خاں غالب (۲) خواجہ الطاف حسین حالی اور (۳) یادگار غالب کے لکھنے والے جناب کاتب صاحب قبلہ

تسلیم: کیا اس فقرے میں کوئی کتابت کی غلطی ہے۔ اور اس الزام کے لئے آپ کے پاس کیا دلائل ہیں

کلیم: دلائل جانے دیجئے، سند پیش کرتا ہوں۔ مولانا جامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:-

غلام خامہ آں کاتبم کہ شعر مرا ۔۔۔ چنانچہ بود نوشت و نہ ہرچہ خواست نوشت

اگرچہ شوخ ـــ دروغ از دروغ می گیرد　　　دروغ وراست درو ہرچہ بود راست نوشت

تسلیم: اچھا آپ فرمائیں تو سہی، کتابت کی غلطی اس عبارت میں کونسی ہے؟

کلیم: صرف اتنی کہ اصل نثر یوں تھا کہ "قمری جو ایک کف خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفس رنگ سے کم نہیں' ان کے جگر سوختہ ہونے کا ثبوت الخ

تسلیم: لیکن یہ دعویٰ دلیل کا محتاج ہے۔

کلیم: اگر قفس رنگ کی جگہ قفس عنصری بغیر دلیل کے لکھا جاسکتا ہے تو پھر میرے دعوے کو بغیر دلیل کے مان لینے میں کیا نقصان ہے۔ میرے خیال میں تمام تر فساد اس قفس عنصری کا ہے، تسلیم صاحب! کہئے، یادگار غالب کے اس نثر ے کو اس طرح پڑھنے کے بعد بھی شعر میں کچھ دقت باقی رہ جاتی ہے۔

تسلیم: ہاں یہ دقت باقی رہ جاتی ہے کہ "قمری جب محض ایک راکھ کا ڈھیر ہے۔ تو اس کے چہکنے اور بولنے میں وہ سوز نہیں ہوسکتا جس سے اس کے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت ملے۔ کیونکہ راکھ کا ڈھیر وہی ہے۔ جس میں ایک چنگاری بھی باقی نہ ہو۔ دوسرا سوال اس تعبیر کے متعلق یہ ہوسکتا ہے کہ آخر چہکنے اور بولنے کو اس قدر اہمیت کیوں دی گئی۔ کہ اس کے سوا کوئی نشان جگر سوختگی کا نہیں مانا گیا پہلے مصرعے میں صاف بتادیا ہے کہ قمری راکھ کا ڈھیر ہے، تو ظاہر ہے کہ راکھ کا ڈھیر جب ہی ہوئی جبکہ وہ پہلے شعلہ زن ہوئی، یعنی جگر سوختگی اور سوز کا نشان قمری کی شکل یعنی خاکستری رنگ میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ بہ نسبت اسکے چہکنے اور بولنے کے"

کلیم: میں اس ایجاد بندہ کی داد دیتا ہوں، لیکن آپ نے جو کچھ فرمایا وہ میری سمجھ سے بالاتر ہے، ہاں اتنا سمجھ سکا ہوں کہ راکھ کے ڈھیر سے آپ کو چنگاری کا خیال آیا' اور پھر چنگاری کو جگر سوختہ کی سوختن والی آگ سے جا ملایا' اور یہ بھی خوب کہا کہ چہکنے اور بولنے کو اس قدر اہمیت کیوں دی گئی۔ حالانکہ قمری کا خاکستری رنگ زیادہ اہمیت کا مستحق تھا، لیکن بلبل کے قفس رنگ یا بقول آپ کے قفس عنصری کا بھی کچھ حق اہمیت پر تھا، اس کا حق آپ کیوں کھا گئے

تسلیم: آپ میری ایجاد بندہ پر معترض ہیں، سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کی ایجاد بندہ کو سمجھ بھی نہیں سکا۔

کلیم: میں نے تو ابھی نہ کوئی ایجاد کی ہے اور نہ موجد ہونے کا مدعی ہوں۔

تسلیم: اچھا اس تو تو میں میں سے کچھ فائدہ نہیں۔ فرمائیے کیا آپ کی رائے میں اس شعر کا یہ مطلب درست ہے کہ "قمری جلکر راکھ کا ڈھیر ہوگئی ہے اور بلبل خاک سیاہ اور اُن کی شکل ہی گویا اُن کے عاشق ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن ہمارے جگر سوختہ ہونے کا ثبوت صرف ہماری نالہ کشی ہے"؟

کلیم: یہ معنی آپ نے کہاں سے نکالے؟

تسلیم: ایک رسالے میں پڑھے ہیں۔

کلیم: میں یہ نہیں پوچھتا کہ آپ نے یہ معنی کہاں پڑھے ہیں۔ یہ پوچھتا ہوں کہ کہاں سے نکالے ہیں، یہ معنی آپ کے ہوں یا کسی اور صاحب کے لیکن اتنا ضرور ہے کہ شعر کے الفاظ سے یہ معنی نہیں نکلتے۔

سلیم: اگر نہیں نکلتے تو لوگ کیوں نکالتے ہیں۔

کلیم: میں اس سوال کے جواب دینے کے نااہل ہونے کا سچے دل سے اعتراف کرتا ہوں۔

سلیم: میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا ان معنوں پر اعتراض کیا ہے۔ آپ کا خیال ہوگا کہ اگر ان معنوں کو صحیح مان لیا جائے تو گویا مرزا غالب اپنے مرتبۂ عشق کو بلبل و قمری کے عشق سے فروتر سمجھتے ہیں، لیکن آپ یہ کیوں فرض کر لیتے ہیں کہ اگر جگر سوختگی صرف نالہ کشی سے ظاہر ہوتی ہے تو وہ ادنیٰ درجہ کی ہے۔

کلیم: میں نے ان معنوں پر نہ کبھی یہ اعتراض کیا اور نہ کبھی کچھ فرض کیا، آپ ناحق میری طرف سے سوال پیدا کر کے جواب دینے کی زحمت گوارا فرماتے ہیں، میں نے تو صرف اتنا کہا ہے کہ یہ معنی شعر کے لفظوں سے نہیں نکلتے

سلیم: لیکن آپ نے کتابت کی غلطی نکال کر تو گویا بڑی تلوار مار لی۔ یہ نہ فرمایا کہ اے کی جگہ جز کیونکر پڑھا جا سکتا ہے۔ درحالیکہ اردو، فارسی، عربی، ترکی وغیرہ کسی زبان میں جو ادب اردو سے متعلق ہو کہیں اے کے معنی جز کے کسی لغت میں نہیں لکھے ہیں۔

کلیم: ممکن ہے جامع اللغات میں لکھے جائیں، کیونکہ اس قسم کے معنی اور کسی لغت میں نہیں مل سکتے

سلیم: آپ پھر بھٹکنے لگ گئے۔ یہ فرمائیے کہ حضرت غالب یا خواجہ الطاف حسین حالی کا کیا حق ہے کہ وہ ہمیں مجبور کر سکیں کہ ہم اے کے معنی جز مان لیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اے کو ندائیہ ہی مانا جائے۔

کلیم: حضرت غالب یا خواجہ حالی نے کب آپ کو مجبور کیا تھا کہ اے کے معنی جز مانیے۔

سلیم: پھر یہ کیوں فرمایا کہ اے کی جگہ جز پڑھو۔

کلیم: اگر کیا تو کون سا گناہ کیا، ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لگا کر معانی کو آسان تر کر کے بتا دیا۔ یہ تو نہیں کہا کہ کسی اردو فارسی عربی ترکی، انگریزی یا فرانسیسی لغت میں اے کے معنی جز لکھے ہیں

سلیم: اچھا اگر میں اس شعر کی اس طرح تعبیر کروں تو کیا درست نہ ہوگی کہ جگر سوختہ ہونے کی وجہ سے قمری جو سرو پر عاشق ہے اس کی یہ حالت ہوئی کہ نالہ و آہ کرتے کرتے وہ صرف ایک کفِ خاکستر رہ گئی ہے اور جو چیز خاک کی مٹھی بن جائے گویا وہ فنا فی اللہ ہو گئی، کوئی اس کا نشان باقی نہ رہا۔ یعنی قمری کا وجود تو جگر سوختہ ہونے کی وجہ سے تمام تر خاک ہو گیا یعنی کچھ بھی اثر نہ تار قائم نہ رہا۔ وہ صرف نالہ و آہ کرنے کا ایک آلہ رہ گئی، تو اس پر متعجب ہو کر مصنف پوچھتا ہے۔ اے کیا قمری کے سوختہ جگر کا نشان بس ایک نالہ ہی باقی ہے یعنی سخت افسوس یا از حد تعجب کا مقام ہے۔ اسی طرح بلبل بھی کوئی وجود نہیں رکھتی جیسے کہ روتے روتے کوئی

شخص آخر اس قدر کاہیدہ ہوجاتا ہے کہ اس کا کوئی وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ ہٰذا بلبل بھی محض رنگوں کی ایک پوٹ بنگئی ہے، تو اس پر تعجب اور حسرت کا اظہار کرنے کے لئے شاعر کہتا ہے۔ اے کیا نالہ ہی نشان جگر سوختہ ہے۔ یعنی بلبل وجود سے تو خالی ہوگئی اب وہ صرف رنگوں کا ایک مجموعہ ہے اور اس کے جگر سوختہ کی یادگار یہی نالہ باقی ہے۔ مراد اس شعر سے یہ ہوئی کہ عشاق آخر روتے روتے اور آہیں بھرتے بھرتے وجود سے خارج ہوجایا کرتے ہیں اور اُن کا کام محض نالہ کرنا ہی رہ جاتا ہے۔ اور شعر کو نثر میں اس طرح پڑھیے اے کیا نالہ ہی نشانِ جگر سوختہ ہے۔ جبکہ قمری کفِ خاکستر سے زیادہ نہیں اور بلبل محض قفس رنگ ہے۔

کلیم: سبحان ربی الاعلیٰ۔ وجود سے خالی ہونے اور فنا فی اللہ ہونے کی ایک ہی کہی۔ پہلے سنا کرتے تھے کہ تصوف از بہر شعر گفتن خوب است۔ اب معلوم ہوا کہ تصوف از بہر شرح گفتن ہم خوب است اور پھر آئے کو مصرعے کے شروع سے اور کیا کو مصرعے کے اخیر سے اٹھا اٹھا کر اے کیا بنا دینے میں تو آپ نے داد تحقیق دی کہ الاماں!

سلیم: اس میں الاماں کی بات کیا ہے "غالب نے اے کیا کا مرکب جا بجا کبھی حسرت اور کبھی استعجاب کے معنی میں اور بعض اشعار میں بھی اس طرح استعمال کیا ہے، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب — آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:-

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہوجائیے — بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہوجائیے

ان ہر دو اشعار میں اے کیا کہیں حسرت اور کہیں تعجب کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔

کلیم: میں کیا کہوں اگر غالب زندہ ہوتا تو آپ سے سمجھتا۔

سلیم: آپ ہر بات پر ہنسی اڑاتے ہیں اور اپنی رائے کو تمام دنیا کی رائے سے افضل قرار دیتے ہیں لیکن آپ کو یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ جس زمانے میں حالی نے مرزا غالب سے اس شعر کے معنی دریافت کئے تھے اس وقت نہ تو وہ مصنف یادگارِ غالب تھے نہ اپنے عہد کے ایک زبردست عالم اور مسلّم الثبوت استاد، بلکہ وہ غالب کے ایک شاگرد تھے، ممکن ہے مرزا نے کسی فوری تبدیل خیال کے زیر اثر ان سے کہدیا ہو کہ اے کی جگہ جز پڑھو۔

کلیم: ہاں بیشک اُس وقت حالی شاگرد تھے اور مرزا غالب ایک نو مشق شاعر۔ اے کو بیہودہ سمجھ کر جز لگا دیا۔

سلیم: میں نے مرزا غالب کے متعلق کچھ نہیں کہا، لیکن یہ بھی تو بتائیے کہ اصل شعر میں اے کیوں کر

اور کس اصول سے آئے بمعنی جز مستقل ہو سکتا ہے۔ اگر مرزا نے یوں کہا ہوتا کہ یہاں جز کی جگہ کسی نے غلطی سے لے لکھ دیا ہوگا تو معاملہ صاف تھا:

کلیم: غالب اگر آپ سے مشورہ کرتے تو ایسا ہی کرتے۔ لیکن اُس وقت آپ نہیں تھے اور اس وقت غالب نہیں ہے۔

سلیم: اور اگر آپ سے بھی مشورہ کرتے تو بلبل کو قفس رنگ نہ کہتے۔ غریب بلبل تو ایک مٹھی بھر کالے پروں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کے ہاں وہ بوقلمونی الوان کہاں جس سے ایک قفس رنگ تیار ہو سکے:

کلیم: آپ نے شاید بلبل نہیں دیکھی۔ اس میں مٹھی بھر صرف کالے پر ہی نہیں ہوتے۔ اور پھر آپ نے ایران کی بلبل تو غالباً خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔

سلیم: تو کیا ایران میں مور کو بلبل کہتے ہیں؟

کلیم: نہیں مور کو بلبل نہیں کہتے۔ لیکن ایران کی بلبل جو شاعروں کی بلبل ہے وہ کچھ اور چیز ہے اور ہندوستان کی بلبل کچھ اور۔

سلیم: کوئی سند؟

کلیم: سند کے لئے بہار عجم دیکھئے۔ وہ ہندوستانی ہمیدان لکھتا ہے کہ "بلبل مرغیست معروف کہ در ولایت مے باشد وآنکہ در ہندوستاں مے باشد مرغے دیگر است"

سلیم: اچھا تو میں اس شعر کی ایک اور طرز سے شرح کرتا ہوں۔ اس کے متعلق آپکا کیا خیال ہے؟

کلیم: فرمائیے۔

سلیم: "نالہ سے عشق مراد ہے۔ قمری بلبل اور جگر نالوں کے مختلف پیکر ہیں۔ قمری کو فارسی والے بالعموم کف خاکستر لکھتے ہیں۔ بلبل قفس رنگ یعنی بلبل مبتلائے عشق گل۔ رنگ سے رنگ گل مفہوم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے عشق قمری جو کفِ خاکستر ہے اور بلبل جس کو قفس رنگ کہنا چاہئے، سرو آزاد اور گل کے عشق میں مشہور ہیں، مگر ہمارا جگر جو رنگ خون بھی رکھتا تھا اور جس کو تو نے جلا کر خاکستر بھی کر دیا۔ اس کے محبوب و مطلوب کا کوئی نشان نہیں:

کلیم: سچ پوچھئے تو میں ہارا اور آپ جیتے۔ یہ نئے معنے تو آپ نے ایسے نکالے کہ قلم توڑ دیئے۔ افسوس کہ آج غالب موجود نہیں ورنہ عش عش کر اٹھتا۔ اور آپ کو گلے سے لگا لیتا۔ بھائی بتاؤ تو کیا یہ معنے بھی کسی رسالے میں دیکھے ہیں؟

سلیم: نہیں۔ ایک شرح دیوان غالب میں پڑھے ہیں۔

کلیم: شارح نے کمال کیا ہے۔ ان شرحوں سے خدا بچائے۔ قطعاً معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ معنی کیوں ہیں، کس لئے ہیں اور کس بنا پر ہیں جتنے معنی آپ نے پہلے بیان کئے یہ ان سب سے نمبرلے گئے۔ نالہ سے عشق مراد ہے، یہ کیوں؟ قمری بلبل اور جگرناؤں کے مختلف پیکر ہیں، وہ کیسے؟ رنگ سے رنگِ گل مفہوم ہے کون کہتا ہے؟ ہمارا جگر رنگ خوں بھی رکھتا تھا اور اسے تو نے جلاکر خاکستر بھی کر دیا۔ یہ کہاں سے معلوم ہوا! ہمارے جگر کے محبوب و مطلوب کا کوئی نشان نہیں، چہ خوب!

سلیم: آپ کی خود رائی بھی حد سے بڑھ گئی۔ کوئی معنی آپ کو پسند ہی نہیں آتے۔ یہ کیوں، وہ کیسے، کون کہتا ہے اور چہ خوب پر بات کو ٹال دیا۔ خیر آپ کی مرضی۔ لیکن اب اتنا تو آپ مان گئے ہونگے کہ یہ شعر چیستان ضرور ہے۔

کلیم: مجھے تو اس شعر میں چیستان والی کوئی بات نظر نہیں آتی۔

سلیم: اگر چیستان والی کوئی بات نہ تھی تو علامہ اقبال نے مرزا غالب سے اس شعر کے معنی کیوں پوچھے

کلیم: علامہ اقبال نے، مرزا غالب سے؟ اس شعر کے معنی پوچھے!

سلیم: ہاں! علامہ اقبال نے مرزا غالب سے اس شعر کے معنی پوچھے

کلیم: کب اور کہاں؟

سلیم: ابھی تھوڑا عرصہ ہوا۔ فلک مشتری پر۔

کلیم: البتہ، ابھی آپ مجھے کہہ رہے تھے کہ تم آسمان پر چڑھے جارہے ہو، اب آپ بھی فلک مشتری پر جا پہونچے۔ وہ آسمانی واردات سناؤ تو!

سلیم: وہ اس طرح ہے کہ علامہ اقبال نے مرزا غالب سے کہا:۔

اے ترا دادند دردِ جستجو　　　معنیِ یک شعرِ خود با من بگو

"قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ

اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ چیست

کلیم: لیجئے اُردو شعر فارسی شعر بن گیا۔ غالب نے کیا جواب دیا؟

سلیم: غالب نے کہا:۔

نالۂ کو خیزد از سوزِ جگر　　　ہر کجا تاثیرِ او دیدم دگر

قمری از تاثیرِ او واسوختہ　　　بلبل از وے رنگہا اندوختہ

اندرو مرگے بآغوشِ حیات　　　یک نفس اینجا حیات آنجا ممات

آنچناں رنگے کہ ازرنگی ازوست — آنچناں رنگے کہ بیرنگی ازوست
تو ندانی ایں مقام رنگ و بوست — قسمت ہر دل بقدر ہائے وہوست
یا برنگ آیا بہ بیرنگی گذر — تا نشانے یابی از سوزِ جگر

کلیم: بہت خوب! لیکن یقین جانیئے کہ علامہ اقبال نے مولانا حالی کے تتبع میں مرزا سے اس شعر کے معنی پوچھ لئے، ورنہ انھیں ضرورت نہ تھی۔

سلیم: نہ ہوگی۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ آخر اس شعر کے معنی ہیں کیا؟

کلیم: آپ کمال کرتے ہیں۔ معنی تو میں نے شروع میں ہی بتا دئے تھے۔ صاف بات ہے: شاعر کہتا ہے کہ قمری بھی عاشق ہے اور جگر سوختہ، بلبل بھی عاشق ہے اور جگر سوختہ، لیکن وہ ایک کفِ خاکستر یعنی محض بیرنگ چیز اور یہ قفس رنگ یعنی رنگا رنگ ہستے۔ گویا ان کی ظاہری شکل و شباہت میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ البتہ آہ و نالہ مشترک ہے۔ قمری بھی ہر وقت فریاد کرتی ہے اور بلبل بھی اس سے معلوم ہوا کہ عشق اور جگر سوختگی کا نشان آہ و نالہ ہے اور بس۔

سلیم: اگر یہی کچھ تھا تو اسے نالہ کی بجائے جز نالہ ہی کہہ دیا ہوتا۔

کلیم: آپ ہوتے تو اسی طرح کرتے، وہ مرزا غالب تھے۔ اگر جز نالہ کہتے تو شعر شعر نہ ہوتا۔ محض ارتھمیٹک ہوتی۔ یعنی دو اور دو چار، لے نالہ کہکر شعریت پیدا کرلی۔ نالہ ہی نشان جگر سوختہ ہے۔ اور نالے ہی سے پوچھ رہے ہیں کہ نشان جگر سوختہ کیا ہے۔

رات آدھی ہو چکی تھی، ساڑھے بارہ بج چکے تھے، سلیم نے آج پی بھی کچھ زیادہ لی تھی۔ اس لئے کلیم کا آخری فقرہ کچھ سنا اور کچھ نہ سنا۔ یہ کہکر اٹھ کھڑا ہوا۔ بھائی کلیم خدا حافظ! سچ کہتے ہو۔ وہی بات ہے ع — شعر میں کہتا ہوں سمجھے تم کرو



ادبیات[1]

مرزا غالب مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ

(از مولانا ابو الکلام آزاد دہلوی ایڈیٹر الہلال کلکتہ) (از الہلال)

مرزا غالب مرحوم کا سال وفات "آہ غالب بمرد" ہے یعنی ۱۲۸۵ ہجری۔

اس لحاظ سے فی الحقیقت ان کا شمار موجودہ عصر جدید کے عہد میں ہونا چاہیے۔ ہندوستان میں پریس سترھوین صدی عیسوی کے اواخر میں رائج ہو چکا تھا اور غدر سے پہلے خود دہلی میں حاجی قطب الدین وغیرہ تجار کتب نے بعض پریس قائم کر دیے تھے۔ پس ان کو اپنی تصنیف و تالیف کے لیے ابتدا ہی سے پریس موجود ملا اور اپنے حاصل عمر کو اشاعت و طباعت کے لیے غیروں پر مجبور کر دنیا سے مٹ جانے کی مصیبت سے دو چار ہونا نہ پڑا جو فی الحقیقت کسی صاحب کمال کے لیے زمانہ گذشتہ کی سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑا جانکاہ صدمہ رہا ہے

ان کی کلیات نظم و نثر اور مکاتیب و رسائل اردو و فارسی کی تمام کتابیں باستثنائے اردوئے معلے (جو ان کے انتقال کے بعد مرتب ہوئی) ان کی زندگی میں خود انہیں کی زیر نگرانی شائع ہو چکی تھیں۔ دیوان فارسی غالباً سب سے پہلے مطبع اودھ اخبار لکھنؤ (نولکشوری پریس) میں خود چھپوایا۔ اسی طرح پہلے مہر نیمروز، پھر مع دستنبو و مکاتیب فارسیہ باسم پنج آہنگ شامل کی۔ قاطع برہان، درفش کاویانی، نامۂ غالب، تیغ تیز وغیرہ دہلی میں چھپوائیں۔ دیوان اردو بھی غالباً پہلے مطبع اودھ اخبار میں اور پھر مکرر سہ کرر دہلی و لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانے میں جس قدر اردو کلام کہا گیا، وہ نئے ایڈیشنوں میں داخل نہیں ہوا۔ جو پہلا ایڈیشن غدر سے پہلے دہلی میں چھپا تھا، اسی کی نقلیں چھپتی رہیں۔ بخلاف کلیات نظم فارسی کے جس کا پہلا ایڈیشن اور موجودہ ایڈیشن دونوں میرے پاس موجود ہیں۔ مگر دونوں کے قصائد و غزلیات و قطعات وغیرہ کی تعداد میں بہت بڑا فرق ہے۔ پہلے ایڈیشن میں ملکہ وکٹوریہ کا قصیدہ ہے

خود روزگار انچہ درین روزگار یافت — دور روزگار ہا نتوانند شمار یافت

---

[1] اس نمبر سے ادبیات میں یہ ایک جدید عنوان قائم کیا جاتا ہے۔ ہم اس کے ذیل میں اپنے معزز معاصرین کے بہترین ادبی مضامین کا اقتباس یا خلاصہ ہدیہ ناظرین کرتے رہیں گے۔

اور ۳۳ وان قصیدہ سر اکلینڈ کاون والا۔

ہر کس شیوۂ خاصے در انیار است ارزانی

زمین مدح وزلارڈ ایلن برگنجینہ افشانی

اور لارڈ کیننگ کے دربار آگرہ اور عطائے خطابات کی تبریک۔

زسال نو دگر ایے بروے کار آمد

وغیرہ قصائد ہین۔ اسی طرح سر سالار جنگ اعظم کی مدح کا مشہور قصیدہ۔

شرط است کہ داستان نگویم

بھی نہین ہے کہ یہ غدر کے بعد لکھا گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کلیات نظم کے ہر اڈیشن مین نیا کلام شامل کر دیا جاتا تھا

مگر افسوس کہ اردو دیوان کی قسمت اس بارے مین نارسا رہی اور نیا کلام اسمین شامل نہین ہوا۔ اسکا ثبوت وہ متعدد غزلین قطعات، رباعیان، اور بعض اردو قصائد ہین جو بعض حضرات کے پاس قلمی موجود ہین اور مطبوعہ دیوان مین ان کا پتہ نہین۔

اس قسم کے غیر مطبوعہ کلام مین سے دو اردو رباعیات ہین جو مین نے اُس مطبوعہ نسخہ کے حاشیہ پر خود مرزا صاحب کے ہاتھ سے لکھی ہوئی دیکھی ہین، جو اُنھون نے خواجہ فخر الدین حسین دہلوی مصنف سروش سخن کو دیا تھا اور دو قصیدے اور دو قطعہ ایک قطعہ تاریخ، تین غزلین دیوان اردو کے اُس قلمی نسخہ مین ہین جو نواب سعید الدین احمد خانصاحب طالب رئیس دہلی کے پاس موجود ہے۔ (اس مرتبہ دہلی مین وہ نسخہ چند دنون تک میرے پاس رہا اور مین نے تمام غیر مطبوعہ کلام کی نقل لیلی اسکے لیے مین نواب صاحب موصوف کا شکر گذار ہون۔

ان نقلون مین اردو کا ایک مختصر قصیدہ آج ہدیہ ناظرین ہے یہ بالکل نئی چیز ہے۔ اور علاوہ غیر مطبوعہ ہونے کے اس سے مرزا مرحوم کے حالات و سوانح پر بھی مزید روشنی پڑتی ہے

(قصیدہ)

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام — فرمان روائے کشور پنجاب کو سلام

حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس — نواب مستطاب امیر شہ احتشام

ہم رتبہ مشکلات بہادر کہ وقت رزم — ترک فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لین حسام

جس بزم مین کہ ہو انھین آئینہ گستری
وان آسمان شیشہ ہے، آفتاب جام

قطعہ

چاہا تھا مین نے تم کو مہ چاردہ کہون
دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیال خام

دو رات مین تمام ہے ہنگامہ ماہ کا
حضرت کا عز و جاہ رہےگا علی الدوام

سچ ہے کہ تم آفتاب ہو، جس کے فروغ سے
دریائے نور ہے فلک آبگینہ فام

میری سنو کہ آج تم اس سرزمین پر
حق کے تفضلات سے ہو مرجع انام

اخبار لودھیانہ پہ میری نظر پڑی
تحریر ایک جس سے ہوا بند تلخ کام

ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
کاتب کی آستین ہے مگر تیغ بے نیام

وہ فرد جس مین نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آگئی ہے، کلیجہ لیا ہے تھام

سب صورتین بدل گئین، ناگاہ یک قلم
نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام

ستر برس کی عمر مین یہ داغ جانگداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام

تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھوین
استادہ ہو گئے لب دریا پہ جب خیام

اس بزم پر فروغ مین اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشست مین از روئے اہتمام

سمجھا اسے گر آب ہوا پاش پاش دل
دربار مین جو مجھ پہ چلی چشمک عوام

عزت پہ اہل نام کے ہستی کی ہے بنا
عزت بجا ن گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام

تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
اس ناز کا فلک نے لیا مجھ سے انتقام

آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
تھا بار کا وخاص مین خلقت کا ازدہام

اس کشمکش مین آپ کا مداح دردمند
آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام

جو وان نہ کر سکا وہ لکھا حضور کو
دین آپ میری داد کہ ہون فائز المرام

ملک و سپہ نہ ہو تو نہو، کچھ ضرر نہین
سلطان بر و بحر کا ہون مین غلام

وکٹوریا کا دہر مین جو مدح خوان ہو
شاہان عصر چاہیے لین عزت اس سے وام

خود بے تدارک اسکا گورنمنٹ کو ضرور
بے وجہ کیون ذلیل ہو، غالب سے جکا نام

امر جدید کا تو نہین ہے مجھے سوال
بارے قدیم قاعدہ کا چاہیے قیام

ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو
چاہین اگر حضور تو مشکل نہین یہ کام

دستور فن شعر یہی ہے قدیم سے
یعنی دعا پہ مدح کا کرتے ہین اختتام

ہے یہ دعا کہ زیرِ نگین آپ کے ہے　　اقلیم ہند و سندھ سے تا ملکِ روم و شام

اس قصیدے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے مین کوئی سرکاری دربار ۱۳ جنوری کو منعقد ہوا تھا۔ جسمین حسب معمول مرزا صاحب کو بھی مدعو کیا گیا۔ لیکن جب وہان پہونچے تو ان کی عزت قدیمانہ کے مطابق نشست و ترتیب کا کوئی انتظام نہ تھا۔ حتی کہ انھین نہایت ہی اونچے صف مین کرسی ملی یہ دیکھکر سخت متاسف ہوے۔ کہ قدیمی باتمین خواب خیال ہو گئی ہین۔

اُس بزم پُر فروغ مین اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشست مین ازروے اہتمام

"ازروے اہتمام" یعنے ازروے قاعدہ و ترتیب دربار جسمین یہ بہت پیچھے اور عام صفون بٹھائے گئے ہونگے۔

اِس حالت کو دوسرون نے بھی محسوس کیا اور اشارے ہونے لگے۔

دربار مین جو مجھپہ چلی چشمک عوام!

دربار کے بعد انھون نے چاہا کہ لفٹنٹ گورنر پنجاب سے ملین اور عرض حال کرین لیکن ریل کا وقت کم رہ گیا تھا۔ اور درباریون کا ہجوم بھی بہت تھا۔ ملاقات کا موقعہ نہ ملا۔

آیا تھا وقت ریل کے کھُلنے کا بھی قریب
تھا بارگاہ خاص مین خلقت کا اژدہام:
اِس کشمکش مین آپ کا مداح نامور:
درِ آقائے نامور سے نہ کچھ کرسکا کلام

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دربار دہلی کے علاوہ کسی دوسری جگہ ہوا ہوگا کیونکہ ریل کے وقت کا ذکر کرتے ہین آپ کا مداح نامور د مین پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سے خطاب ہے معلوم نہین آقاے نامور سے بھی خود ہی مراد ہین یا کوئی اور ہ مخاطب کے بعد اسطرح کے ضمیر نما وصف سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی دوسرا شخص ہوگا۔

اُس زمانے مین لدھیانہ سے کوئی اخبار نکلتا تھا۔ اسنے دربار کی روئداد چھاپتے ہوئے یہ تمام باتین لکھدین اسپر غضب ستم یہ کیا کہ ان کا نام اور لقب لکھنے مین کچھ ایسی غلطیان کردین جب دیکھکر ان کا رنج اور دوگنا ہوگیا۔

اخبار لودھیانہ مین میری نظر پڑی　　تحریر ایک جس سے ہوا ابدہ تلخ کام
ٹکڑے ہوا ہے دیکھکے تحریر کو جگر　　کاتب کی آستین ہے مگر تیغ بے نیام

وہ قمر جبین نام ہے میرا غلط لکھا ۔۔۔ جب یاد آگئی ہے کلیجا لیا ہے تھام!

معلوم ہوتا ہے کہ دربار میں انھیں معمولی خلعت بھی نہیں دیا گیا۔ اور اور نذر دینے والوں میں شمار کیے گئے۔

سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام

لیکن قصیدے سے ٹھیک معلوم نہیں ہوتا کہ کس زمانے کا یہ واقعہ ہے۔ اور کس دربار کا ذکر کر رہے ہیں۔ صرف اسقدر معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے بعد کا دربار ہے۔ کیونکہ لفٹنٹ گورنر پنجاب کی مدح کی ہے۔ نیز اسوقت اِن کی عمر ستر برس کی تھی۔ میرا خیال یہ ہے کہ شاید یہ قصیدہ غدر کے بعد کے اُس سہ سالہ عہد سے تعلق رکھتا ہے؛ جبکہ قیام دہلی، تعلق قلعہ، اور فتح کے بعد عدم حاضری کی وجہ سے اِن کا سرکاری وظیفہ بند ہو گیا تھا۔ اِن کی وفاداری مشتبہ سمجھی گئی تھی۔ اور بڑی ہی تکلف اور شدائد سے زندگی بسر کرتے تھے۔

مصائب غدر اور مرزا غالب

غدر میں مرزا گھر سے نہیں نکلے اور آخر تک بند رہے۔ مہاراجہ پٹیالہ کی سرکار سے سپاہی متعین ہو گئے تھے۔ جو غفران مآب حکیم محمود خان مرحوم اور مرزا غالب[1] دونوں کے مکان کی حفاظت کرتے تھے۔

غدر کی تمام بربادیاں اور اُس قلعۂ دہلی کی تمام خونریزیاں ایک ایک کر کے اِن کے آنکھوں کے سامنے گذریں۔ جو ہندوستان میں شش صد سالہ حکومت اسلامی کا آخری نقش قدم تھا۔ اور گو بہادر شاہ خود کچھ نہ تھا لیکن اِسکے بقاسے عظمت و جبروت اسلامی کی ایک بہت بڑی روح زندہ تھی۔ اُسکے مٹنے سے اکبر و شاہجہان کا گھر بے چراغ ہو گیا! اسکا مٹنا درحقیقت سلالۂ تیمور و آل بابر کا مٹنا تھا۔ معتصم عباسی خود کچھ نہ تھا لیکن جب فتنۂ تاتار میں بغداد کے محل لوٹے

---

[1] بلی ماروں میں حکیم صاحب کے مکان کے سامنے مسجد ہے بالکل اُس سے متصل مرزا مرحوم کا کوٹھا تھا جہاں غدر سے پیشتر آ رہے تھے۔ آجکل ہندوستانی دواخانہ جس مکان میں ہے، ٹھیک اسکے مقابل مرزا صاحب رہتے تھے میں جب کبھی وہاں سے گذرتا ہوں تو شوق و عقیدت کی ایک نظر ڈال لیتا ہوں اسی مسجد کے قریب کی نسبت کہا تھا۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے ۔۔۔ یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

گئے تو معتصم کی جگہ ہارون و مامون کی عظمت لٹ رہی تھی!

مرزا غالب نے عمر بھر بہادر شاہ کی لاحاصل مداحی کی تھی، اور وہ قصیدے جو عرفی اور نظیری کے قصائد سے مقابلہ کا دم رکھتے تھے، ایک ایسے مخاطب کے سامنے ضائع گئے تھے جسکے سر پر جہانگیر و شاہجہان کا تاج تو ضرور تھا۔ پر نہ تو عرفی و نظیری کی قدر شناسی کا ہاتھ تھا اور نہ کلیم کو زر خالص سے تلوا کر بخشش کرنے والا خزانہ تاہم وہ جو کچھ لکھتا تھا، اسکا مخاطب خود بہادر شاہ سے نہ ہوتا تھا۔ بلکہ اُس تخت اعظم کی روح صوت و عظمت اسکے سامنے ہوتی تھی جسپر بیٹھکر اکبر نے فیضی سے، جہانگیر نے عرفی و طالب سے، اور شاہجہان نے کلیم سے مدحیہ قصائد سنے تھے، اور جو اب بھی نوروز و عید کے دن زرد زرد دھوپ کی طرح جو غروب آفتاب سے کچھ پہلے اونچی دیواروں اور محرابوں پر دکھائی دیتی ہے۔ دیوان عام و خاص کے طلائی ستونوں کے نیچے چند لمحوں کے لیے نظر آجاتی تھی!

که با وجود خزان بوئے یاسمن باقیست

چنانچہ ان کے اکثر قصائد مدحیہ کی تشبیبوں میں اور علی الخصوص اس مدحیہ نثر میں جو مہر نیمروز کے دیباچہ میں حضرت بہادر شاہ کو مخاطب کر کے لکھی ہے۔ اس سوز دروں اور اُس آتش نہانی کی گرمی صاف محسوس ہوتی ہے جسکا شعلہ کاروان عظمت کے اس آخری مسافر کو دیکھکر بے اختیار اُن کے دلمیں بھڑک اُٹھتا تھا، اور جسکو وقت کی نزاکت، اور انگریزی حکومت کے ذریعہ وظیفہ حاصل کرنے کے تعلق نیز ایک حد تک طبیعت کی شاعرانہ خامی و وارفتگی نے غالب اگرچہ بظاہر پوشیدہ و افسردہ کر دیا تھا!

فتح دہلی کے بعد جو عالمگیر اور عدیم النظیر مصیبت اشراف و اعیان شہر پر نازل ہوئی۔ اور جس طرح شاہجہان آباد کی اُن سڑکوں پر جہاں کبھی صاحبقران اعظم کی سواری کے لیے جنگلے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ خون کے فوارے بہے، مرزا غالب نے دہلی میں رہ کر اسکے تمام مناظر خونیں اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اور اُن چیخوں کو اپنے کانوں سے سنا جو عرصہ تک دار الخلافہ کی گلیوں اور کوچوں سے بلند ہوتی رہی تھیں۔

علی الخصوص قلعہ معلی کی بربادیاں جن کے لیے تمام حیوانات ارضی کی آنکھیں اشکبار ہوجائیں اور جن کے غم میں اگر آسمان سے پانی کی جگہ خون برستا، جب بھی ان کے ماتم کا حق ادا نہ ہوتا، وہ اجساد محترمہ و رفیعہ۔ جو تیمور اور بابر کی یادگار اور اکبر اعظم صاحبقران ثانی کی خون عظمت و جبروت کے حامل تھے جنھوں نے چھ صدیوں سے متصل شہنشاہی و فرمانروائی کی گود میں پرورش پائی تھی جنھیں حکم و سلطنت کے عیش و اجلال کے سوا کسی مصیبت کا کبھی تصور بھی نہیں ہوا تھا۔ اور جو ہمیشہ اُن کرّ و فر کے

انسانون کو جن کی آبادیان کابل کے کوہستان سے لیکر آسام کے جنگلون تک پھیلی ہوئی تھین - اپنے سامنے سربسجود پاتے تے، کون تھا جو سنگ وآہن کا دل جگر پیدا کرکے بھی یہ دیکھ سکتا تھا. کہ وہ چورون اور ڈاکوؤن کی طرح گلیون مین مارے جائین اور اُن کی لاش اُس عظمت رفتہ کا افسانہ ماتم سنائین جو چند روز پیشتر تک دنیا مین صرف انہی کے لیے تھی؟

لیکن یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے لیے مرزا غالب دہلی مین زندہ تھے۔ اور دیکھتے رہے تھے. یہ وہ حوادث ہین جن پر غیرون کی آنکھون سے بھی آنسو نکل آتے ہین - ممکن نہ تھا مرزا غالب جیسے غم دوست شاعر نے یہ سب کچھ دیکھا ہو اور اُسکے دل وجگر کے ٹکڑے ٹکڑے نہو گئے ہون -

گو ضرورت و احتیاج نے اُن سے انگریز حکام اور گورنرون کی لیے مدحیہ قصائد لکھوائے تھے تاہم "مرزا صاحب مشفق و مہربان" کے خطابات اور سات ستر روپیہ کا خلعت اُس زخم کاری کا مرہم تو نہین ہوسکتا تھا. جو حوادث غدر سے ان کے دل پر لگا ہوگا؟ ایک ضعیف الارادہ انسان وقت واحتیاج سے مجبور ہو کر صدہا باتین اوپری دل سے کر بیٹھتا ہے - مگر کچھ اس سے دل کے اصلی محسوسات وجذبات مٹ نہین سکتے -

الزام بغاوت

چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب باتون کا جو اثر ایک مسلمان ہندوستانی کے قلب پر پڑتا تھا. مرزا مرحوم پر بھی پڑا اور ان کی غیرت وحمیت نے گوارا نہ کیا کہ فتح دہلی کے بعد فاتح حکام کے سامنے جا کر خوشامد وعاجزی کرین - وہ خود ہی دبک چکے تھے -

ہر جادہ کز نقش پے تست بہ گلشن
جا کیست بجیب ہوس انداختہ ما!

مگر ان کا وظیفہ انگریز حکام کے ہاتھ مین تھا - اسلیے حکام انگریزی کے ساتھ ان کو ابتدا سے خوشامد تعلقات رکھنا پڑے اور اس وظیفہ کو واگذار کرنے کے لیے اُنھین بیسیون قصیدے انگریزون کی مدح و ثنا مین لکھنے پڑے - پھر وقت بھی سخت پُر آشوب تھا -

ان حالات کی وجہ سے وہ سخت مجبوریون مین پھنس گئے تھے تاہم ان کی طبیعت کچھ اسطرح بیزار ہوئی کہ فتح کے بعد قلعہ مین وفاداران سرکاری جمع ہوئے - انعامات وسندات مین اُن تمام لوگون نے جو بڑی بڑی کوششین کرکے اپنے تئین نمایان کیا جنھون نے غدر مین حصہ نہین لیا تھا اور اُسکے صلہ وکرم سے مالا مال ہوئے - مگر مرزا غالب اپنے بیت الحزن سے نہ نکلے - اور نہ کسی حاکم کے روبرو

حاضر ہوئے۔

بعد کو اپنی بریت کے لیے اُنھون نے اِس عدم حاضری کے بہت سے وجوہ بیان کئے تھے مگر اصل حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے۔ کہ دل درد مند کے ہاتھون پاؤن بندھ گئے۔ اور مصلحت و ضرورت کی عافیت اندیشیون کی بھی کچھ نہ چلی۔ بعد کو ہوش آیا تو عذر بنا کر پیش کرنے پڑے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری حلقون مین عام طور پر اس ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر کی نسبت غیر وفاداری کا یقین ہو گیا۔ اُن کی وہ پنشن بھی بند ہوگئی۔ جو اُن کی زندگی کا اصلی آذوقہ تھی۔ اور چند جام ہائے "فرنچ" گلاب آمیز[1] کا وسیلہ تھی۔ انگریزی درباروں مین پرسش و طلب اور عام تعلقات لطف و نوازش بھی یک قلم موقوف ہوگئے۔ وہ پوری طرح نیم باغیون مین شمار ہونے لگا!

مرزا مرحوم کے لیے یہ حالت بڑی ہی سخت مصیبت تھی۔ ایک شاعرانہ کردی مسرتون کا مرد نہین ہو سکتا۔ نوری نے صاف کہدیا ہے۔

حکیم و شاعر و ملا چگونہ جنگ کنند؟

قلعہ کے برباد ہونے سے وہ چند روپے بھی جاتے رہے۔ جو بہ تعلق تاریخ نویسی و شاعری ملا کرتے تھے۔ اسپر سرکاری وظیفہ کا بند ہو جانا قیامت تھا۔ شام کی سرشاری اور صبوحی کی خمار شکنی دونون سے محروم ہوگئے۔ ساری زندگی آزادانہ دادو ستد اور یک گونہ فارغ البالی مین بسر ہوئی تھی اب فاقہ مستی تک نوبت پہونچ گئی۔ اور صرف دوستون اور شاگردون کی خدمت گذاری پر دن کٹنے لگے۔ اس زمانے کے خطوط اُردوے معلےٰ مین موجود ہین۔ ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زندگی سے تنگ آگئے تھے۔ اور سرکاری وظیفکی واگذاری اور الزام بغاوت سے بریت کے لئے بڑی بڑی کوششین کرتے تھے۔

---

[1] مرزا مرحوم اپنے فارسی خطوط مین ولایتی شراب کو "فرنچ" لکھا کرتے ہین۔ فرانس اور اسپین شراب سازی کا مرکز ہین کوئی فرانسیسی شراب پی ہوگی۔ جسکو ساختہ فرانس ہونے کی وجہ سے فرنچ کہدیا ہوگا۔ اُنھون نے عالم وارستگی مین یہی نام رکھ لیا۔ قاعدہ تھا کہ اسکی تیزی کم کرنے کے لئے گاہ گاہ عرق گلاب ملا لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک غزل کے مقطع مین کہتے ہین۔

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوے اوست
آمیختن بہ بادہ صافی گلاب را!

غیر مطبوعہ قصیدہ

یہ زمانہ تین سال تک رہا اور صفائی کی کوئی کوشش سود مند نہ ہوئی - معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا یہ غیر مطبوعہ قصیدہ بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے - دربار و خلعت کا نہ ملنا، نذر وغیرہ کا سلسلہ بند ہو جانا، قدیمی عزت و احترام کی یاد - اپنی بے آبروئی و بے عزتی پر حسرت و افسوس، یہ تمام باتیں جو اسمیں پائی جاتی ہیں - صرف اسی زمانے کی نکالی ہوئی ہو سکتی ہیں - غالباً لارڈ کیننگ نے جنوری ۱۸۶۰ء میں جو دربار آگرہ میں لب دریا جما کیا تھا، اسی کی طرف اسمیں اشارہ کیا گیا ہے - دہلی سے اس میں شریک ہونے کے لیے شاید آگرہ گئے ہونگے - "لب دریا" خیموں کے لگنے اور ریل کا وقت کم ہونے کے ذکر سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے -

چنانچہ اوسکی تصدیق ان کے بعض فارسی قصائد و قطعات سے بھی ہوتی ہے جو اس زمانے میں لکھے گئے تھے - اور جو بالکل اس اردو قصیدے کے ہم معنے و ہم مطلب ہیں -

شلاً غدر کے بعد جو فارسی قطعہ مسٹر اڈمنسٹن بہادر لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال و مغربی کو مخاطب کر کے لکھا ہے، اور جسکا پہلا شعر -

فرزانۂ یگانہ اڈمنسٹن بہادر
کاموختہ ز دانش اندیشہ آئین کاردانی

ہے - اسمیں اپنی مصیبتوں کا افسانہ سنا کر الزام شرکت بغاوت سے اپنی بریت کی ہے، اور کہا ہے کہ حکام کے دل میری جانب سے پھر گئے ہیں آپ مدد کیجیے اور میری صفائی کرا دیجیے -

چنانچہ لکھتے ہیں کہ میرے تعلقات انگریزی حکومت سے نہایت قدیمی ہیں - میں ہمیشہ حکام کی مدح میں قصائد لکھتا رہا اور صلہ و انعام سے شادکام ہوا -

از حضرت شہنشہ خاطر نشان من بود
در رمز مدح سنجی صد گونہ کامرانی

یہی حالت تھی کہ

ناگہ تند بادی کان خاست در قلمرو
برہم زد آن بنا را نیرنگ آسمانی

یعنے غدر کا ظہور ہوا -

در وقت فتنہ بودم غمگین و بود با من
زاری و بے نوائی و پیری و ناتوانی

حاشا کہ بوذ باشم ''باغی'' بانتکار | حاشا کہ کردہ باشم ترک وفا نہانی!
از تہمتے کہ برمن بستند بد سگالان | حکام راست با من یک گونہ سرگرانی

یعنے غدر کے زمانے مین میری ناتوانی کی وجہ سے کہین آجانہ سکا اور اظہار وفاداری نہ کرسکا باغیون سے مجھے کوئی تعلق ظاہر و باطن نہ تھا۔ محض تہمت تراشی سے مقامی حکام مجھے بدظن ہو گئے ہین۔

اسی طرح ۱۸۶۰ء مین جب لارڈ کیننگ گورنر جنرل نے دربار کیا ہے' تو دو مطلعون کا ایک پر زور قصیدہ لکھکر پیش کیا۔

زسال تو دگر آبے بروے کار آمد
ہزار و ہشت صد و شصت در شمار آمد

اس قصیدے کے آخر مین وہ سب شکایتین ایک ایک کرکے لکھی ہین جن کے لیے اس غیر مطبوعہ اُردو قصیدے مین لفٹننٹ گورنر پنجاب سے فریادی ہین۔ معلوم ہوتا ہے کہ ٹھیک ایک ہی وقت کی لکھی ہوئی دونون چیزین ہین۔ فارسی قصیدہ وائسرائے کے پاس بھیجا ہوگا۔ اور یہ اُردو کا غیر مطبوعہ قصیدہ لفٹننٹ گورنر پنجاب کے پاس اُردو قصیدے مین نمبر کرسی، خلعت و نذر، وظیفہ انعام، تین چیزون کے بند ہوجانے پر افسوس کیا ہے۔

نمبر رہا نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام

یہی دکھڑا اس فارسی قصیدے مین بھی رویا ہے۔ اپنی قدیمی مداحی و وظیفہ خواری کے بعد لکھتے ہین۔

بہ ناگرفت چنان صرصرے وزید بہ ہر | کز آن بر آئینہ آسمان غبار آمد
شرارہ بار غبارے ز مغز خاک انگیخت | سیاہ روپے کا ندرین دیار آمد
درین جگر گسل آشوب کز حوصلتان | سپاہ دار سپہرے بہ زینہار آمد
گواہ دعوئے غالب بغرض بیگنہی | ہمین بس ست کہ ہرگونہ رستگار آمد

یعنے غدر کی باد صرصر سے مصائب کا غبار چھاگیا۔ اس زمانے مین میری بے گناہی کا بڑا ثبوت یہی ہے۔ کہ میرے خلاف کوئی ثبوت نہ ملا' اور اسلیے کوئی مخالفانہ کارروائی میرے مخالف حکام نہ کرسکے۔

اسکے بعد کہتے ہین کہ اب آپکے طالب لطف و کرم و تلافی مافات ہون۔

کنون کہ شد ز تو زینت فزائے اورنگ زمین | سواد ہند کہ چون زلف تابدار آمد

خطاب وخلعت وپنشن زشاہی خواہم | ہم از خنست بدین وایہ ام قرار آمد
پس از سہ سال کہ در رنج پیچ وتاب گذشت | سرگذارش اندوہ انتظار آمد

یہان بھی انھین چیزون کو طلب کیا ہے - اور لکھا ہے کہ تین سال اس حالت پر گذر چکے ہین غالباً اس قصیدے کے گذرانتے کے بعد شملے سے تحقیقات کی گئی اور جب ان کی بے گناہی ثابت ہو گئی تو بدستور پنشن جاری کر دی گئی - تین سال کی پچھلی مجموعی رقم بھی دیدی گئی تھی - اس سے مرزا صاحب بہت خوش ہوئے تھے - چنانچہ اُردوے معلے مین اسکا ذکر موجود ہے -

جن لوگون نے مرزا مرحوم کی صفائی کے لیے خاص طور پر کوشش کی تھی ! اُن مین سید مرحوم بھی تھے - اس واقعہ سے سید صاحب اور مرزا مرحوم مین صفائی بھی ہو گئی جسکے باہمی تعلقات قدیمانہ آئین اکبری کی تقریظ کے قصہ سے کچھ مکدر ہو گئے تھے -

بہر حال اس غیر مطبوعہ قصیدے کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ ۱۸۶۰ء مین لکھا گیا ہے - اور ۳ جوری کے دربار سے مقصود دربار آگرہ ہے - امید ہے کہ مرزا مرحوم کے اُن عقیدت مندان کمال کے لیے جنکی تعداد اب ملک مین روز افزون ہو رہی ہے - یہ غیر مطبوعہ قصیدہ بہت دلچسپ ہوگا - گو شاعری کے اعتبار سے چندان اہم نہو -

مرزا غالب مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ غزل

ممکن نہین کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہون | مین دشت غم مین آہوئے صیاد دیدہ ہون
ہون دردمند جبر ہو یا اختیار ہو | گہ نالۂ کشیدہ گہ اشک چکیدہ ہون
جان لب پہ آئی تو بھی نہ شیرین ہوا دہن | از بسکہ تلخی غم ہجران چشیدہ ہون
نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ | مین معرض مثال مین دست بریدہ ہون
ہون خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھکو لاگ | نے دانۂ فتادہ ہون نے دام چیدہ ہون
جو چاہیے نہین میری قدر و منزلت | مین یوسف بقیمت اول خریدہ ہون
ہر گز کسی کے دل مین نہین ہے میری جگہ | ہون مین کلام نغز ولے ناشنیدہ ہون
اہل ورع کے حلقے مین ہر چند ہون ذلیل | پر عاصیون کے زمرہ مین مین برگزیدہ ہون

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہون آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہون ؛

(از الہلال)

زمانہ جولائی ۱۹۱۴ء

غالب اور ڈاکٹر سید عبد اللطیف

(از سید علی عباس حسینی ایم۔ اے جوبلی کالج لکھنؤ)

ڈاکٹر سید عبد اللطیف پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) اُردو ادب کے اُن جدید محسنوں میں سے ہیں جنھوں نے شاید اسکا حتمی طور پر ارادہ کر لیا ہے کہ وہ معائب کے سوائے اس زبان کی خوبیوں پر نظر ہی نہ ڈالینگے۔ چنانچہ آپ نے لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری جس مضمون پر حاصل کی وہ بھی اردو شاعری سے متعلق تھا اور اس میں انگریزی سے مقابلہ کر کے اس نادار زبان کا خوب خوب مضحکہ اُڑایا گیا ہے۔ جب یہ مضمون کتاب کی صورت میں شائع ہوا تو بعض نقادانِ فن نے اس سرمایۂ تحقیق کی بے ایگی ظاہر فرما دی۔ مگر ان مخالفانہ تنقیدوں کا آپ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ چنانچہ حال میں آپ نے انگریزی میں ایک پوری کتاب غالب کی شاعری پر تصنیف فرما ڈالی ہے اور اسے پھر اپنے مثرالی معیارسے پرکھکر اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ غالب ہرگز کوئی بڑا شاعر نہ تھا۔ اس تصنیف میں ڈاکٹر صاحب نے غالب کے نظریۂ زندگی پر بصیرت افروز تبصرہ فرمایا ہے اور قدردانان اُردو کو اس مایۂ ناز شاعر کے متعلق غلط فہمیوں میں گرفتار ہونے سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔ اس کتاب کو دیکھکر صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو غالب سے کوئی خاص کاوش ہے اور وہ دنیائے ادب سے انکا نام حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس مختصر سی تصنیف میں غالب پر بہت سے الزامات عاید کئے ہیں۔ جن میں سے بعض یہ ہیں:-

(۱) کہ غالب ملا عبد الصمد ایرانی کے شاگرد تھے لیکن وہ نہایت دیدہ دلیری سے فرماتے ہیں کہ مجھکو مبدا فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔ اور عبد الصمد ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ لوگ بے اُستادا کہتے ہیں ان کا منھ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی نام گڑھ لیا:

(۲) وہ دنیا اور اہل دنیا سے نفرت کرتے تھے اور غم دہم کو انھوں نے طبیعت ثانیہ بنا لیا تھا۔ نہ زندہ دلی انکے کلام میں ہے۔ اور نہ کہیں خوشی کا نام و نشان ہی ملتا ہے۔

(۳) وہ حریص تھے اور حصول زر کے لئے سو جتن کرتے تھے۔ اسی غرض سے قولنیں بھی کرتے تھے اور قصیدے بھی گزرانتے تھے۔

(۴) مذہب جیسے اہم معاملے میں وہ مذبذب تھے اور آج تک یہ پتہ نہ چلا کہ وہ کس مذہب کے پیرو تھے۔
(۵) جب تک بہادر شاہ کی رہی سہی حالت باقی رہی غالب اُنکی خوشامد میں لگے رہے۔ جب وہ رنگون بھیج دئے گئے تو انگریزوں کی خوشامد کرنے لگے۔ اور خلعت و پنشن کے حاصل کرنے کے لئے سینکڑوں تدبیریں کر ڈالیں۔
(۶) صوفی بھی وہ محض برائے نام تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں "آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونیٔ طبع کے یہاں کیا رکھا ہے۔
ان الزامات پر غور کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ گو مبداء فیاض سے غالب کو بہت کچھ ملا تھا لیکن اُنھوں نے حصولِ زر کی فکر میں سب کھو دیا۔ اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ "دولت اور خدا ساتھ ساتھ نہیں ملتے،، انھیں نہ تو اطمینانِ قلب حاصل ہوا اور نہ قابلیت کے مطابق شہرت و امتیاز۔ انھوں نے ایک پریشان نظریہ کے ماتحت ایک پریشان زندگی بسر کی۔ اور اس لئے انکی شاعری یکسانیت اور باہمی تطابق سے محروم ہے۔ انکا شمار بڑے شعرا میں نہیں کیا جاسکتا۔
الزامات کی اس طویل فہرست کو اگر غور سے دیکھا جائے اور ان واقعات پر نظر ڈالی جائے جو ڈاکٹر صاحب نے بطور شہادت پیش فرمائے ہیں، تو یہ صاف ظاہر ہو جائیگا کہ موصوف کے پورے مضمون میں اس علمی و ادبی تحقیق کا کہیں پتہ نہیں چلتا جسکی امید ہمیں ایک مغربی تعلیم یافتہ محقق سے ہونا چاہئے۔ اب میں ابتدائی تحقیق کے اصول سے انکا جائزہ لیتا ہوں۔
الزام نمبر ۱۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت جسارت سے یہ تو تحریر فرما دیا کہ عبدالصمد غالب کے فنِ شعر گوئی میں اُستاد تھے لیکن انھوں نے اُن اُستاد کا حوالہ نہیں دیا جنکے بھروسے پر انکو ایسا فرمانے کا حق حاصل ہوا۔ مثلاً۔
(الف) عبدالصمد کو کن لوگوں نے دیکھا ہے؟ (ب) عبدالصمد نے غالب کو کون کون سے علوم کی تعلیم دی؟ (ج) ان علوم میں فنِ شعر گوئی بھی شامل ہے یا نہیں؟ (د) اور اگر ہے تو غالب نے کس زمانے سے کس زمانے تک ان سے اصلاح لی؟ (ہ) عبدالصمد کے کلام کا کچھ نمونہ بھی کہیں دستیاب ہو سکتا ہے یا نہیں؟ (و) شاگرد و اُستاد کے کلام کی کون سی خصوصیات ایسی ہیں جو دونوں میں پائی جاتی ہیں؟ (ز) عبدالصمد کے اور کون کون شاگرد ہیں؟
جب تک مندرجۂ بالا امور کے متعلق تحقیق کرکے یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ واقعی عبدالصمد نے غالب کے کلام پر اصلاح دی ہے اُس وقت تک غالب کا قول قبول کرنا ماننا جائیگا۔ اور محض ڈاکٹر صاحب

کے فرمانے سے غالب پر کاذب ہونے کا الزام نہیں عائد کیا جاسکتا۔

الزام نمبر ۲۔ دنیا سے نفرت کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں ,, عدم قناعت ایک خاص شکل ہے ,, ربانی ,, جسکی وجہ سے انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اسکے گرد وپیش کی دنیا ویسی نہیں، جیسا اسے ہونا چاہیئے اور جس سے کہ انسان میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ایسے اعلیٰ اور برتر خیالات سے دنیا کو آباد دیکھے جو انسان میں ربانی مقاصد کی تکمیل کرتے ہوں۔ عدم قناعت کی دوسری شکل اور ہے جسکی وجہ سے انسان اپنے ماحول اور اپنے حالات زندگی سے بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ وہ عدم قناعت ہے جو کسی واقعی یا خیالی نقصان یا بے قدری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور یہی عدم قناعت کی وہ صورت ہے جو انسان کو اپنی نوع سے نفرت کرنے والا اور دنیوی لذتوں سے محروم بنا دیتی ہے۔ عدم قناعت کی یہی شکل تھی جو غالب کی روح پر پورے طور پر مسلط تھی "۔

غالب پر یہ الزام کہ وہ اپنی نوع سے نفرت کرنے والے اور دنیاوی لذتوں سے محروم تھے اس طرح کی عجیب بات ہے جس پر بحث کرنا ہی فضول سا معلوم ہوتا ہے۔ ایک ایسا شخص جسکی ساری زندگی دوست احباب کی خدمت میں گذری ہو، اور جس نے تمام عمر ,, مرنجاں و مرنج ,, کے طور پر بسر کی ہو۔ جسکے احباب اور شیدائیوں میں ہندو مسلمان، عیسائی، شیعہ، سُنی، وہابی سب داخل ہوں اسکے متعلق یہ کہنا کہ وہ اپنی نوع سے متنفر تھا ایک نئی تحقیق ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ دنیوی لذتوں سے محروم تھے تو اسکے متعلق بھی انکا کلام اور انکی زندگی دونوں ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کے خلاف شہادت دے رہے ہیں۔ چوسر، پچیسی، شطرنج، گنجیفہ، شراب و کباب، تصنیف و تالیف غرض کون سی لذت حیات تھی جس سے غالب محروم رہا ہے۔ کلام میں خوشی کی جھلک دیکھنا مقصود ہو تو مختصر سا دیوان اُلٹئے دو چار سو شعر نکل آئینگے میں مشتے نمونہ از خروارے ڈاکٹر صاحب کی تسکین کے لئے پیش کئے دیتا ہوں۔

گو ہاتھوں میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل — مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اسکو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے   چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر   بادہ نوشی ہے بادپیمائی

ہر ہر لفظ اسکا داعی ہے کہ شاعر پر ایک خاص کیفیت طاری ہے اور خوشی و انبساط حرف حرف سے ظاہر ہے۔ اچھا پوری غزل صاف صاف رندانہ انداز میں سن لیجئے۔

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب   دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن   سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے   سر سے گذرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب ہی کیا ہے   موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب
چار موج اٹھتی ہیں طوفانِ طرب سے ہر سو   موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا موجِ شراب
بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر   شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب
موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال   ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل   موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل   رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسد
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

اب بھی کیفیتِ سرور نہ پیدا ہوئی ہو تو اور لیجئے ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی   چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل   جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا
نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ   اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے   مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

کہاں تک مثالیں پیش کروں - اچھا پھر وہی شعر سن لیجئے جس میں غالب نے اس بحث کے متعلق خود ہی فیصلہ کیا ہے - فرماتے ہیں ؎

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس   برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

الزام نمبر ۳ - ڈاکٹر صاحب کے نزدیک غالب کے غم و ہم کی زندگی کا سبب محض انکی حرص ہے نہ انکا پیٹ بھرتا تھا - اور نہ ان کا دستِ سوال آگے بڑھنے سے رکتا تھا - وہ جھوٹی غرضیں

کرتے تھے اور ممدوح کی تعریف میں قصیدے کے قصیدے کہہ ڈالتے تھے۔

واقعی آجکل کی دنیا میں اب پرانی طرز کی باتوں کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ پہلے شاعروں کا دستور تھا کہ وہ جسکا کھاتے تھے اسکا گاتے بھی تھے۔ اب یہ دستور نہیں رہا۔ عرفی۔ ظہوری نظیری سب کے سب اسی مرض میں گرفتار تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو کون سمجھائے۔ اچھا شاید یوں سمجھیں کہ حصولِ زر کی خواہش عام ہے اور اسکی کوشش اس وقت تک عقلاء کے نزدیک مذموم نہیں جب تک کہ اس سعی میں اتنی خود غرضی نہ شامل ہو جائے کہ ذاتی فائدہ کے آگے دوسروں کے نقصان کا خیال نہ رہے۔ غالب کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ نظر نہیں آتا جہاں انہوں نے کسی دوسرے کو نقصان پہونچا کر اپنا فائدہ کیا ہو۔ یا روپیہ حاصل کرکے اس سے خلق اللہ کی خدمت۔ خاندان کی خدمت اور احباب کی خدمت نہ کی ہو۔ پھر بھلا ایسے آدمی کو حریص اور حصولِ زر کو اسکا نظریۂ زندگی قرار دینا ڈاکٹر صاحب کے سوا اور کس کی مجال ہو سکتی ہے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ جب شاعری پیشہ اور معاش کی صورت ہو تو اس وقت آخر مُربّی و محسن کی مدح جائز ہے یا نہیں؟ میں کہتا ہوں کہ بفرضِ محال ناجائز بھی سہی تو اس سے کسی شاعر کے کمال میں کیا بٹہ لگتا ہے۔ انیس و دبیر نے روپیہ لے کر مجلسیں پڑھیں اور کلام سنایا تو کیا اس سے انکی قادر الکلامی مشکوک ہوگئی۔ شیکسپیر نے حصولِ زر کے لئے ڈرامے لکھے اور اپنے مربیوں کی بھی تعریفیں کیں تو کیا اسکی وجہ سے اُسکے کمالِ شاعری میں نقص آگیا؟ مصنف پیرا ڈائز لوسٹ ملٹن۔ سا تھو رکین بھی کرامول کی تعریف میں مضامین لکھ لیتا تھا۔ اور گورنر آئرلینڈ سے جب منفعت کی امید میں "کومس" سا "ماسک" تیار کرسکتا تھا تو کیا اسکی شاعری ہمہ گیر نہیں رہی اور کیا وہ بڑے شاعروں کی صف سے نکال دیئے جانے کا مستحق ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو بیچارے غالب پر ڈاکٹر صاحب کا غصہ محض بیجا ہی نہیں بلکہ طفلانہ ہے۔

الزام نمبر ۵- بہتر ہوگا کہ اسی سلسلے میں الزام نمبر ۵ سے بھی نبٹتا چلوں۔ اور وہ یہ ہے کہ غالب زمانہ پرست تھے۔ بہادر شاہ کی نوکری کے زمانے میں اُنکی مدح سرائی کرتے رہے۔ اور پھر غدر کے بعد نئے آقاؤں کے ہاں قصیدے گزراننے لگے۔ یہاں پر ڈاکٹر صاحب نے ایک بات جو انکے مطلب کے خلاف تھی حذف کردی۔ یعنی یہ کہ غالب صرف بہادر شاہ کے نوکر ہی نہ تھے بلکہ وہ انگریزی کمپنی کے درباری امراء میں سے تھے اور اس سرکار سے پنشن بھی پاتے تھے اور خلعتیں بھی۔ انکا طریقہ تھا کہ جب کوئی نیا گورنر جنرل آتا تو وہ اُسکی مدح میں قصیدہ کہکر ضرور

بھیجتے اور دہلی کے قریب جو دربار ہوتا اُمیں ضرور بُلائے جاتے - غدر کے بعد جب بہادر شاہ رنگون بھیجدیئے گئے تو غالب کی پنشن اور خلعت دونوں چیزیں بند ہوگئیں - اِس زمانے میں ان پر عتاب تھا - جب انھوں نے اپنی بے گناہی ثابت کردی تو پنشن پھر سے جاری ہوگئی -

عتاب کے زمانے میں یوسف مرزا صاحب کو یوں رقم طراز ہیں -

"۵۲ برس کا سن - تقرر آسکا بتجویز لارڈ لیک و منظوری گورنمنٹ اور پھر نہ ملا ہے نہ ملیگا غیر احتمال ہے ملنے کا .."

اور جب مل گیا ہے تو علاء الدین خاں کو اطلاع دیتے ہیں کہ :-

"صاحب میری داستان سُنئے - پنشن بے کم وکاست جاری ہوا - زر مجتمعہ سہ سالہ یکمشت مل گیا"

غالب کے لئے "محض شاعری ذریعۂ عزت" نہ تھی بلکہ وہ خاندانی نواب تھے - امیر تھے - صاحب خلعت تھے - صاحب پنشن تھے - جس طرح ایک سرکار کی مدح سرائی انپر فرض تھی - اسی طرح دوسری حکومت کی مدح گستری بھی واجب تھی - انھوں نے سیاسیات میں کوئی حصّہ نہیں لیا - وہ غدر میں شامل نہ تھے - انکو اغراض بغاوت سے ہمدردی نہ تھی - پھر وہ انگریزوں کی تعریف اور اپنی پنشن کے اجراء کی فکر وسعی کیوں نہ کرتے ؟

الزام نمبر ۴ - غالب کا مذہب - اِس موضوع پر مَیں اَب سے دو سال پہلے "زمانہ" میں ایک بسیط مضمون لکھ چکا ہوں - تحقیق یہی بتاتی ہے کہ وہ عقیدتاً شیعہ اثنا عشری تھے - اور عملاً صوفی - انکے خطوط اور حالاتِ زندگی اسکے شاہد ہیں - مَیں جس بنا پر عرض کر رہا ہوں وہ غالب کا حسبِ ذیل خط ہے جو انھوں نے نواب مرزا علاؤ الدین خاں بہادر کو لکھا ہے -

(اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۳۲)

"حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا ع اے بیخبر ز لذتِ شربِ مدام ما + دیکھا ہمکو یوں بلاتے ہیں دریبہ کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائلِ ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائلِ حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دل نشیں کرنا اور ہے - مُشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں - مُشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں - مُشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں - دوزخ اُن لوگوں کے واسطے ہے مَیں موحد خالص اور مومن کامل ہوں - زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں - انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے

نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام کے۔ بریں زیستم ہم بریں بگزرم۔ ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھکو دوزخ میں ڈالینگے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن ہونگا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کر دونگا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اسمیں جلیں"

خط کشیدہ حصہ سے انکا اعتقادی حیثیت سے شیعہ اثنا عشری ہونا ثابت ہے۔ رہا ان کے صوفی ہونے کے متعلق عرض ہی کرچکا ہوں کہ صوفی صافی صلح کل تھے۔ مولانا حالی بھی آخری حصہ پہ زور دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب اسپر خفا ہیں کہ اگر وہ شیعہ تھے تو انھوں نے یہ رباعی بہادر شاہ کے سامنے کیوں پڑھی کہ ؎

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری | کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری

دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی | شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

جس نے بھی غالب کے حالات کا ذرا غور سے مطالعہ کیا ہوگا وہ اس سے واقف ہوگا کہ ظرافت اُن کا خاص حصہ تھی۔ جہاں موقعہ ملا فقرہ چست کردیا۔ ذرا گنجائش ہوتی اور کوئی چبھتی ہوئی بات چپکادی۔ غالب کے مذہب سے سب لوگ واقف تھے۔ بہادر شاہ اور اُنکے درباری یہ جانتے تھے کہ یہ شیعہ ہیں۔ لیکن موقع موقع سے چھیڑا کرتے تھے۔ اور یہ بھی اپنے خاص انداز میں جواب دیتے رہے ہونگے۔ یہ رباعی بھی اسی طرح کی ظرافت کا نتیجہ ہے۔ لوگ ہنستے ہونگے اور خوب ہنستے ہونگے۔ اور یہی مقصود تھا۔ اس سے نہ بہادر شاہ کی خوشامد ظاہر ہوتی ہے اور نہ خود غالب کا مذہبی حیثیت سے مذبذب ہونا۔

الزام نمبر ۶۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر صاحب غالب کی صوفیت سے بھی انکار فرماتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ اگر صوفی ہونا کوئی مذہب ہے تو غالب ہرگز صوفی نہیں تھے۔ وہ شیعہ اثنا عشری تھے لیکن اگر یہ قلبی صفائی کا نام ہے جس میں کدورت۔ حسد۔ بغض و کینہ کا نام نہو اور جس میں محبت کا عنصر اس طرح غالب آجائے کہ بالآخر سارا عالم محبت ہی محبت ہوکر رہجائے تو یقیناً غالب صوفی تھے۔ اُنکی ساری زندگی اسکی شاہد ہے کہ اُن سے ہندو مسلمان۔ شیعہ سُنی ہر مذہب و فرقہ کے لوگ یکساں طور پر مستفیض ہوتے رہے اور کبھی کسی کو اُنکے اخلاص و محبت میں شک نہ ہوسکا۔ خود حالی حنفی المذہب ہونے کے باوجود انکو صلح کل مانتے ہیں اور

صوفی صافی کہتے ہیں۔ رہا غالب کا وہ خط جسکا ڈاکٹر صاحب نے حوالہ دیا ہے تو اُسمیں سے ڈاکٹر صاحب کا نقل کردہ ٹکڑا بلا تشبیہ "لاتقربوا الصلوٰۃ" والی مشہور حکایت یاد دلادیتا ہے میں خط کے سارے متعلق حصے نقل کئے دیتا ہوں ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے تو صوفی ہونے سے انکار محض انکسار سے ہے۔ نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں صاحب شفق نے اس زمانے میں کوئی دُمدار ستارہ نکلا تھا اُسکے اثرات دریافت کئے ہیں۔ نواب صاحب کے اس استفسار پر یوں رقمطراز ہیں۔

"...... اب ضرور آپڑا کہ کچھ حال اس ستارۂ دُم دار کا لکھوں۔ چنانچہ جس وقت سے وہ خط پڑھا ہے سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں۔ چونکہ بسبب فقدان اسباب یعنی رصد و کتاب کچھ نہیں کہا جاتا نا چار مرزا صاحب کا مصرع زبان پر آجاتا ہے مصرع "ازیں ستارۂ دنبالہ دارے ترسم"۔ یہ مطلع ہے اور یہ پہلا مصرع ہے۔ مصرع "زغال گوشۂ ابروئے یار می ترسم" کیا آپ مجھکو بے ہنری اور ہیچ میرزی میں صاحب کمال نہیں جانتے اور اس عبارت فارسی کو میرا مصداق حال نہیں مانتے "پیش ملا طبیب و پیش طبیب ملا۔ پیش ہیچ ہر دو و پیش ہر دو ہیچ" آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونی طبع کے یہاں اور کیا رکھا ہے۔ بہر حال علم نجوم کے قاعدے کے موافق جب زمانے کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تب سطح فلک پر یہ شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ جس برج میں یہ نظر آئے اسکا درجہ و دقیقہ دیکھتے ہیں ہزار طرح کی چال ڈالتے ہیں تب ایک حکم نکالتے ہیں۔ شاہجہان آباد میں بعد غروب آفتاب افق غربی شہر پر نظر آتا تھا اور چونکہ اُن دنوں میں آفتاب اول میزان میں تھا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ صورت عقرب میں ہے۔ درجہ و دقیقہ کی حقیقت نا معلوم رہی۔ بہت دن شہر میں اس ستارے کی دُھوم رہی اب دس بارہ دن سے نظر نہیں آتا۔ وہاں شاید نظر آتا ہے جو آپ نے اس کا حال پوچھا ہے۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہر الٰہی کی ہیں اور دلیلیں مُلک کی تباہی کی قرآن النحسین۔ پھر کسوف۔ پھر خسوف۔ پھر یہ صورت پُر کدورت۔ عیاذاً باللہ و پناہ بخدا۔ ......"

سیاق عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ نجوم و صوفیت سے انکار محض انکسار سے تھا۔ اور انکا صوفی نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کو مزید ثبوت تلاش کرنے کی زحمت اُٹھانا پڑیگی۔

مجھے افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے غالب کے متعلق رائے قائم کرنے میں بہت جلد بازی سے کام لیا ہے اور اس وقت نظر اور تحقیق کا انکی تصنیف میں کہیں پتہ نہیں چلتا جسکی توقع ایک مغربی تربیت یافتہ محقق سے کیجا سکتی تھی۔ رہا یہ امر کہ غالب آیا کوئی بڑا شاعر تھا یا نہیں اسکے متعلق میں فی الحال پروفیسر صلاح الدین خدابخش ایم۔ اے (آکسن)

کے اُن نزریں خیالات کے ترجمے پر اکتفا کرتا ہوں جو اُنھوں نے مسلم ریویو دسمبر ۱۹۳۳ء میں ظاہر کئے ہیں۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں :۔

"میکے سفر انگلستان کے دوران میں غالب بیرانہ جدا ہونے والا ہمراہی تھا۔ رنج و افسردگی کی حالت میں وہ (خلوت خانۂ دل کو) روشن کرتا ہے۔ یاس و حرماں میں وہ تسکین دیتا ہے۔ اور صبح سویرے سطح سمندر پر وہ دماغ کو موت و حیات کے اُن مسائل پیچیدہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جنھوں نے انسان کی قوت اور اُس کو مسحور اور عاجز کر رکھا ہے۔ غالب کی نظمیں ولولہ آفرینیوں کا سرچشمہ اور مسرت دائمی کا خزانہ ہیں۔ متانت۔ بشاشت حاضر جوابی۔ ظرافت۔ طعن تشنیع و طنز (حد یہ کہ اُن شوخیوں سے خدا بھی محفوظ نہیں) یہ تمام باتیں افراط و بہتات کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ اور پھر عنوان نظم نہایت صاف ستھرا اور چبھنے والا خنجر کا وار۔ دعوت جنگ۔ میٹھی چٹکیاں۔ پُر اثر شکایتیں۔ جو جی چاہے اُسے کہہ لو۔ یہ ہمارے ادب میں کچھ اپنی طرز کی اور چیز ہے۔ شہرت دوامی کے مالک دوسرے شعرا کی طرح وہ ہر حالت میں پُر از کیف ہے اور ہر جذبہ میں تسلی بخش۔ اسکی نظموں میں ہمیشہ تازگی کا جادو بھرا ہوتا ہے اور اُسکا مخاطب انسانی دل ہی ہوتا ہے .... میں اُسکے اشعار پڑھنے سے کبھی نہیں تھکا اور ہر مطالعہ کے بعد مجھے ان میں نئی نئی مخفی خوبیاں اور خیالات کی گہرائیاں ملتی ہیں۔ اِن نظموں میں زبان و خیال اِس خوبصورتی سے اکٹھا کئے گئے ہیں کہ ہر ایک سرمایۂ داد و تحسین حاصل کرنے میں سبقت کناں نظر آتا ہے۔ غالب کی نظمیں واقعی زندگی کی ترجمان ہیں۔ اور اسکے گوناگوں کوائف و شئوں۔ اسکے عجیب و غریب نملشوں اور تعجب خیز منصوبوں۔ اسکی خوش طبعی کی چہلوں اور درد انگیز غم کی داستانوں کی تصویر کشی میں حقیقی رفعتوں تک منتہی ہوتی ہیں۔ اور اپنا اصلی مقصد بدرجہ خوش اسلوبی سے پورا کرتی ہیں۔

مجھ میں ولولہ اور جوش کی کیفیتیں پیدا کرنے والے! میں تیرے سامنے سرِ نیاز جھکاتا ہوں۔ میرے ملک کے غیر فانی شاعر! میں تیری یاد پر پھول اور ہار چڑھاتا ہوں! ابھی تیرے حقیقی مرتبے سے دنیا روشناس نہیں ہوئی ہے لیکن مستقبل تیرا ہے اور بلا شبہ تیرا ہے۔ تو کسی مفتوح مُلک کا شاعر نہیں ہے بلکہ ایک آزاد قوم کا شاعر ہے جسکی نگاہوں میں حُریت اور عزت زندگی اسکی تونگریوں سے کہیں زیادہ با وقعت ہیں۔

تو نے اپنی نظم کے مختصر مجموعہ میں ہر جگہ غیر مشتبہ لہجہ میں اُس روحانی آزادی کے گیت گائے ہیں جو کسی آقا کی رُوحانی ہو یا مادی۔ اطاعت کا حلقہ کانوں میں ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ اسلام کے سچے فرزند! تیرے لئے ساری عزتیں ہیں! کیا یہ تیرے ہی زمرے نہیں ہیں؟ ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم   اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہوا

اور یہ بھی۔ ؎

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم ‫ ‫ گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

اور یہ بھی ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ‫ ‫ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ ‫ ‫ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

تو ایک حریت کیش قوم کا علم بردار ہے اور تیری نظمیں حریت کی واضح منادی! تیری زندگی تیری نظموں کے مطابق ہے۔ تیرا پرچم عزت و خودداری کے نشانوں کا حامل۔ تو نے کبھی کسی مطلب کے حاصل کرنے اور کسی معرض میں فتح پانے کے لئے عزت ہاتھ سے نہیں دی اور نہ خودداری کو کھویا۔"

پروفیسر صلاح الدین خدا بخش کے ان جذباتِ عالیہ کے بعد میرے لئے کچھ اپنی طرف سے عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات کا مصداق ہوگا۔ خدا کرے ڈاکٹر صاحب ہماری شاعری کو مغربی عینک سے دیکھنے کی غیر صحت بخش عادت کو اب سے ترک فرما دیں۔

زمانہ جون ۱۹۲۹ء

غالب[1]

یہ کتاب درحقیقت غالب کی شاعری پر ایک مبسوط تنقیدی مقالہ ہے، جس میں مصنف نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یہ ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ "غالب کا شمار مشاہیر عالم میں نہیں ہوسکتا" مصنف کی اس "سعی بے حاصل" کی محرک ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی تحسینی تنقید معلوم ہوتی ہے، اگرچہ مصنف نے صاف صاف لفظوں میں اس کا اقبال نہیں کیا ہے تاہم دیباچہ پڑھکر یہ مستنبط کرلینا چنداں دشوار نہیں ہے. بہرنوع شروع سے آخر تک اس کتاب میں مصنف نے غالب پرستی کے خلاف ایک پُرزور صدائے احتجاج بلند کی ہے اور غالب کے مٹانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔ وہ غالب کی شاعری میں "بے اطمینانی کی لے" کے شاکی ہیں۔ غالب کی بے تعصبی کو مذہب کے ساتھ "آنکھ مچولی" سے تعبیر کرتے ہیں اور غالب کی وطن پرستی کے بھی منکر ہیں۔ چونکہ وہ غالب کی کسر نفسی کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہے اس لئے وہ غالب کے صوفیانہ رنگ کو محض "آرائش مضامین" کا ذریعہ خیال کرتے ہیں. جمالیاتی احساس سے محروم ہونیکی وجہ سے وہ غالب کی شاعری کی قدردانی سے معذور ہیں اور طرح طرح کے اتہامات لگا کر غالب کے دامنِ شہرت کو داغدار بنانا چاہتے ہیں لیکن غالب کے کلام کا جادو مصنف کے سر چڑھکر بولتا ہے، اور انھیں شاید بادلِ ناخواستہ غالب کے چند اشعار کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، لیکن ان اشعار پر بھی "وہ مسلسل بڑی نظم" (معلوم نہیں اس سے مصنف کی مراد مثنوی ہے یا کچھ اور) کی قید لگاتے ہیں، جو مزاج اُردو کے سازگار نہیں۔ اس پر بھی یہ ستم ظریفی ہے کہ وہ غیر ملکی معیار سے اجتناب کا بھی اعلان کرتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر مصنف وسعت نظر اور غیر جانبداری سے کام لیکر کلام غالب کا از سر نو مطالعہ کریں تو وہ اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہونگے. بہر حال قدردانانِ غالب کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اس کا حجم ۲۴۴ صفحات ہے اور ۱۲ قیمت یقیناً زیادہ ہے۔

---

[1] مصنفہ ڈاکٹر سید عبدالطیف پی ایچ ڈی۔ پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ مترجمہ سید معین الدین قریشی ایم اے مطبوعہ دکن لاربورٹ پریس۔ جام باغ حیدرآباد دکن۔ قیمت ۱۲

رقعاتِ غالب میں کاٹ چھانٹ

(از پروفیسر مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل)

عود ہندی اور اُردوے معلّیٰ مرزا غالب کے رقعات (خطوط) کے دو اہم مجموعے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر کو مجموعۂ خورد اور آخر الذکر کو مجموعۂ کلاں کہنا بیجا نہ ہوگا۔ مگر یہ ضرور خیال رہے کہ پہلے نسخہ میں تقریباً چالیس خطوط ایسے ہیں جو دوسرے نسخے میں نہیں ہیں ورنہ باقی سب کے سب رقعات ایک دوسرے میں مشترک ہیں۔

عود ہندی کی تاریخ اشاعت ۲۷۔ اکتوبر ۱۸۶۸ء ہے اور اُردوے معلّیٰ کا چھاپہ اگرچہ مرزا کی وفات حسرت آیات ۱۵۔ فروری ۱۸۶۹ء کے وقت قریب قریب تمام ہو چکا تھا مگر وہ ذات کے کچھ عرصہ بعد ہی یعنی ۶۔ مارچ ۱۸۶۹ء کو شائع ہو سکا تھا۔ دونوں نسخوں کی تیاری میں مرزا نے بذات خود دلچسپی لی تھی تاہم یہ امر حیرت و استعجاب کا باعث ہے کہ عود ہندی اور اُردوے معلّیٰ کے مشترک خطوط میں کمی و بیشی کی عجیب کیفیت ہے جو کسی خاص ایڈیشن تک محدود نہیں بلکہ تمام اڈیشنوں کے حق میں قریب قریب یکساں ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات خطوط کے حدوم کے ساتھ وابستہ ہے۔ چنانچہ جناب میر مہدی حسین صاحب مجروح کے نام اُردوے معلّیٰ حصہ اول میں جو اکتالیسواں خط ہے وہ عودِ ہندی میں دو متصور ہے۔ برعکس اس کے عود ہندی میں جناب مجروح صاحب ہی کے نام جو پہلا خط ہے وہ اُردوے معلّیٰ میں دو متصور ہے۔ چنانچہ اس مکتوب الیہ کے نام کے نویں اور اٹھارھویں خطوط صریح طور پر شاہد ہیں۔

(۲) عبارات و الفاظ میں کہیں کہیں رد و بدل یا تقدیم و تاخیر کی کیفیت نمایاں ہے۔ مثلاً:-

عود ہندی	اُردوے معلّیٰ
(الف) اگر ہانسی حصار کے صاحب کلکٹر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے۔	اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے۔
(ب) کنووں کا حال معلوم کرنے گیا تھا	کنووں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔
(ج) میں نے بحسب دستور اپنے ہر جگہ منشاء	میں نے بحسب دستور اپنے ہر جگہ منشاء اصلاح

---

[۱] مراد اردوے معلّیٰ حصہ اول جس میں عود ہندی کے رقعات مشترک ہیں۔

[۲] اردوے معلّیٰ حصہ اول میں نواب علاء الدین خاں کے نام کے خطوط ساتویں و تئیسویں و چالیسویں خطوط اور عود ہندی میں نواب انوار الدولہ شفق صاحب کے نام کا پہلا خط ملاحظہ کیجئے۔

[۳] عود ہندی میں جناب میر مہدی مجروح کے نام کے تیرھویں و بارھویں خطوط ملاحظہ کیجئے۔

[۴] عود ہندی میں جو بیسواں اور اردوے معلّیٰ میں اکتیسواں خط (بنام میر مہدی مجروح صاحب) جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: "بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں"

اصلاح کردیا ہے۔ میرا شیخ صاحب سے سلام کہئے گا، اور کہئے گا کہ کیا کروں دُور ہوں معذور ہوں مدد نہیں کرسکتا۔ اعانت کے مراسم تقدیم کچھ نہیں پہنچا سکتا۔	کہدیا ہے۔ شیخ صاحب سے میرا سلام کہئے گا اور کہئے گا کہ کیا کروں دُور ہوں معذور ہوں مدد نہیں کرسکتا۔ اعانت کے مراسم تقدیم کو نہیں پہنچا سکتا۔

(۳) عود ہندی میں بعض الفاظ وعبارات ہیں مگر اُردوئے معلیٰ میں ان کا کہیں وجود ہی نہیں :-

(ا) 'جناب ممتاز علی خاں صاحب کہاں اور مارہرہ کہاں بہرحال میرا سلام'

(ب) 'جاں کنی کے خیالات نے مجھ کو اُن کی تحریر وتعلق وبار سے دست بردار وآزاد وسبکدوش کردیا'

(ج) 'کہتے ہیں کہ راؤ راجہ نے اہل خطہ کے فراق کی شکایت حاکم سے کی تھی جواب پایا کہ وہ لوگ مفسد اور بدمعاش ہیں اور تمہاری برادری کے لوگ اُن سے ناخوش ہیں ان کے آنے میں فساد کا احتمال ہے وہ نہ آنے پائیں گے'

(د) 'یہ بھی تو پوچھو کہ آپ کے خط کا جواب اتنی جلد کیوں لکھا یعنی کم وبیش مہینہ بھر کے بعد کیا کروں'

(۴) محض اُردوئے معلیٰ میں ہی بعض الفاظ وعبارات ہیں اور عود ہندی میں انکا وجود ہی نہیں؛ چنانچہ عود ہندی میں ایک ہی خط نواب مرزا علاءالدین خاں صاحب کے نام ہے، اور وہ اِن الفاظ سے شروع ہے:

'سنو عالم دو ہیں ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب وگل'

مگر اردوئے معلیٰ میں اِسی عبارت کے پہلے بغور ملاحظہ کیجئے وہاں اِس قدر عبارت زیادہ ہے:-

۵۱ عود ہندی میں تیئیسواں اور اُردوئے معلیٰ میں چھبیسواں خط (بنام میر مہدی مجروح صاحب) جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:-
'جان غالب تمہارا خط پہنچا غزل اصلاح کے بعد'

۵۲ عود ہندی میں آٹھواں اور اُردوئے معلیٰ میں چوتھا خط (بنام چودھری عبدالغفور صاحب سرور) جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:
'جناب چودھری صاحب کی یاد آوری اور مہر گستری کا شکریہ بجالاتا ہوں'

۵۳ عود ہندی میں بائیسواں اور اُردوئے معلیٰ میں چودھواں خط (بنام چودھری عبدالغفور سرور صاحب) جسکے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:- 'جناب چودھری صاحب سیاہی پھیکی، کاغذ پتلا'

۵۴ عود ہندی میں دوسرا اور اُردوئے معلیٰ میں پہلا خط (بنام مولوی عبدالرزاق شاکر صاحب) جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:-
'جناب مولوی صاحب مخدوم مولوی محمد عبدالرزاق صاحب شاکر'

۵۵ عود ہندی میں پہلا اور اُردوئے معلیٰ میں سولھواں خط (بنام میر مہدی مجروح صاحب) جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:-
'برخوردار تمہارا خط آیا حال معلوم ہوا'

۵۶ عود ہندی میں پانچواں اور اردوئے معلیٰ میں انیسواں خط (بنام نواب انوارالدولہ شفق صاحب) اس خط کی ابتدا ان الفاظ سے ہے:-
'قبلہ وکعبہ کیا لکھوں امور نفسانی میں اضداد کا جمع ہونا'

۵۷ جناب نواب مرزا علاءالدین صاحب کے نام آٹھواں خط

"جانِ غالب یاد آتا ہے کہ تمہارے عمِ نامدار سے سنا ہے کہ لغاتِ دساتیر کی فرہنگ وہاں ہے۔ اگر ہوتی تو کیوں نہ تم بھیج دیتے خیر۔ مصرع

انچہ ما در کار داریم اکثرے در کار نیست

تم خرسند رہو اُس نہال کے کہ جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشین اس نہال کا رہا ہوں کیونکر تم مجھ کو عزیز نہ ہوگے، رہی دید وا دید اس کی دو صورتیں ہیں تم دلی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور میں معذور، خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو جب تک نہ سمجھو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے"۔

مزید براں یہ بھی واضح رہے کہ اسی رقعہ میں اختتام سے پہلے کچھ الفاظ (نثر میں) اور دو فارسی و دو اُردو غزلیں ہیں جن کا وجود عودِ ہندی میں نہیں ہے۔

القصہ مذکورہ بالا نوعیتوں کے صدہا اختلافات میری نظر سے گذرے ہیں جن میں سے محض چند پیش کئے گئے ہیں۔ امر حق تو یہ ہے کہ ان اختلافات کے سبب سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عودِ ہندی و اردوئے معلی کے ان خطوط میں بھی کمی بیشی ہوگی جو ایک دوسرے میں مشترک نہیں ہیں مگر ان کی کماحقہ تصحیح اُس وقت تک ایک دشوار امر ہے جب تک کہ مرزا غالب کے اصل رقعات میسر نہ آئیں، اور یہ امر ظاہر ہے کہ بہت سے اصل رقعات کا دستیاب ہونا ایک امرِ محال ہے کیونکہ چند مقامات میں مَیں نے ان کو تلاش کیا لیکن محروم رہا۔ تاہم اربابِ علم کی خدمت میں گذارش ہے کہ اگر کہیں پر تھوڑے بہت رقعات محفوظ ہوں تو مطلع فرمائیں تاکہ مرزا کے جواہر پارے ایک مناسب صورت اختیار کر سکیں۔ کیونکہ میں مرزا کے تمام رقعات و دیگر اُردو تحریروں کو حتی الامکان ایک مناسب صورت میں مدون کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بہت کچھ کامیاب بھی ہو گیا ہوں۔

ہاں اب اخیر میں اس امر کا اظہار کئے بنا نہیں رہ سکتا کہ جس طرح بعض اربابِ کمال و قدر شناسانِ غالب نے اس معاملہ میں میرے ساتھ نہایت ہی دریا دلی و بلند حوصلگی سے کام لیا ہے، اسی طرح دیگر علم دوست اصحاب بھی علو ہمتی سے کام لیں اور میری اعانت کی تکلیف گوارا کریں۔ چنانچہ ایسے ادب پرور حضرات کی مساعیٔ جمیلہ کا اعتراف کتاب کے دیباچہ میں کرونگا، ان کا احسان مانونگا۔ مزید براں میرا خیال یہ بھی ہے کہ اس ضمن کے ادب پرور کرم فرماؤں کی عنایتوں کا اظہار تشکر قدر شناسانِ غالب بھی ضرور کریں گے۔

●●

زمانہ جنوری ۱۹۳۴ء

غالب کا مذہب

اسمین شک نہین کہ غالب کا از روئے اعتقادات ولائے اہلبیت اطہار مین حد درجہ کا غلو انکی تصنیفات و مکتوبات سے ثابت ہے جو انکے اثنائے عشری شیعہ ہونے پر ایک حد تک دال ہے لیکن چند انتخاب انکے مکتوبات سے پیش کئے جاتے ہین جس سے غالب کا سنی ہونا ثابت ہے۔

مکتوب بنام میر مہدی حسین صاحب مجروح - اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۳۶ - ۱۳۷۔

ہر چند کو حامد علی خان کے مسجد مین جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہون، پنکو مسجد جامع جا کر نماز تراویح پڑھتا ہون۔

مکتوب بنام میر مہدی حسین صاحب مجروح - اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۳۶

میان نصیر الدین اولاد مین سے ہین شاہ محمد اعظم کے۔ وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور مین مرید ہون اس خاندان کا۔

غالب مرحوم کے اکثر احباب اور لہارو کا خاندان حضرت مولانا فخر الدین کے سلسلہ مین مرید تھے حضرات شیعہ مرید نہین ہوتے مگر غالب مرحوم کا مرید ہونا خود ان کے مکتوب سے ظاہر ہے۔ علاوہ اسکے چشتی نظامی فقرا اور چشتی صابری فقرا اور ان کے مریدین محبت اہلبیت مین بہت غلو رکھتے ہین اور بارہ امامون سے بھی خاص تعلق رکھتے ہین۔ اسی وجہ سے غالب نے اپنے کو اثنا عشری شیعہ لکھا ہے۔

ماہ رمضان المبارک مین مسجد جامع جا کر نماز تراویح پڑھنا خاص دلیل سنی ہونے کی ہے کیونکہ جامع مسجد دہلی مین شیعون کی کبھی باجماعت نماز ہونا معلوم۔ حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ نے اپنی کتاب "غالب کا روزنامچہ" مین غالب کے سنی ہونے پر کافی روشنی ڈالی ہے

وہ لکھتے ہیں

"غالب چشتی نظامی تھے۔ شیعہ نہ تھے اگر شیعہ ہوتے تو علی گنج شاہ مردان کے قبرستان میں دفن ہوتے جو صفدر جنگ کے قریب ہے۔ اور جہاں اُس وقت کے تمام شیعہ اُمرا دفن ہوا کرتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں۔ سنیوں خصوصاً چشتیوں نظامیوں کے قبرستان میں دفن ہونا اور درگاہ حضرت سلطان جی صاحب میں جو نظامیہ سلسلہ کے بانی ہیں، اُن کی میت کا لایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ وہ سنی تھے۔ شیعہ نہ تھے۔ ان کی قبر بھی سنی طریقہ کی بنائی گئی ہے۔ یعنی اُس پر اُونچا، اونٹ کے کوہان کے شکل کا خشتی تعویذ بنایا گیا ہے۔ شیعوں کی قبریں زمین کے برابر ہوتی ہیں"

لہذا کوئی گنجائش نظر بحالات و دلائل مندرجہ بالا شک و شبہ کی باقی نہیں رہتی جس سے غالب کو شیعہ کہا جا سکے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ غالب کو حقیقی و سچی محبت اہلبیت اطہار سے تھی۔ سیاسی محبت نہ تھی اور یہی طریقہ و عقیدہ سنیوں کا ہے۔

سید عاشق علی

زمانہ اکتوبر ۱۹۲۶ء

رُوحِ کلامِ غالب

(از مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی)

غالب غزل کا بادشاہ تھا اُس نے اس صنف سخن کی ماہیت کو خوب سمجھا ہے۔غزل کی تعریف مختصراً یہ ہے کہ اس میں جتنے مضامین ہوں وہ داخلی ہوں اور ان کا درجہ اس قدر بلند ہو کہ ان سے انسان کی فطرت اور اس کی عظمت ہویدا ہو سکے اور اس کی وسعت ادراک کا پتہ چل سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ جملہ اصناف سخن میں غزل گوئی جتنی آسان ہے اتنی ہی دشوار ہے۔اگر غزل غزل ہو تو اس کو بوستانِ نظم کا ایسا قطعہ کہنا چاہیئے جس کی روشیں غیر مسلسل اور نامربوط ہونے کے باوجود بیحد دلکش اور روح افزا ہیں۔جس طرح آسمان پر چھٹکے ہوئے تاروں کی بے ترتیبی ان کی نور آفرینیوں کو جلا دے دیتی ہے اسی طرح ایک بہترین غزل کے منتشر اشعار اُس کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں اور باایں ہمہ نامربطی و بے نظمی کل جدید لذیذ کا مصداق بن جاتے ہیں۔ظاہر ہے کہ ہر شعر نئی تخیل کا حامل ہوتا ہے اور ہر تخیل میں نئی نئی نکتہ آفرینیاں ہوتی ہیں۔کہیں فلسفۂ اخلاق و تصوف کے گوناگوں رموز عالم حیرت و استعجاب طاری کر دیتے ہیں تو کہیں جذبات حسن و محبت کی بوقلمونی مسحور و بیخود بنا دیتی ہے۔غالب کے دیوان کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے۔اس کا ایک ایک شعر اس معیار پر پورا اُترے گا۔یہی وجہ ہے کہ غالب کا کلام جب پڑھیے نیا لطف آتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے کلام میں اکثر اشعار شرح طلب ہیں اسی لئے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں جن میں طرح طرح کی موشگافیاں کی گئی ہیں۔یہ بحث ہمارے موضوع سخن سے خارج ہے کہ یہ شروح و حواشی اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ غالب کے سوا زبان اُردو کے کسی اور شاعر کے کلام کو یہ شہرت اور اہمیت اب تک نصیب نہیں ہوئی۔اور نہ صرف اس لحاظ سے بلکہ دیگر خصوصیات شعری کی بنا پر آج ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم دنیا کی دیگر مشہور زبانوں کے نامور اور عالمگیر شہرت رکھنے والے شعرا کے مقابل غالب کو پیش کر سکتے ہیں چنانچہ گذشتہ بست سالہ زمانہ میں اس کے کلام کی خوبیوں کو جس بلند آہنگی کے ساتھ سراہا گیا ہے اور اس

کی مدحت طرازی کی گئی ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے ان ضخیم شرحوں کے علاوہ ملک کے نامور مصوّر چغتائی کا دیدہ زیب "مرقع" اور دیگر قسم قسم کے خوبصورت اور نظر فریب ایڈیشن موجود ہیں

کلام غالب کی قدر ومنزلت کی یہ عالی شان عمارت جس کا سنگ بنیاد مولانا حالی مرحوم نے "انیسویں صدی کے آخر میں "یادگار غالب" لکھ کر رکھا تھا آج "روح کلام غالب" کی اشاعت سے پایۂ تکمیل کو پہونچ رہی ہے۔ کسی شاعر کے لئے یہ بات کچھ کم قابل فخر نہیں کہ دیگر شعرا اس کی دو چار چیدہ غزلوں کے اشعار پر مصرعہ لگائیں اور ان کی تضمین کرکے اپنے کلام میں شامل کرلیں لیکن اردو کیا فارسی میں بھی کوئی مشہور سا مشہور شاعر غالباً ایسا نہیں ہوا جس کے پورے دیوان کی تضمین کی گئی ہو۔ کلام غالب کی قدر افزائی میں یہی ایک کمی تھی جس کو "روح کلام غالب" (جو غالب کی تمام غزلوں کی تضمین ہے) بدرجۂ اتم پورا کرے گی اور اس لحاظ سے غالب کے توصیفی لٹریچر میں اس کو ایک قابل قدر اور شاندار ادبی اضافہ شمار کرنا چاہئے

اردو ادب میں تضمین کا رواج در اصل فارسی کا اتباع ہے۔ اردو میں فارسی غزلوں کی بھی تضمین کی جاتی ہے۔ اکثر شعرا خود اپنی غزل کی بھی تضمین کرتے ہیں۔ یہ تضمین دو قسم کی ہوتی ہے۔ مثلث اور مخمس۔ مثلث میں اول مصرعہ تضمین کا ہوتا ہے۔ اور دو مصرعے اصل غزل کے جس کی تضمین کی جائے۔ مخمس پانچ مصرعوں سے مراد ہے جس میں تین مصرعے تضمین کے ہوتے ہیں اور دو اصل غزل کے۔ اب زیادہ تر مخمس کا رواج ہے۔ مرزا عزیز بیگ مرحوم مصنف "روح کلام غالب" نے بھی مخمس ہی کو پسند کیا ہے۔ یعنی غالب کے قصائد وغیرہ چھوڑ کر ہر غزل کے اشعار پر تین تین مصرعے اپنے چسپاں کئے ہیں۔

تضمین کی صرف یہی خوبی نہیں کہ اس کے مصرعے اصل مصرعوں سے دست و گریباں ہو جائیں بلکہ ان سے اصل شعر کے معانی اور مطالب کو خواہ وہ کتنے ہی دقیق اور نازک ہوں اس لطافت کے ساتھ نمایاں کردیا جائے کہ پوری تضمین ایک ہی دل و دماغ کی شاعرانہ کاوشوں کا نتیجہ معلوم ہو۔ روح کلام غالب میں یہ تمام محاسن پوری طور پر نظر آتے ہیں لیکن چونکہ اول سے آخر تک ہر غزل کی تضمین کی گئی ہے اس لئے اگر کہیں کہیں یکساں زور قلم نسبتاً نہ پایا جائے تو الشاذ کالمعدوم کی بنا پر نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے پورے دیوان کی تضمین کرنے میں اپنی پوری قوت شاعری صرف کرکے کلام غالب کی شراب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اس کی ادبی خصوصیت یہ ہے کہ مشکل ترین اشعار

کے معانی اور مطالب اس طرح واضح ہو جاتے ہیں کہ کسی شرح کو دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے روح کلام غالب کو دیوان غالب کی تمام شرحوں پر فوقیت حاصل ہے اور اس کا اندازہ صرف اتنی بات سے ہو سکتا ہے کہ غالب کے جن مشکل اشعار کی شرح میں دیگر شارحین نے نثر میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دئے ہیں اُن کو مصنف روح کلام غالب نے نظم کے صرف تین مصرعوں میں اس فصاحت وبلاغت کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ ہم اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور بیساختہ زبان سے نکل جاتا ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

غالباً اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ غالب اور مرزا مرحوم دونوں فطری شاعر تھے۔ مرزا مرحوم خود بھی ایک درد مند دل رکھتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے غالب کی سیرت اور ماحول کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ جو درد غالب کے کلام میں ہے اسی کی کسک مرزا کی طبیعت میں بھی موجود تھی خواجہ حافظ نے خوب فرمایا ہے:۔

بنالِ بلبل اگر بامنت سر یاریست　　　که ما دو عاشقِ زاریم و کارِ ما زاریست

جب دو درد رسیدہ چوٹ کھائے ہوئے دل ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنی داستانِ غم سناتا ہے تو سننے والوں پر ایک کیفیت کا عالم طاری ہوتا ہے۔ یہی حالت اس تضمین کے مطالعہ سے ناظرین کے دلوں پر پیدا ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ذرا اس بے زباں دل کی صدا سُن　　　کچھ اپنی قدر دانی کا گِلہ سُن
یہ سیلِ بے بہا کہتا ہے کیا سُن　　　سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

اِس اپنی آرزو پہ مر مٹا ہوں　　　کہ نصب العین چشمِ سرمہ سا ہوں
ہمہ تن شوقِ نظارہ ہوا ہوں　　　نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافلہائے تمکیں آزما کیا

———・———

ترا خیال و تصور جو دل کو ہے محبوب　　　اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہے مرغوب
مجھے امیدِ کرم اور تجھ سے ہو گیا خوب　　　یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

کیا خوب شرح کی ہے ؎

جنوں مانع ہوا اُستاد کا احسان اٹھانے سے   فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے
رہا انکار عقلِ کل کو غیر لا بتانے سے   تنا تعلیم درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

ایک مقطع کی تضمین ملاحظہ ہو جس میں غالب نے بوڑھاپے کا رونا رویا ہے ؎

کہئے مرزا کا حال کیا غالبؔ   بے طرح ضعف ہو گیا غالبؔ
ہے یہ پیری بھی کیا بلا غالبؔ   مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

غالب کے ایک شعر کی جس میں توحید کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے تضمین کے تین مصرعوں میں ایسی شرح کی گئی ہے جس سے شاعر کا مافی الضمیر صاف سمجھ میں آجاتا ہے لکھتے ہیں۔

ہیں موحد بجا شرک ہے دل سے مفقود   ہم معتقد ہیں نہ کعبے کے نہ کعبہ معبود
رو بقبلہ ہیں تو صرف ایک جہت ہو مقصود   ہے یہ سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

غالب نے ایک شعر میں معشوق کے وصال کا ذکر کر کے عاشق کی خوش نصیبی انوکھے طرز سے ثابت کی ہے جس میں زلفوں کی پریشانی کو شبِ وصال میں لطف کا سبب ظاہر کیا ہے۔ اور اسی طرح رات کی اور زلفوں کی سیاہی کی مناسبت مزہ دے گئی ہے۔ تضمین نگار نے اس میں چار چاند لگا دئیے ہیں کہتے ہیں:۔

بزم میں جو ہمنشیں تیرا ہے راتیں اُس کی ہیں   جلبع نظارہ میں کر دیتا ہے، راتیں اُس کی ہیں
اس سے بھی وہ خوش نصیب اعلیٰ ہے راتیں جگی ہیں   نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ایک شرح طلب شعر کی منظوم شرح ذیل کی تضمین میں ملاحظہ ہو:۔

ہنسی یاروں نے کیا کی ایک نصیحت مجھکو فرمائی   نہ اب وہ جوشِ وحشت ہے نہ فرطِ ناشکیبائی
سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامانِ رسوائی   نکو ہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

جب غالب دہلی سے لکھنؤ کے سفر کے لئے اس اُمید پر نکلے کہ نواب اودھ کی بارگاہ سے کچھ امداد لے کر نجف اشرف اور حرم محترم کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوں گے تو راستہ میں ایک غزل لکھکر ان جذبات کا اظہار کیا۔ اس غزل کے دو شعروں کی تضمین قابل ملاحظہ ہے۔ کس خوبی سے واقعات کی تصویر کھینچی ہے۔

عقل حیران ہے کس وجہ سے چھوڑی دہلی ۔۔۔ کچھ تو ہے جس لئے طے کی ہے مسافت اتنی
یک بیک چھوڑدی کیوں الفت و راحت گھر کی ۔۔۔ لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

جب چلے گھر سے تو تھی دل میں یہاں اوہی لہر ۔۔۔ بیٹھ رہنا ہمیں اور ترکِ سفر ہے اک قہر
قصد ہے دُور کا مانع جو نہ ہو گردش دہر ۔۔۔ مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیر نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

غالب نے اکثر موقعوں پر اپنے دقیق مطالب کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں عوام اس کو نہیں سمجھتے، اور یہ اُن کی فہم کا قصور ہے۔ اس مطلب کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو کیا خوب کہا ہے :-

میری سخنوری یہ عبث قیل و قال ہے ۔۔۔ مطلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہے
کہتا ہوں سب کچھ اور زباں میری لال ہے ۔۔۔ گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

غالب کے دیوان میں جہاں مشکل اشعار ہیں وہاں ایسے شعر بھی ہیں جو سہل ممتنع کا حکم رکھتے ہیں۔ ایسی غزل کے ایک شعر کی تضمین نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو جس میں تضمین کی زبان بھی مرزا غالب کی زبان سے بل گئی ہے۔

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہے ۔۔۔ حاصلِ گریۂ و بکا کیا ہے
اس تڑپنے سے مدعا کیا ہے ۔۔۔ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اِس درد کی دوا کیا ہے

سطور بالا میں تقریباً غالب کے ہر قسم کے اشعار کی تضمین کے نمونے پیش کر دیے ہیں تاکہ ناظرین "روح کلام غالب" کی خوبیوں کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں اور ان کو معلوم ہو سکے کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم نے غزل کے تنگ میدان کو مخمس بنا کر وسعت دینے میں کہاں تک کامیابی

حاصل کی ہے اور غالب کی اس آرزو کو کہ اُن کے بیان کی وسعت کے لئے تنگنائے غزل سے زیادہ وسیع میدان درکار ہے کس حد تک پُورا کیا ہے۔ غالبؔ کے اسی مضمون کے شعر کی تضمین میں نہایت موزوں اسلوب اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

سخن میں چاہیئے کوئی جدید طرزِ عمل — کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو جائے نکل
نہ کیوں ہو حد تغزّل میں رہ کے جی بیکل — بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل

کچھ اور چاہیئے وُسعت مرے بیاں کے لئے

مرزا مرحوم کی تضمین کے متعلق اس قدر لکھنے کے بعد ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دوسرے شاعروں نے جو غالبؔ کی بعض غزلوں کے خمسے کئے ہیں اُن کے مقابلہ میں مرزا مرحوم کی تضمین کا کیا درجہ ہے مثال کے طور پر میر مہدی مجروحؔ دہلوی کے مخمسوں کو جو غالبؔ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے مرزا مرحوم کے خمسوں کے بالمقابل درج کرتے ہیں۔ مبصر اور ناقد ان کو پڑھکر خود رائے قائم کریں :۔

مجروح	مرزا
کام نخوت سے کچھ روا نہ ہوا	یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا
درِ حاجت کسی پہ وا نہ ہوا	کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا
کیا حقیقت کہوں کہ کیا نہ ہوا	مجھ پہ احساں طبیب کا نہ ہوا
درد منت کش دوا نہ ہوا	درد منت کش دوا نہ ہوا
مَیں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا	مَیں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
دے خدا رحم اِن حبیبوں کو	ہو گے رُسوا تمھیں کہا مانو
کہ جلائیں نہ بد نصیبوں کو	بات بڑھ جائیگی بہت یوں تو
رنج دیتے ہو ہم غریبوں کو	چل کے سُن لو الگ جو سُنتے ہو
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو	جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اِک تماشا ہوا گِلہ نہ ہوا	اِک تماشا ہوا گِلا نہ ہوا
کیوں عبث جاکے اپنا سر ٹکرائیں	اور تجھ سا حسیں کہاں سے لائیں
ناحق احسان کیوں کسی کا اٹھائیں	حسرتِ دل کی داد کس سے پائیں
اُس سے جب آرزوے دل ہی نہ پائیں	کس کے ہاتھوں سے زخم دل پہ کھائیں
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں	ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں

تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

رکھتا لذت جو ہے دہانِ حبیب
شہد و مصری کو وہ کہاں ہو نصیب
کیا کہوں بات ہے عجیب و غریب
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

فکر کی قسمت آزمانے کی
یعنی اُس شوخ کو بلانے کی
یہ سُنو بات دل جلانے کی
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جب سے عقل و تمیز آئی تھی
تیرے ہی در پہ جبہ سائی تھی
دمبدم عاجزی فزائی تھی
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

اس کی بخشش نے کی ذرا نہ کمی
کچھ تلافی یہ ہم سے ہو نہ سکی
کیا بڑی بات ہم نے کی ایسی
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اُن کے جب بحرِ فکر بہتے ہیں
ہم تو مجروح غرق رہتے ہیں
آپ کیوں طعن و طنز سہتے ہیں
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

سخن تلخ کب ہے اُن کے قریب
اُن سے باتیں سُنے یہ کس کے نصیب
ہے حلاوت ہی کچھ سخن میں عجیب
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

جب ہمیں دُھن تھی اُن کے لانے کی
استطاعت تھی گھر سجانے کی
اب جو بدلی ہوا زمانے کی
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جان طاعت ہی میں کھپائی تھی
کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی
سر تھا سجدہ تھا جبہ سائی تھی
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

قابلِ فخر کیا ہے بات اپنی
عین احساں ہے اُسکی خوشنودی
ہم نے اُس پہ نثار کیا شے کی
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

شغلِ مرزا مصروہ رہتے ہیں
جی میں گھٹ گھٹ کے پھوٹ بہتے ہیں
سب غمِ انتظار سہتے ہیں
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالب غزل سرا نہ ہوا

لا تقنطو نوید ہے امّ الکتاب میں
زاہد گنا و خلق ہیں واں کس حساب میں

ہے عرض یہ جناب تقدس مآب میں
کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں

یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

گو آرزوئے دید میں میں بیقرار ہوں
ہرگز وہ یاں نہ آئیں گے میں گو طلب کروں
پر کچھ تو شغل چاہیئے بیکار کیوں رہوں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

شادی و غم کو عشق میں اک ثبات ہے
اس میں کبھی حیات ہے گاہے ممات ہے

ہے طرفہ حال اور نئی واردات ہے

میں اور حظ وصل خدا ساز بات ہے

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

حکم خدا میں گو لب چون و چرا ہے بند
مالک ہے وہ حقیر کرے خواہ سربلند

پر دل تو اس خیال سے رہتا ہے فکرمند
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

ہمدرد قہر نے بتِ خانہ خراب کے
اوسان کھو دیئے دل بے صبر و تاب کے

آج غالب غزل سرا نہ ہوا

جام سبو کو رکھ نہ بچا کر سحاب میں
شامل نہ کر صبوحی کو شب کے حساب میں

واں کچھ کمی نہیں کہ ہے تو اضطراب میں
کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں

یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

لکھ تو دیا انھیں کہ مرا حال ہے زبوں
ہے اُن سے آرزوئے تسلی نزاجنوں

آگاہ اُن کی عادت و خصلت سے خوب ہوں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

وہ آج میرے گھر جو چلے آئے مستِ مے
شکر خدا کہ ہو گئے قصے تمام طے

جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی کر گئے

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

یا تو ملائکہ سے بھی تھا مرتبہ بلند
ہم سا نہیں ہے یا کوئی اب خوار و مستمند

پہونچا رہا ہے ہر متنفس ہمیں گزند
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

بے پردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے
لیکن ہیں چپ خیال سے شرم و حجاب کے

شعر ارتباط کی دقت سے بدلکر اسکو ممات واردات اور بات کا ہم قافیہ کر دیا ہے غلطی ہے، معلوم نہیں یہ غلطی کہاں سے شروع ہوئی ہے

آثار ہم سمجھ گئے اُن کے عتاب کے
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اِک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

اہلِ نظر سمجھتے ہیں عالم کا کیا وجود
ہے اُس کی ذاتِ پاک سے ہر چیز کی نمود
ہر ایک کو نہیں خبرِ نیستی و بود
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

میں لاکھ جاں سے اپنی فدا اُس پہ ہوں مگر
میری اذیتوں سے خوش ہے وہ فتنہ گر
ہے یار میرا دشمنِ آرام کس قدر
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

رکھتے ہیں گو نہاں وہ جمالِ نظارہ سوز
سامانِ زیب رہتا فراہم مگر ہے روز
نکھ شکھ سے تا درست ہے روئے دل فروز
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

تا ہو نہ اُس کو میرے اُٹھانے میں اہتمام
محفل میں اُس کی ہم نے نہ رکھا کسی سے کام
یاں توسعتِ خیال میں رکھا سدا مقام
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

گر شوخیاں جتا کے ملانا نگاہ کا
گر شرمناک ہو کے پھرانا نگاہ کا

آثار بات بات میں ہیں پیچ و تاب کے
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

اشیا کی ہے تصورِ اشیا سے سب نمود
دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب وجود
ہستی کے واہمے کی بدولت ہے ہست و بود
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کیا کہیے ہوتی تھی شبِ غم کس طرح بسر
اختر شماریوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر
توڑا ستم یہ اور نیا چشمِ شوق پر
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

گو خود نما نہیں ہے وہ پردہ نشیں ہنوز
نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز
ہے محوِ ناز خود بھی وہ ناز آفریں ہنوز
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

رہتے تھے ہم پیالہ جہاں اُن سے خاص و عام
اُٹھتا تھا ایسی بزم سے میں روز تشنہ کام
پینے میں آج مجھکو نہ ہو کس طرح کلام
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

آتا ہے یوں تو اُن کو لڑانا نگاہ کا
نظریں بچا کے سب کی ملانا نگاہ کا

انداز دلبری سے جھکانا نگاہ کا
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جب تک کہ بہر خاص مقدر ہی کا نہ جائے
بنتا نہیں ہے کام کوئی لاکھ گر بنائے
اس بات کا یقین کوئی کس طرح سے لائے
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

مقدور جب تک تو سعی میں یاں دست و پا ملائے
پر کیا کریں مراد ہی جب کوئی بر نہ آئے
یہ حال ہو تو خاک محبت کا لطف آئے
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

ملکِ عدم کے دیکھیے عازم پہ کیا بنے
اس رو میں ڈر بہت ہیں نشیب و فراز کے
پر جس میں بس ہی اپنا نہ ہو اس میں کیا کرے
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مجروح کو اس امر سے ہے خوب آگہی
اب وہ نہیں ہے بادہ پرستی جو پہلے تھی
بالکل ہی ترک مے ہو یہ ممکن نہیں ابھی
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

آفت ہے اُف مگر نہ اٹھانا نگاہ کا
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اس کو عمل میں لائے
مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے
لیکن مجھے یہی تو ہے افسوس ہائے ہائے
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

وہ نالہ جو کہ عرشِ معلّٰی کو بھی ہلائے
وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے
وہ نالہ اور کان تک اس شوخ کے نہ جائے
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے
لینا نہیں عدم سے ادھر دم کہیں اسے
بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

تھے یار ہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی
دیکھا نہ ہم نے ہوش میں مرزا کو بھی کبھی
وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت نہ تھی کبھی
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

زمانہ مئی ۱۹۳۵ء

غالب

عام خیال ہے کہ غالب پر مولانا حالیؔ پانی پتی کی "یادگارِ غالب" سے بہتر اور جامع و مانع کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ مگر "یادگارِ غالب" کی تصنیف کے وقت غالب کے تمام خطوط اور تحریریں خواجہ حالیؔ کے پیش نظر نہ تھیں۔ اِس لئے اِس بات کی سخت ضرورت تھی کہ کسی صورت سے مرزا غالبؔ کے زیادہ سے زیادہ حالات ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں۔ مگر اِس کے لئے مرزا غالبؔ کے تمام خطوط، تمام تحریروں، تمام تصنیفات اور ان کے علاوہ یادگارِ غالب اور غالبؔ کے متعلق لکھے ہوئے تمام مضامین اور کتابوں پر تحقیق و تدقیق کی ایک نظر ڈالنے کی ضرورت تھی۔ مگر یہ کام سخت محنت اور انتہائی دیدہ ریزی کا کام تھا جسے مولانا غلام رسول صاحب مہر بی۔ اے ایڈیٹر روزنامہ "انقلاب لاہور" نے نہایت محنت و جانفشانی سے انجام دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ غالبؔ کے خطوط اور دوسری تصانیف کی ورق گردانی کر کے اور ایک ایک شعر اور ایک ایک سطر مطالعہ کر کے حالات کا جمع کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کی مشکلات سے وہی حضرات واقف ہو سکتے ہیں جنھیں اِس قسم کے ریسرچ کے کاموں کا عملی تجربہ حاصل ہو۔ مگر اسی کے ساتھ مولانا غلام رسول مہر بی۔ اے نے جملہ واقعات کو تنقید صحیح اور واقعات تاریخ کی روشنی میں بھی جانچ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ کر دیا ہے۔ مثلاً فاضل مصنف نے "انسائیکلو پیڈیا آف اِسلام" کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"انسائیکلو پیڈیا آف اسلام" بڑی محققانہ کتاب ہے۔ لیکن غالبؔ کے متعلق اس کی تحقیق کا سرمایہ بھی حد درجہ مضحکہ خیز نظر آیا۔ مثلاً یہ مرقوم ہے کہ غالبؔ نے اپنے فارسی دیوان میں جا بجا اسدؔ تخلص استعمال کیا ہے۔ حالانکہ غالبؔ کی کچھ اوپر تین سو غزلیات فارسی میں ایک جگہ بھی اسدؔ تخلص

پتہ:۔ منیجر انقلاب لاہور قیمت تین روپیہ (صہ)

نہیں آیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ غالب کے چچا کی وفات کے بعد شاہ دہلی نے پچاس روپیہ ماہانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ حالانکہ غالب کا مستقل وظیفہ یا خاندانی پنشن نہ شاہ دہلی سے متعلق تھی اور نہ پچاس روپیہ ماہانہ تھی۔ پنشن سرکار انگریزی نے مقرر کی تھی۔ اور فیروز پور جھرکہ کی بحالی تک اس سے متعلق رہی۔ بعد ازاں براہ راست انگریزی خزانہ سے متعلق ہو گئی۔ اور اس کی مقدار ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ یا ساڑھے سات سو روپیہ سال تھی۔ شاہ دہلی سے تاریخ نگاری کے صلے میں جو پچاس روپیہ ماہوار مقرر ہوئے تھے ان کی ابتدا جون ۱۸۵۰ء سے ہوئی جبکہ غالب کے چچا کی وفات پر چوالیس برس گزر چکے تھے "

فاضل مؤلف نے اِن بزرگوں سے بھی شرف نیاز حاصل کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کیا جو مرزا غالب سے تعلقات رشتہ داری رکھتے تھے۔ مثلاً نواب سر امیر الدین احمد خاں والی لوہارو وغیرہ۔ فاصل مؤلف نے بڑی تلاش و تجسس سے مرزا غالب کے بعض ایسے خطوط بھی بہم پہونچائے جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔

اِس کتاب کے اسلوب بیان کی سب سے بڑی خوبی اس کا طریقہ استدلال ہے۔ لائق مصنف جگہ جگہ پختہ دلائل سے سابق تذکرہ نگاروں کی تردید و تصحیح کرتے چلے گئے ہیں۔ مثلاً مرزا غالب پہلے اسد تخلص فرماتے تھے۔ لیکن غالب تخلص اختیار کر لیا تھا۔ اِس کے بارہ میں مولانا آزاد نے "آبِ حیات" میں لکھا ہے کہ "(غالب) نے ۱۲۴۵ھ میں اسد اللہ الغالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا" اس بیان کی تصحیح فاضل مؤلف نے اِس طرح کی ہے:۔

"غالب ۱۸۲۶ء میں کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ ٹھہرے تھے وہاں انہوں نے جو غزل کہی تھی اس میں غالب تخلص استعمال کیا ہے ؎

جو دو رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو ۔۔۔ لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب

اس سے ظاہر ہے کہ وہ ۱۲۴۵ھ سے پہلے ہی اُردو میں بھی غالب تخلص فرمانے لگے تھے"۔

فاضل مؤلف کی یہ ستم ظریفی ہے کہ تحقیق و تدقیق کے دُھن میں وہ خود مرزا غالب پر بھی ہاتھ صاف کرنے سے نہیں چوکتے۔ مثلاً مرزا نے ایک خط میں حبیب اللہ خان ذکا حیدرآبادی کو لکھا تھا کہ:۔

"میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا"

اور مولوی سراج الدین احمد صاحب کو ایک فارسی خط میں لکھا:۔

بنائے (دادا) من از پدر خود رنجیدہ آہنگ ہند کرد و بہ لاہور بہمرہی معین الملک گزید۔ چوں بساط معین الملک درنوشتند بہ دہلی آمد و باذوالفقار الدولہ میرزا نجف خان بہا درپیوست۔"

اِن دونوں بیانوں پر فاضل مؤلف تنقید فرماتے ہیں کہ:۔

شاہ عالم کی بادشاہی کا زمانہ ۱۷۵۹ء سے شروع ہوتا ہے اور نواب معین الملک جن کے پاس غالب کے دادا لاہور میں ملازم ہوئے تھے ۱۷۵۰ء میں انتقال کر گئے تھے۔ لہذا ماننا پڑیگا کہ غالب کے دادا محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔"

لکھنے کو تو فاضل مؤلف لکھ گئے لیکن بعد میں خیال آیا کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"۔ اس لئے یوں لیپ پوت کرتے ہیں:۔

"غالب کا یہ بیان غالباً خاندانی روایات پر مبنی ہے۔ نواب معین الملک کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی کے سنین معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس بیان کی تصحیح نہ کر سکے۔"

اِسی طرح ایک جگہ اور چوٹ کی ہے:۔

"غالب نے ایک موقعہ پر بہن کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن حقیقۃً ان کی کوئی حقیقی بہن نہ تھی ممکن ہے یہ ذکر رشتہ کی کسی بہن کا ہو۔"

غرض جہاں تک تحقیق و تدقیق کا تعلق ہے غالب پر اب تک اس سے بہتر کتاب نہیں شائع ہوئی۔ زبان بھی ادبی ہے اگرچہ کہیں کہیں "پنجابیت" کا اظہار ہو گیا ہے۔

قدر دانان غالب کے لئے یہ کتاب قابل دید ہے اور اسے نجی کتب خانوں اور پبلک لائبریریوں میں جگہ پانا چاہیئے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ سائز بڑا حجم دو سو اسی صفحات، غالب کی تصویر اُن کی تحریر کا عکس اور نواب علاؤالدین احمد خان کے نام وثیقہ جانشینی کا عکس بھی ہے۔

زمانہ نومبر ۳۶ء

مرزا غالب کی بے اعتدالیاں

(از مسٹر اقبال انصاری، ایم۔ اے)

تذکروں کے مطالعہ کے بعد ہندوستانی شعراء مثلاً فیضی، بیدل۔ خان آرزو۔ قتیل۔ واقف۔ فاخر۔ مظہر وغیرہ ہندوستانی شاعروں کے کمال فن پر ہم فخر کرتے ہیں۔ لیکن جب ہم عود ہندی میں ان کے متعلق مرزا غالب کے خیالات پڑھتے ہیں تو ہمارا حوصلہ بڑی حد تک پست ہو جاتا ہے، خان آرزو ہی کے متعلق ایک طرف سروِ آزاد، خزانۂ عامرہ۔ عقدِ ثریا۔ چمنستان الشعراء۔ ریاض الشعراء سفینۂ خوشگوار اور مجمع النفائس رکھیے اور دوسری طرف غالب کی اس عبارت کو ملاحظہ فرمایئے "وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے"۔ اس جملہ کے وزن نے اگرچہ تحقیق کی روشنی میں اُن کی ادبی عظمت کو نہیں گھٹایا ہے۔ پھر بھی ایک فاضل مصنف کی زبان سے نکلنے کی وجہ سے اُسے بہت کچھ مُشبک ضرور کر دیا ہے۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ خان آرزو بے مایہ ہیں، فارسی دانی سے نابلد ہیں، تحقیق میں غلطیاں کی ہیں، تو بھی اُن کے لئے یہی شرف کیا کم ہے وہ فاضل جید تھے، اُردو فارسی عربی میں شاعری کرتے تھے۔ صاحب تصنیفات تھے اور فارسی دانی میں شیخ علی حزیں، والہ داغستانی اور قزلباش خاں اُمید سے ٹکر لیتے تھے۔ سات دیوان اساتذۂ ایران مثلاً بابا فغانی، شفیعائے اثر کمال خجندی وغیرہ کے جواب میں کہے، ساقی نامہ و مثنویاں، حکیم سنائی، ملا نوعی، زلالی، خوانساری اور ظہوری ترشیزی کے جواب میں لکھیں، ایران اُردو کا ایک بھی ایسا شاعر نہ پیدا کر سکا جو یہاں کے کسی شاعر کا ہم رتبہ کہا جا سکتا۔ مرزا معز فطرت اور قزلباش خاں اُمید ضرور ریختہ کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اس میں جو اظہار کمال کیا ہے وہ یہ ہے، فطرت:۔

از زلفِ سیاہِ تو بدل دوم پڑی ہے | در گلشنِ آئینہ گٹا جوم پڑی ہے

قزلباش خاں اُمید:۔

در و دیوار سے اب صحبت ہے | یا بن گھر میں عجب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں | الحفیظ الحفیظ کرتا ہوں

اُمید کے اشعار فطرت کے مقابلہ میں زیادہ صاف و سلیس ہیں، لیکن یہ اُردو کا وہ زمانہ تھا جبکہ یہ اپنے شباب پر پہونچ چکی تھی۔ سودا و میر تقی کے اشعار کے سامنے ان کی کیا حقیقت ہے۔ ایرانیوں کی کاوشوں نے یہ چند شعر پیش کئے اور ادھر فیضی، غلام علی آزاد، بیدل و خان آرزو کے ضخیم دیوان دیکھیے اور فیصلہ کیجئے کہ شعرائے ایران قابلِ مدح و ستائش ہیں یا شعرائے ہندوستان۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ میں اُردو کا اسکالر نہیں اور نہ غالب سے بغض و عناد رکھتا ہوں، غالب کا معتقد ہوں۔ اُن کے کمالِ فن کا معترف ہوں، اُن کی عزت اُسی طرح کرتا ہوں جیسے باسویل، ڈاکٹر جانسن کی کرتا تھا۔ مگر جہاں باسویل نے ڈاکٹر جانسن کو Monarch of Literature (تاجدارِ ادب) کہا ہے۔ وہاں اُن معمولی معمولی واقعات اور غلطیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اس ادیب سے وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں۔ اور یہ سب اس لئے کہ جانسن کی پوری تصویر ہمارے سامنے آجائے۔ آیئے اسی نظریہ کے ماتحت ہم بھی غالب کا مطالعہ کریں۔ یہاں پر ہم غالب کے چند خطوط پیش کرتے ہیں۔ جن سے اُن کے تنقیہ کا نظریہ اور بے اعتدالیوں کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

"فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے، پھر تتبع کلام اہلِ زبان، لیکن: قتیل و واقف و شعرائے ہندوستان کہ یہ اشعار سوائے اس کے کہ اُن کو موزونیِ طبع کہئے اور کسی تعریف کے شایاں نہیں ہیں۔ نہ ترکیبِ فارسی نہ معنی نازک ہاں الفاظ فرسودہ و عامیانہ جو اطفالِ دبستاں جانتے ہیں اور جو متصدی نثر میں درج کرتے ہیں وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں۔ جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید وطواط اور اُن کے امثال و نظائر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور اُن کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہونچے اور ذہن آعوجاج کی طرف نہ لے جائے تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے۔"

اِن سطروں میں تکمیل فارسی کے لئے دو[۲] چیزیں ضروری قرار دی گئی ہیں، تتبع[۱] اہلِ زبان و مناسبت طبیعت اور آگے چل کر قتیل وغیرہ کی "موزونیِ طبع" کو مان بھی لیا، تو اب مناسبت طبیعت کی بحث بہت کچھ کم ہو گئی۔ غالباً مرزا صاحب کا خیال مناسبت طبیعت سے فطری ذوق ہو اور یہ بھی واقف و قتیل کے لئے مسلّم ہے۔ واقف کے متعلق تو یہاں تک ایرانی کہا کرتے تھے "زاغِ ہند زبانِ طوطی از کجا یاد گرفت" اب تتبع اہلِ زبان باقی رہ گیا تو اس کے متعلق بھی تذکرے بتاتے ہیں

کہ قتیل و واقف نے نہایت اہتمام کے ساتھ حصول زبان کی طرف توجہ کی۔ قتیل اٹھارہ برس کے سِن سے محمد باقر شہید اصفہانی کی زیرِ نگرانی و تربیت رہے اور شہید ہی نے مرزا صاحب کے لئے قتیل تخلص پسند کیا۔ (عقد ثریا)

واقف کے تتبع کے متعلق سفینۂ ہندی قلمی پٹنہ لائبریری کا جائزہ لیجیے اور اُس میں خود اُن کی شہادت سُنئیے کہ ابتدا میں وہ خوشگو اور آفریں لاہوری سے اصلاح لیتے تھے لیکن اُن کی اصلاحیں واقف کو پسند نہیں تھیں۔ لہٰذا انھوں نے دیوانِ سعدی و خسرو کو سامنے رکھکر مشق سخن شروع کی۔ سعدی تو مسلّمات میں سے ہیں اب رہ گئے امیر خسرو تو اُن کی زباندانی، اہلیت و عظمت کے خود مرزا غالب معترف ہیں اور فرماتے ہیں :-

"خسرو کہ خسروِ قلمرو سخن طرازی ہے یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرح سعدی شیرازی ہے۔"

جہاں تک اُصول تنقید کا تعلق تھا مرزا صاحب کے معیار پر قتیل و واقف پورے اُترتے ہیں، اُس پر بھی وہ تمام ہندوستانی شعراء کو ہیچ و پوچ بتاتے ہیں۔ اگر ہندوستانی شاعر ایسے ہی جاہل تھے تو جمال ایجو شیرازی اور سروری کاشی اُن کے اشعار سند میں نہ پیش کرتے۔ قتیل و واقف نے تو تتبع کیا اور مرزا صاحب نے موردِ الزام ٹھہرایا۔ اگر یہ فارسی الفاظ میں تصرف بھی کرتے تو بجا تھا اس لئے کہ ایرانیوں نے بیسوں عربی اور ہندی الفاظ پر تصرف کیا ہے لہٰذا "تصرف صاحب قدرتان ہند در فارسی چرا جائز نباشد" (شمر) اور قتیل و واقف کے صاحب قدرت و قادر الکلام ہونے میں کوئی شک نہیں نہیں رُود کی۔ عنصری و خاقانی و طواط کی مثال تو مرزا صاحب نے دی لیکن شہادت و توضیح سے یکقلم گریز کیا ہے۔ اس کو تعصب کے سوائے اور کیا سمجھا جائے۔ ایک ہی موقع نہیں ہے۔ غالب کے اکثر و بیشتر خطوط سے اسی رویہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک ادبی ڈکٹیٹر کی طرح فوراً فیصلہ دیدیتے ہیں اور شہادت وضاحت سے ہمیشہ اغماض کرتے ہیں۔ وارستہ و خان آرزو ہی کا معاملہ لے لیجئے کہ اُس نے خان آرزو کا نام احترام سے لیا ہے۔ حاکم لاہوری کی غزلوں پر خان موصوف نے جو اعتراضات کئے تھے اُن کا جواب دیا ہے اور بہت سے اعتراضات کو صحیح بھی تسلیم کیا ہے۔ آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں دو تین شعر پیش کئے ہیں جن میں اُنھوں نے بھی خان آرزو کے بعض اعتراضات کو صحیح مانا ہے مصطلحات میں بھی وارستہ نے خان آرزو پر کافی اعتراضات کئے ہیں لیکن اس کے بھی اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ وہ ہندیوں کا کلام سندی نہیں سمجھتا تھا، دوسرے یہ کہ وہ شیخ علی حزیں کے سلک ارادت میں داخل ہو چکا تھا۔ باینہمہ اپنے قول کی تصدیق میں اُس نے وہی اشعار پیش کئے ہیں جو خان آرزو نے چراغ ہدایت میں دیئے تھے

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ وارستہ کا تمامی زندگی کا کارنامہ اور بنائے شہرت یہی مصطلحات ہے اور خان آرزو کی ذات مختلف علوم وفنون میں اس سے کئی گنا زیادہ ہے اور کئی گنا بے مثل اُن کی تصنیفیں ہیں۔ وارستہ نے خان آرزو پر اعتراضات کر کے اپنے کو کامیاب بنایا مگر یہ بھی یاد رہے کہ اس کام کے لئے اس نے خان آرزو ہی کی ذات کو منتخب کیا۔ اگر سراج اللغت و چراغ ہدایت نہ لکھی گئی ہوتیں تو غالباً آج وارستہ کے مصطلحات کا وجود بھی نہ ہوتا۔ اور جس فن کے خان آرزو مخترع ہوئے اس کا یہ مکمل اور یوں بھی اصل و نقل کا جو فرق ہونا چاہیئے وہ ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ اس کے تمام اعتراضات صحیح نہیں ہیں۔ بلکہ بہت سے غلط بھی ہیں۔ اب مرزا غالب کا یہ کہنا کہ سیکڑوں اعتراضات ہیں اور ہر اعتراض بجا ہے بالکل قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے جس میں استدلال سے کوئی واسطہ نہیں رکھا گیا ہے۔ پھر وارستہ کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے منھ کی کھاتا ہے" مرزا صاحب اگر ان مقامات کو پیش کرتے جہاں اسکو منھ کی کھانی پڑی تو سمجھ میں بھی آتا۔ اس کے علاوہ اپنے متقدم کے لئے یہ لہجہ اختیار کرنا بہت رکیک معلوم ہوتا ہے۔

حضرت صاحب عالم صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے مرزا صاحب لکھتے ہیں:۔

"...اب ایسا ہوا کہ جب تک فرید آباد کا کھتری دیوانی سنگھ متخلص بہ قتیل جس کو حضرت نے مرحوم لکھا ہے اس کی تصدیق نہ کردے تب تک اس کا کلام قابل استناد نہو۔ قتیل اساتذہ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں۔ اس کے علم فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ آتے اور ہنگامہ آرا ہوتے بیشتر ان میں کشمیری یا کابلی و قندھاری تھے اور اگر احیاناً کوئی عامۂ اہل ایران سے بھی ہو تو تقریر اور ہے اور تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ نظام الدین شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید نثریں کیوں خون جگر کھایا کرتے۔ وہ سب طرح کی نثریں جو لالہ دیوانی سنگھ قتیل متوفی نے بہ تقلید اہل ایران لکھی ہیں نہ رقم فرمایا کرتے..... میں اور آپ بیٹھیں اور اس کے خرافات پڑھے جائیں تب معلوم ہوگا کہ یہ کتنا لغو گو اور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ ہے"

مرزا غالب کسی بات کے لئے جو کلیہ قائم کرتے ہیں اُس پر ثابت قدم نہیں رہتے۔ عود ہندی ہی میں ایک جگہ پر عرفی و ابوالفضل کے مباحثہ میں عرفی کی فتح تسلیم کرتے ہیں۔ اور یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اُس نے جب سے ہوش سنبھالا۔ گھر کے بڈھوں بوڑھیوں سے فارسی سُنی۔ یہاں پر سستی ہوئی

تقریر زباں دانی کے لئے لازمی قرار دی گئی، اور پھر سطور بالا میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ تحریر اور ہے اور تقریر اور ہے۔ یہ کلیہ بھی بالکل صحیح نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ خسرو، فیضی وسرخوش اہل ایران کی تحریروں ہی کا نتیجہ ہیں۔ خان آرزو اپنی کتاب مثمر میں مرکب الفاظ کی بحث میں اہل زبان سے جو غلطیاں ہوتی ہیں" اس پر اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

"چوں مرکبات را مقامہائے خاص باشد عوام را بر نکات ایں اطلاع نبود بعضے از فضلائے ہند

یکے از شعرائے ایران گفتہ کہ ملائے شما فارسی را از پیرزالہائے خود آموختہ اند و ما از فصحائے شما مثل

خاقانی و انوری و مراد فاضل مذکور ہمیں مرکبات است کہ در مقامہائے مختلف گونہ گوں آمدہ و عوام

اسرار آں را نمی دانند پس تربیت کردۂ خواص بہتر از تربیت کردۂ عوام۔"

اب رہ گئی یہ بحث کہ قتیل پر غیر زباں دانوں نے اثر ڈالا تو یہ بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ باقر شہید اصفہانی کی تربیت موجود ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ مرزا جیسے باکمال شاعر نے کیونکر ایسا غیر منصفانہ تبصرہ کیا ہم جانتے ہیں کہ مرزا صاحب کے اعتراضات و تبصرے اُن کے دل کا غبار اور مخالفین کی ہنگامہ آرائیوں کا نتیجہ ہیں۔ اور ایسی صورت میں قتیل پر اعتراضات کر کے وہ اپنے دل کو تسکین دے سکتے تھے۔ لیکن ہمیں اُن کے یہاں کچھ اور ملتا ہے جو مرزا ایسے مہذب انسان کے لئے کسی طرح بھی شایانِ شان نہیں۔ خیر اگر قتیل کو انھوں نے گالیاں دیں تو اُن کی آڑ لیکر تمام ہندوستانی ادب و شعر کو کیوں معرضِ تلف میں ڈال دیا۔ غیاث الدین۔ عبدالواسع ہانسوی و واقف وغیرہ کے متعلق کیوں اس قدر نا ملائم الفاظ لکھے۔ یہ تو اُن کے ہمعصر بھی نہیں تھے کہ ان کی ہرزہ سرائیوں کو معاصرانہ رقابت کا نتیجہ کہہ کر نظرانداز کر دیا جائے معاصرین کے ساتھ رشک و رقابت کے واقعات سے شعرا و علما سب کے تذکرے بھرے پڑے ہیں۔ اور آخر میں یہ بات بھی رہ جاتی ہے کہ آپ کو گالی دینے کا حق ہی کیا ہے۔ تنقید کا کوئی معیار گالیوں کو جائز نہیں رکھ سکتا۔ اس کے علاوہ غالب سے قبل کی صدیاں اس چیز کی متحمل نہیں تھیں کہ ہم اسے سوسائٹی کا نتیجہ کہہ دیں۔ اٹھارھویں صدی کو لیجئے، اس میں وارستہ و خانِ آرزو سے معرکے ہوئے۔ آزاد خانِ آرزو ایک دوسرے پر اعتراضات کرتے تھے اور سب کچھ ہوتا تھا لیکن دامنِ تہذیب کو ہاتھ سے کہیں بھی جانے نہیں دیا گیا ہے۔ اور ہم کو اُن کی تحریروں میں آج بھی ایک لفظ ایسا نہیں ملتا ہے جو مرزا صاحب کے ارشادات کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔ شیخ علی حزیں کی ایک ذات ضرور ملتی ہے مگر یہ خانِ آرزو کے تعلقات بہت کچھ کشیدہ ہو گئے تھے۔ لیکن وہ بھی مرزا صاحب ہی جیسے تھے۔

اور انھوں نے بھی خان آرزو کو بہانہ بنا کر تمامی ہندوستان کی ہجو کر ڈالی اور خود شعرا کو صلواتیں سنائیں۔ لیکن آپ خان موصوف کا تمام کلام دیکھ ڈالئے، ایک لفظ بھی علی حزیں کی شان کے خلاف نہ ملے گا۔ کوشش سے بھی آپ کو شیخ کے متعلق اس سے زیادہ سخت الفاظ نہ ملیں گے کہ "شاعر روستائی ایران" کہا گیا ہو۔ جہاں ادب وتہذیب کا یہ لحاظ رکھا گیا ہو وہاں قتیل کے متعلق کھتری بچہ، اُلو کا پٹھا" عبدالواسع کے لئے "گھا گھس اُلو"، اور غیاث الدین کے لئے "مسلم فرمایہ" وغیرہ کے معزز القاب سننا کون پسند کرے گا؟

یقیناً کسی شخص کی ادبی زندگی اس کے اخلاق سے بالکل علیحدہ چیز نہیں سمجھی جا سکتی ہے۔ غالب کے اخلاق اپنے بیوی، بھائی کے ساتھ عمدہ رہے جس کا ثبوت اُردوے معلی میں موجود ہے لیکن معاصرین وغیر معاصرین وہندوستانی شعرا کے ذکر میں اخلاق وہمہ دانی کے دعوے نے اُن کی شہرت وادبیت کے پلّہ کو بہت ہلکا کر دیا ہے۔ اور ہم یہ دیکھکر گھبراتے ہیں کہ انھوں نے اپنی اس ذہنیت سے ہندوستانی ادب کو کس حد تک نقصان پہونچایا ہے۔ ہم کو مجبور ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ غالب جہاں اپنی شاعرانہ نکتہ سنجیوں کے باعث احترام کا مستحق ہے، وہاں اپنے نامناسب رایوں کی وجہ سے صد درجہ قابل الزام بھی ہے۔ اس قسم کی بے اعتدالیاں آپ کو غالب کے یہاں اکثر ملتی ہیں، جو کبھی تنقید کے غلط اصول اور کبھی گالی کے بھیس میں ہیں۔ بہرحال ہم تو یہی کہیں گے کہ اگر مرزا صاحب خودبینی وخود پرستی کو دور کر سکتے تو آج تنقید کے وہ شاہکار ہمارے سامنے ہوتے جس کی دنیا میں نظیر نہ ملتی۔ لیکن افسوس ہے غالب جذبات کے سیلاب میں بہہ کر خدا معلوم کہاں سے کہاں چلے گئے۔ آخر میں ہم عرفی کے چند اشعار پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں، جن کو اُس نے غالباً ایسے ہی حضرات کے لئے کہے ہیں:۔

بچشم مصلحت بنگر مصاف نظم ہستی را ... کہ ہر خارے درآں وادی و رفش کاویان بینی
زگرد رغبت خاطر فرو شو دیدۂ فطرت ... اگر خواہی کہ حسن خار د گل یک یک میان بینی
تو ہرجا دیدۂ بر شعلہ می تابی بہ خاکستر ... نہ بینی حسن خاکستر چو در روشنگران بینی
تو از ملک عراقی واز گوں کن عادت پیشیں ... اگر خواہی کہ حسن رونق ہندوستاں بینی

زمانہ جون ۱۹۲۷ء

خطوط غالب (جلد اوّل)

رقعات غالب کی بہت سی جلدیں مختلف ناموں سے شایع ہو چکی ہیں، ان میں عود ہندی اور اردوئے معلّی بہت پرانی ہیں لیکن انھیں مرزا کے بہت سے خطوط نہیں ہیں جو انھوں نے اپنے شاگردوں اور احباب کے نام لکھے تھے۔ اس کے علاوہ ان کتابوں میں تحریف یا سہو کاتب ہونے سے اکثر اصلی عبارت مسخ ہو گئی ہے شکر ہے کہ مولوی مہیش پرشاد صاحب صدر شعبہ اردو و فارسی ہندو یونیورسٹی بنارس نے تلاش و تحقیق اور عرق ریزی سے سالہا سال کی محنت کے بعد خطوط غالب کے مختلف مجموعوں سے مقابلہ کر کے خطوط کی تصحیح کی انھوں نے غالب کے دیگر خطوط بھی جو مطبوعہ کتب میں موجود نہیں تھے مختلف ذرایع سے جمع کر کے جدید ترتیب کے ساتھ حتی الامکان تاریخوار اس کتاب میں درج کر دیئے ہیں بعض خطوط کے عکس بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں اب تک جو کسی مطبوعہ کتاب میں نہیں تھے اور جو خود مرزا غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مختلف بزرگوں کے ادبی خزانوں میں محفوظ تھے انھیں میں ایک خط وہ بھی ہے جو مرزا نے میر مہدی مجروح کے نام لکھا تھا۔

غالب کے خطوط اردو لٹریچر کا خزانہ ہیں۔ جسے جناب منشی مہیش پرشاد صاحب نے اس مجموعے میں محفوظ کر دیا ہے۔ شروع میں مؤلف کا دیباچہ بھی ہے جس میں ان خطوط کے متعلق تلاش و تجسس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی پروفیسر عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی کا فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ غالب نے اصل میں کیا لکھا ہوگا اور کتابوں میں کیا چھپ گیا ہے۔ غرض ڈاکٹر صاحب کی توجہ سے یہ مجموعہ خاص طور پر قابل قدر ہو گیا ہے۔ مولوی مہیش پرشاد صاحب نے بھی اس مجموعے کو مرتب کر کے اردو ادب کی ایک گراں قدر خدمت انجام دی ہے جس کے لئے قدر دانان اردو کو ان کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ یہ مجموعہ اردو ٹائپ میں چھپا ہے اور چار سو صفحات سے زائد پر ہے۔ قیمت ساڑھے چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد۔

زمانہ اگست ۱۹۴۱ء

انتخاب دیوان غالب

از مسٹر "سلیم جعفر"

بعض اصحاب کا خیال ہے کہ کائنات کے ہر فرد کی اصلیت پر پردہ پڑا ہوا ہے۔اس کی تہ تک پہونچنا کھیل نہیں۔ جگر خراشی اور سینہ کاوی کے بعد بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے

کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمہ را

اکثر تاریخی واقعات بھی اس کلیہ کی زد سے باہر نہیں ہیں۔ جب تک آنکھوں سے دیکھنے والے اُن پر سے پردہ نہ اُٹھائیں حقیقت رونما نہیں ہوتی اور وہ بحث ومباحثہ کی جولانگاہ بنے رہتے ہیں۔ "انتخاب دیوان غالب" اور "طباعت دیوان غالب" بھی دنیا کے اِسی قسم کے تاریخی واقعات ہیں۔ طباعتِ دیوان غالب کا مسئلہ حل کرنے کے لئے جناب مظفر حسین صاحب تمیم نے ایک ڈراما تصنیف فرمایا، جو آل انڈیا ریڈیو پرنٹر اور ہمایوں بابت ماہ دسمبر ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دیوان کا دوسرا ایڈیشن اس قدر خراب چھپا کہ غالب تاب نہ لا سکے اور بے اختیار دل سے آہ نکل ہی گئی[1]۔ میرے پاس دیوان غالب کا ایک نسخہ ہے جو غالباً اس کی تیسری یا چوتھی اشاعت ہے۔ خاتمۃ الطبع ہدیۂ ناظرین ہے:۔

"بخدمتِ اربابِ سخن عرض کرتا ہے امید وارِ رحمت وغفران محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خان طیب اللہ ثراہ کہ اس سے پہلے دیوان بلاغت نشان جناب نواب اسد اللہ خاں غالب کا دہلی میں چھپا لیکن بسبب سہو ونسیان کے بعض مقام میں تغیر وتبدل ہوا۔اس لئے جناب مجمع لطف بیکراں محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کے ایک نسخہ میرے پاس بھیجا، میں نے بافضال ایزدی مطابق اُس نسخہ کے شہر ذی حجہ ۱۲۷۸ہجری مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا۔امید کہ جب ناظرین اس کے مطالعہ سے حلاوت سخن کی

---

[1]

دیوانِ بندہ را کہ آئینا سواد کرد	تنہا درونہ شعر مجدد نوشتہ است
از نظم و نثر ہر چہ بہ طبعش خوش آمدہ	دیوانِ بندہ پُر ز خوشامد نوشتہ است
ہر جا کہ لفظ چہ مثلاً دید در سخن	دستِ تصرفش ہمہ را بد نوشتہ است
اکنوں شریک مہتر دیوان بندہ است	زیرا کہ بیشتر سخن خود نوشتہ است

---

[1] بڑا افسوس ہے کہ یہ مضمون جنوری ۱۹۴۱ء میں وصول ہوا تھا۔ اتفاقی وجوہ کے اسقدر دیر بعد شائع ہو رہا ہے۔

پائیں مہتمم کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔"

خاتمۃ الطبع میں جن محمد حسین خاں صاحب کا ذکر ہے وہ غالب مرحوم کے گلے کا ہار معلوم ہوتے ہیں۔ غلط دیوان اُنھوں نے چھپوایا۔ تیسرا ایڈیشن جس کا ذکر آگے آئیگا اُنھیں کی "دانائی" کا نتیجہ تھا۔ اور میرے پاس والے نسخہ کے محرک بھی آپ ہی تھے۔ حاصل کلام میرے پاس ایک دیوان غالب ہے جو اُس نسخے کی نقل ہے جسے خود غالب نے طباعت سے پہلے صحیح کیا ہے۔

لیکن اب تک میں جو کچھ لکھ آیا ہوں اُس کو میرے نفس مضمون سے اگر کوئی لگاؤ ہے تو یہ کہ اس دیوان کے شروع میں ایک فارسی کا دیباچہ بھی ہے۔ اور یہ اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لئے قصّہ پاک کئے دیتا ہے کہ دیوان غالب کا انتخاب کس نے کیا۔ پروفیسر محمد حسین صاحب آزاد کا یہ کہنا کہ :-

"مولوی فضل حق صاحب کہ فاضل بے عدیل تھے۔ ایک زمانہ میں دہلی کی عدالت ضلع میں سررشتہ دار تھے۔ اُسی عہد میں مرزا خاں عرف مرزا خانی صاحب کوتوال شہر تھے۔ وہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ نظم و نثر فارسی اچھی لکھتے تھے غرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ اُنھوں نے اکثر غزلوں کو سُنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا۔ اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا خیر جو ہوا سو ہوا، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالہ کر دیا، دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو ہم آج عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔"

غلط ہے۔ اگر کچھ صحیح ہے تو مولوی عبدالباری صاحب آسی لکھنوی کا یہ خیال کہ مرزا نے خود اپنے دیوان کا انتخاب کیا۔ آسی صاحب اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں :-

"خود میرے والد مرزا غالب کے دیکھنے والوں میں تھے۔ اُن کے کمال سخن کے پورے راز داں تھے وہ جب آزاد کا یہ آب حیات والا لطیفہ دیکھتے تھے کہ مرزا نے مولوی فضل حق سے انتخاب کرایا تو غصّے کے مارے سُرخ ہو جاتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ کیا بہتان باندھا ہے۔"

اب اُس دیباچہ کا ایک حصہ ہدیۂ ناظرین ہے جو اس نسخۂ دیوان غالب کے شروع میں ہے جو میرے پاس ہے اور جس کا اُوپر ذکر آ چکا ہے :-

"نیاز دردمند بسخن افروزاں سپاسم کہ شرارے ازاں آتش تابناک بخاکستر خویش یافتہ بکاوبکاو سینہ شگافتہ ام واز نفس دمہ برآں بردمادہ۔ بوکہ در اندک مایہ روزگار آں مایہ فراہم

تواند آمد کہ مجموعہ را فروغ شناسائی چراغ و رائحۂ عود را بال شناسائی دماغ تواند بخشید۔ ہمانا نگارندہ این نامہ را آن در سر است کہ پس از انتخاب دیوان ریختہ بگرد آوردن سرمایۂ دیوان فارسی برخیزد۔ و با ستقامتِ کمال این فرہودمن پس زانوئے خویشتن نشیند۔ امید کہ سخن سرایان سخنور شناسائی پراگندہ ابیاتے را کہ خارج اوراق یابند از آنکار تراوش رگ کلک این نامہ سیاہ نشناسند و جامہ گرد آوری را در ستایش و نکوہش آں اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند۔ یارب این بوئے ہستی ناشنیدۂ از ہستی، پیدائی نارسیدۂ یعنی نقش بضمیر آمدۂ نقاش کہ باسد اللہ خان موسوم، و میرزا نوشہ معروف، و غالب متخلص است چنانکہ اکبر آباد مولد و دہلوی مسکن ست فرجام کار نجفی مدفن نیز باد۔"

میرے نزدیک اس تحریر کے بعد جو بلاشبہ غالب کی اور تصنیف "آبحیات" سے پہلے کی ہے، آزاد مرحوم نے جو دعویٰ کیا ہے نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اور اب اس کو ایک طے شدہ مسئلہ سمجھنا چاہیئے کہ اپنے دیوان کا انتخاب خود غالب مرحوم نے کیا۔ یہ عبارت اُن کے سوا کسی اور کی نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ شروع شروع میں صیغے واحد متکلم استعمال کئے گئے ہیں۔

لیکن منطق کو عقل آرائی کی گنجایش باقی ہے کیونکہ میرے پاس جو نسخہ ہے وہ غالباً تیسرا ایڈیشن ہی ہے۔ "دیوان غالب کی طباعت" سے صاف صاف ظاہر ہے کہ پہلا ایڈیشن ناپید ہو چکا تھا۔ جب دوسرا ایڈیشن مولوی محمد حسین صاحب نے شاہدرہ میں چھپوایا۔ مگر نظم طباطبائی مرحوم کی شرح دیوان غالب سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ایک نسخہ چھپا ہے جس کے ساتھ غالب کا اُردو کا دیباچہ شائع ہوا ہے۔ وھو ہذا:۔

جو دیوان خود مصنف مرحوم کی تصحیح سے چھپا ہے اس کے خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"وداد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اُردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔ مخلص و داد آئیں میر قمرالدین کی کارفرمائی اور خاں صاحب الطاف نشان محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا۔ اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔"

اور جناب نظامی بدایونی صاحب نے جو دیوان غالب مطبع نظامی بدایوں سے شایع کیا ہے، اُس کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:۔

"اس سے پہلے چند در چند ایڈیشن دیوان غالب کے چھپ چکے ہیں جن میں تین نسخے ایسے تھے

جو مرزائے مرحوم کی زندگی میں شائع ہوئے ہیں اور ایک آدھ کی تصحیح بھی مرزا سے منسوب کی گئی ہے۔"

میرے پاس جو نسخہ ہے وہ متضاد شہادتوں کی وجہ سے بہت کچھ باعثِ حیرانی بن گیا ہے خاصکر اس سبب کہ دیباچہ سے صاف صاف ظاہر ہے کہ اس کے لکھنے والے خود حضرت غالبؔ ہیں خاتمۃ الطبع ظاہر کرتا ہے کہ اس کی تصحیح خود حضرت مصنف نے کی ہے۔ اس معنی میں کہ یہ صحیح کئے ہوئے نسخہ کی نقل ہے، یہ اُن کے حیات میں چھپا ہے۔ کیونکہ بقول پروفیسر آزاد" آخر ۷۳ برس کی عمر ۱۲۶۹ء ۱۲۸۵ھ میں جہان فانی سے انتقال کیا۔" اور اس کا سال طباعت ۱۲۷۰ھ ہے۔

چونکہ اس دیوان غالبؔ کے دیباچہ سے "انتخاب دیوان غالبؔ" کا ساتمنازعہ فیہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہوا جاتا ہے، اس لئے اگر کوئی صاحب مختلف نسخوں کو جمع کر کے جو رائے میں نے ظاہر کی ہے اس سے بہتر نتیجہ تحقیقات پیش فرمائیں تو دلدادگانِ کلام غالبؔ پر احسان ہوگا۔

اس مختصر مجموعۂ کلام کے بعد نسخۂ حمیدیہ شائع ہو چکا ہے اور مولوی عبدالباری صاحب آسی بھی کلام غیر مطبوعہ مع شرح چھپوا چکے ہیں۔ گلہائے چمنستان غالبؔ سے مشام جاں معطر کرنے والوں پر بڑا لطف و کرم ہے لیکن انھیں ذرا اس دست برداری پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔

"امید کہ سخن سرایان سخنور ستائے پراگندہ ابیاتے را کہ خارج اوراق یابند از آثار تراوشِ رگ کلک ایں نامۂ سیاہ نشناسند و چامہ گرد آور را در ستایش و نکوہش آں اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند۔"

زمانہ ستمبر ۱۹۲۵ء

دیوانِ غالب اُردو کے قلمی نسخے

از پروفیسر مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل ہندو یونیورسٹی

رقعات وحالات غالب کے سلسلے میں جو چیزیں میری نظر سے گذری ہیں۔ انھیں سے مرزا غالب کے اُردو دیوان کے چار قلمی نسخے بھی ہیں۔ جو مختلف مقامات میں ہیں مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں اور مختلف حضرات کے تصرف میں ہیں۔ ممکن ہے کہ ان نسخوں سے بعض شیدائیاں کلام غالب کچھ فائدہ اُٹھا سکیں۔ لہذا اُن کے بارے میں کچھ باتیں ہدیۂ ناظرین ہیں۔

۱۔ رام پور

یہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء یا ۱۸۵۵ء) میں لکھا گیا ہے بہت ہی عمدہ لکھا ہوا ہے۔ ریاست کے سرکاری کُتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کا ذکر مکاتیب غالب میں شرح وبسط کے ساتھ ہے۔ جنوری ۱۸۶۰ء میں جب مرزا رامپور گئے تھے تو اسی نسخے کی نقل لی اور اُسے نواب ضیاء الدین خان بہادر کے پاس بھیجا اور بعدۂ اسی کو منشی شیو نراین صاحب متوطن آگرہ کو دیدیا۔ چنانچہ آیندہ سطور میں اُس کے بارے میں زیادہ لکھا جائے گا۔

۲۔ رام پور

یہ نسخہ بھی ریاست کے کُتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ وہیں تیار کرایا گیا تھا، اس کی ترتیب غالباً مروجہ نسخوں سے کسی قدر مختلف ہے۔ یہ بھی عمدہ لکھا ہوا ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہ تھا کہ بنظر عمیق اس کو دیکھتا۔ تاہم میرے لئے ضروری تھا کہ اسمیں چند امور کو دیکھتا۔ چنانچہ میں نے دیکھا اور مناسب نتیجہ پر پہونچا۔ کلام غالب کے قدر دانوں کو اس کو بھی غور وخوض سے دیکھنا چاہئے۔

۳۔ مقبوضہ پنڈت گوپی ناتھ کنزرو

یہ نسخہ رام پور کے نسخہ ۱ (محررہ ۱۲۷۱ھ) سے منقول ہے۔ یہی منشی شیو نراین صاحب کے پاس آگرہ جون ۱۸۶۰ء میں بغرض اشاعت بھیجا گیا تھا۔ اور اب پنڈت گوپی ناتھ کنزرو صاحب کے پاس الہ آباد میں ہے۔ اِس کے ساتھ ایک اصل خط کا جزو بھی ہے۔ جسے مرزا نے دیوان کے ساتھ

منشی شیونراین صاحب کے پاس بھیجا تھا۔ چونکہ یہ خط کہیں شائع نہیں ہوا اور اس کا جو حصّہ محفوظ ہے وہ بھی تا ہنوز غیر مطبوعہ ہے لہٰذا اس جز کی عبارت ذیل میں دی جاتی ہے۔

"صاحب، میں تمھارا گنہگار ہوں۔ تمھاری کتاب میں نے دبا ...... بڑی کوشش و محنت سے اِس کو وہاں نہ پہنچنے دیا اور منگوا لیا۔ آج پیر کے دن ۲۵ جون[1] کو پارسل کی ڈاک میں روانا[2] کیا ہے۔ لو اب میری تقصیر معاف کرو اور مجھ سے راضی ہو جاؤ اور اپنی رضامندی کی مجھے اطلاع دو۔ یہ کتاب یعنی دیوان ریختہ تم کو میں نے دے ڈالا۔ اب اس کے مالک تم ہو۔ میں نہیں کہتا کہ چھاپو۔ میں نہیں کہتا نہ چھاپو۔ جو تمھاری خوشی ہو سو کرو۔ اگر چھاپو تو بیشتر جلد کا خریدار مجھ کو لکھ لو اور چھاپیاں زرا[2] تصحیح کا خیال رکھیو ۱۲[3]"

یہ نسخہ بھی عمدہ لکھا گیا ہے۔ مرزا چاہتے تھے کہ یہ نسخہ آیندہ اشاعت کا موجب ہو۔ لہٰذا صحت کا خاص اہتمام کیا ہے اور مرزا نے اس کو اتم و اکمل بتلایا ہے[4]۔ اسی نسخہ کا ذکر مرزا کے کئی خطوط میں ہے۔ جو اُردوے معلّٰی میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہاں اب میں اپنے کرمفرما جناب پنڈت صاحب کا بہت شکرگذار ہوں۔ جنکی عنایت سے میں دیوان کو کئی مرتبہ بخوبی دیکھ سکا۔ انھوں نے خط کی نقل لینے کی بھی بخوشی اجازت دی۔ اب رہا یہ کہ دیوان و خط کیونکر انھیں میسر آئے۔ ان امور پر پھر کبھی روشنی ڈالی جائے گی۔

۴۔ مقبوضہ جناب سید آحمد میرزا صاحب

یہ بھی ایسا نسخہ ہے جس کے بابت میں مرزا کو کچھ کم دلچسپی نہ تھی۔ یہ دسمبر ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا ہے اس کے کاتب جناب سید ذوالفقار الدین حیدر الموسوی المعروف حسین میرزا صاحب، مرزا غالب کے گہرے دوست تھے۔ یہ نسخہ اب جناب سید آحمد میرزا صاحب کے پاس ہے جو کاتب موصوف کے پوتے ہیں۔ جن کا اصلی مکان چھتہ چوہیا محلہ فراش خانہ دہلی میں ہے۔ لیکن میں نے جناب سید صاحب اور اُن کے اعزہ کی مہربانی سے اس نسخہ کو مارچ ۱۹۳۷ء میں ٹیلیگراف اسکوائر نئی دہلی میں دیکھا تھا۔ جہاں کہ جناب سید صاحب اُس وقت مقیم تھے۔

اسی نسخہ کو جناب آغا محمد طاہر صاحب نبیرۂ مولانا محمد حسین آزاد صاحب نے شائع کیا ہے۔ اس

---

[1] مراد جون ۱۸۶۰ء۔ مضمون نگار
[2] "روانا" اور "زرا" جیسا مرزا نے لکھا ہے۔ ویسا ہی یہاں لکھا گیا ہے۔ مضمون نگار
[3] خط بنام منشی شیونراین صاحب محررہ ۳ر جولائی ۱۸۶۰ء (اُردوے معلّٰی میں)۔ مضمون نگار
[4] اس کے آخیر میں مرزا کی تحریر و مہر ہے۔ مضمون نگار

نسخہ کے زائد اوراق میں مرزا کے کہے ہوئے مرثیے کے وہ تمام بند بھی درج ہیں۔ جن کا محض پہلا بند مولانا حالی نے "یادگار غالب" میں درج کیا ہے۔

ہاں یہ بھی واضح رہے کہ رام پور میں جو نسخہ نقل ہوا تھا وہ ایک طرف سے آیا اور دوسری طرف سے گیا۔ پس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اُس کی مدد سے تیار نہیں ہوا ہے اور نہ یہ اُس کی نقل ہے۔ بلکہ جناب سید صاحب کی جداگانہ کوشش کا ثمرہ معلوم ہوتا ہے۔

اِن کے علاوہ دو نسخوں کا پتہ بعض حضرات کی تحریروں سے اور چلا ہے۔ لیکن میں نے یہاں محض انھیں نسخوں کا ذکر کیا ہے جن کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ قلمی نسخوں کو اگر بغور دیکھا جائے تو بعض نظموں کے وقت تصنیف معین کرنے میں مدد مل سکتی ہے اور بعض لفظوں یا مصرعوں کے باب میں مناسب رائے قائم کیجا سکتی ہے۔

"زمانہ" فروری ۱۹۴۰ء

دیوان غالبؔ

یہ امر مسلمہ ہے کہ کسی شخص کی حقیقی قدر و منزلت سے ہم صرف اسوقت واقف ہوتے ہیں جب وہ ہم سے جدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مرزا غالب مرحوم کو اپنے زمانہ میں وہ عزت و شہرت نصیب نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے لیکن آج غالب پرستی کا یہ عالم ہے کہ ہر ذی علم اہلِ نظر کلام غالب کو حرز جان بنائے ہوئے ہے۔ یہ دیکھکر بےاختیار زبان پر آتا ہے۔ ذَالِکَ فَضلُ اللّٰہِ یُؤتیہِ مَن یَشَاء۔

غریب اُردو کا تو ذکر ہی کیا غالباً دنیا کی کسی زبان میں کسی سخنور کے کلام کی اتنی شرحیں نہ لکھی گئی ہونگی۔ جتنی غالب کے مختصر دیوان اُردو کی لکھی جا چکی ہیں اور ابھی تک لکھی جا رہی ہیں۔ اسکے علاوہ دیوان غالب کے معمولی اڈیشن سے لیکر اعلےٰ درجہ تک متعدد اڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی دیوان غالب مطبوعہ مطبع شرکت کاویانی برلن (جرمنی) ہے جو اسوقت ہمارے سامنے ہے۔

یہ دیوان نہایت اہتمام کے ساتھ اعلےٰ قسم کے کاغذ پر خوبصورت ٹائپ میں چھپا ہے۔ ہر صفحہ پر سرخ جدولیں ہیں خوبصورت جلیس تقطیع اور جلد منقش و مذہب ہے۔ غرض حسن صورت کے لحاظ سے یہ نسخہ لائق دید ہے۔

زمانہ ستمبر ۲۵ء

بیان غالب

کلام غالب پر متعدد شرحیں موجود ہیں۔ موجودہ شرح کی خصوصیت یہ ہے کہ انہیں جناب آغا محمد باقر صاحب۔ ایم۔ اے نے اختصار کے ساتھ ان تمام شرحوں کو یکجا کر دیا ہے۔ جن اشعار پر شارحین میں اختلاف ہے ان کو بھی واضح کر دیا گیا ہے اسطرح پڑھنے والا آسانی سے یہ سمجھ جائے گا کہ اس شعر کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں دیوان غالب کی یہ ایک عمدہ شرح ہے۔ جس نے دوسری شرحوں کی ضرورت کو کم کر دیا ہے۔ طالب علموں کے لئے اسکا مطالعہ ضروری ہے۔ شروع میں پوری غزل دیدی گئی ہے اسکے بعد ہر شعر کا مطلب درج ہے۔ قیمت مجلد ڈھائی روپیہ۔ غیر مجلد دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ ۔ لاہور

زمانہ اگست ۱۹۲۲ء

روحِ غالبؔ

جتنی شرحیں کلامِ غالب اور جتنی سوانحِ عمریاں مرزا موصوف کی لکھی جا چکی ہیں اتنی کسی اور اُردو شاعر اور ادیب کی نہیں لکھی گئیں، اور ابھی ان کا سلسلہ جاری ہے۔ سب سے پہلے خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے "یادگارِ غالب" لکھ کر مرزا غالبؔ کی خوبصورت تصویر پبلک کے سامنے پیش کی اور حقِ شاگردی ادا کر دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنا مشہور مقدمہ لکھ کر مرزا غالب کو نہ معلوم کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ پھر تو دیوانِ غالب کے مختلف اڈیشنوں، دیوان کی شرحوں اور سوانح عمریوں کا تانتا لگ گیا۔ مولانا حالی کی یادگارِ غالب اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمہ کے علاوہ اس وقت تک غالبؔ کی شرحیں اور سوانح عمریاں ایک درجن سے زیادہ منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ حال میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے "روحِ غالب" کے نام سے مرزا کے سوانحِ حیات لکھے ہیں اور تحقیقِ واقعات کی داد دی ہے۔ "روحِ غالبؔ" میں ڈاکٹر صاحب نے اِن کتابوں اور ان شرحوں کی بھی تفصیل دی ہے جو مرزا غالب اور اُن کے دیوان پر اب تک لکھی جا چکی ہیں۔ اس کے بعد غالبؔ کے مستند واقعاتِ زندگی مختصر درج کئے ہیں، اور اسی کے ساتھ مرزا کے اخلاق و عادات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ایک علحدہ باب میں غالبؔ کے ادبی کارنامے بیان کئے ہیں جس میں اُردو فارسی اور نظم و نثر دونوں قسم کی تصانیف آ گئی ہیں۔ اس کے بعد غالبؔ کے شاگردوں کا مختصر حال ہے۔ آخری باب میں جو سب سے اہم ہے غالب کے خطوط درج ہیں جو بجائے خود ایک شاندار لٹریچر ہے۔

زورؔ صاحب کے قلم میں زور ہے، اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے مختصر مگر تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ شروع میں مرزا غالبؔ کی پُرانی تصویر اور خود ڈاکٹر زورؔ کا فوٹو بھی شامل ہیں۔

زمانہ: ستمبر ۱۹۳۸ء

دیوان غالب اُردو

حضرت نظامی بدایونی نے دیوان غالب کو جس حسن ترتیب سے چھپوایا اسکی سخت ضرورت تھی بہ نسبت سابقہ مطبوعہ دیوان کے جلی - خوشخط - کاغذ عمدہ - بین السطور واضح یعنی صرف گیارہ سطری صفحہ ہے - مولف نے ابتدا مین غالب مرحوم کے مختصر سوانحی حالات لکھے ہین اور مختلف مشکل اشعار کی شرح بھی کی ہے - آخر مین کچھ ایسے اشعار بھی ہین جو بازاری دیوان مین نہین چھپے ہین -

اُردو شعرا مین غالب ہی ایسے خوش نصیب ہین کہ انکے دیوان کی متعدد شرحین لکھی گئی ہین اور ابھی زیادہ اہتمام سے انکا دیوان مرتب کرانے کا خیال دلون مین ہے -

حضرت نظامی کا مرتبہ دیوان اس قابل ہے کہ عام علم دوست خصوصاً کلام غالب کے شیدائی ضرور ملاحظہ فرماوین - قیمت عمہ

اُردو شعرا مین غالب کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا ہے - ارباب ذوق انکے ایک ایک شعر پر سر دھنتے ہین - دراصل زمانۂ حال مین جتنی قدر دانی غالب کی ہوئی ہے کبھی دوسرے شاعر کی نہین ہوئی - اردو دیوان کی کئی شرحین شایع ہو چکی ہین اور اب بھی اکے اعلیٰ اعلیٰ ایڈیشن چھپ رہے ہین - ہمارے صوبہ مین سید راس مسعود صاحب بی - اے - ناظم تعلیمات سرکار نظام کی تحریک سے نظامی پریس بدایون نے دیوان غالب کے کئی نہایت قابل قدر ایڈیشن شایع کئے ہین - حال مین ایک پاکٹ ایڈیشن بھی چھاپا ہے جسمین مرزا غالب کی تصویر اور سوانح عمری ہے اور ایک غیر مطبوعہ عکسی خط اور اصل دیوان کا فارسی دیباچہ بھی درج کیا گیا ہے - ایک طولانی مقدمہ مین کلام غالب کی فلسفانہ تنقید بھی کی گئی ہے - دیوان کے ساتھ مولانا نظامی کی ایک مختصر شرح بھی شامل ہے جسمین خصوصیت سے کوشش کی گئی ہے کہ اشعار کا مطلب خود غالب کے زبان مین ادا کیا جائے - دیوان کی قیمت ۱۲ہ ہے اور نظامی پریس بدایون سے ملسکتا ہے -

مطبع گلاب سنگھ لاہور نے دیوان غالب کا ایک خاص ایڈیشن شایع کیا ہے جسکو ہمارے دوست شیخ عبدالقادر صاحب بانی مخزن لاہور نے مرتب کیا ہے - اسکی قیمت صرف ایک روپیہ عہ

'زمانہ' جنوری ۱۹۱۹ء، جون ۱۹۲۰ء

دیوان غالب (مرقع چغتائی)

یورپ و امریکہ مین ادب و آرٹ دونون ایک دوسرے کی پشتیبانی کرتے ہین۔ چنانچہ بیسون مشہور مصورون نے عمر خیام کے رباعیات کی تشریح و توضیح مین اپنا کمال فن ختم کر دیا ہے۔ ہندوستان کے بعض کاملین فن نے بھی عمر خیام کے نظریہ کے مرقع کھینچکر فن مصوری کو داد دی ہے۔ مگر ابھی تک کسی اردو شاعر کو یہ بات نصیب نہین ہوئی۔ شکر ہے کہ اس کمی کو مشہور مصور مسٹر عبدالرحمن چغتائی نے جنکے کمال فن کے اکثر نمونے ہم ہدیۂ ناظرین زمانہ کر چکے ہین۔ پورا کر دیا ہے۔ آپ اردو مین بھی آرٹ اور ادب کو ایک مقام پر لانے کی کوشش کر رہے ہین۔ اسی خیال سے آپ نے اردو کلام غالب کا ایک بالتصویر ایڈیشن تیار کیا ہے جسمین صحت حسن طبع سب ہی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور کلام کے متعلق چار چار پانچ پانچ رنگون کی تقریباً پچاس تصویرین بھی حضرت چغتائی نے بنائی ہین۔ یہ تصویرین خاص اہتمام سے یورپ سے سنہری چھپوائی گئی ہین۔ دو پلیٹ محض پنسل کی ہین مگر یہ بھی مختلف رنگون سے بندی چھاپی گئی ہین۔ گیارہ پورے صفحے کی رنگین تصویرین ہین جو بالکل نئے طریقے سے نزاکت و دلکش انداز مین چھپی ہین۔ گیارہ تصویرین قدیم ایرانی اور مغل مرقعون کی تقلید مین الیومنیٹیڈ (ILLUMINATED) ہین۔ جنمین سے ہر ایک سات سات آٹھ آٹھ رنگون مین چھاپی گئی ہے۔ غرض ہر طرح سے اس مجموعہ ادب و فن کو مکمل و خوشنما بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسکے لئے ڈاکٹر اقبال نے پندرہ صفحات کا ایک عالمانہ دیباچہ لکھا ہے تین سو صفحات پر ختم ہوا ہے۔ تقطیع ۱۲-۱انچ x ۱۱-۱انچ ہے۔ جلد مراکو چمڑے کی ہوگی۔ ۔۔۔ ایک خاص طور پر نفیس خوشنما ایڈیشن شائع ہوگا جسکی صرف دو سو دس جلدین ہونگی اور جسکی قیمت ایک سو دس روپیہ رکھی گئی ہے۔ معمولی ایڈیشن کی قیمت غالباً پندرہ روپیہ ہوگی۔ ہمکو امید ہے کہ قدردانان ادب اس کوشش کی قدردانی کرکے لائق مصور و مؤلف کی حوصلہ افزائی کرینگے۔ ہمکو امید ہے کہ علم دوست خریداران زمانہ اس ایڈیشن کی قدر افزائی کرکے اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دینگے۔ خریداران دفتر زمانہ بھی اپنا نام درج رجسٹر کرا سکتے ہین۔

(علمی خبرین اور نوٹ)

غالب پر اہم خبریں

اُردو نثر خصوصاً خطوط نویسی میں غالب کا طرزِ تحریر اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ چنانچہ غالب کے خطوط کے دو ضخیم مجموعے "عودِ ہندی" اور "اُردوئے معلّیٰ" کے نام سے بیسیوں دفعہ چھپ کر مقبولِ خاص و عام ہو چکے ہیں۔ اب قدردانانِ غالبؔ یہ سنکر خوش ہونگے کہ ایک عرصے سے ہمارے دوست پروفیسر مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل صدر شعبۂ عربی، فارسی و اُردو بنارس یونیورسٹی خطوطِ غالبؔ کی ازسرِ نو ترتیب و تدوین میں مصروف ہیں۔ یہ مجموعہ اب تقریباً پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا ہے۔ لیکن فاضل مؤلف کا خیال ہے کہ ابھی غالبؔ مرحوم کے بعض خطوط انکو ہم نہیں پہونچے ہیں۔ یہ خطوط ہز ہائینس نواب صاحب رامپور، اور ہز ہائینس نواب صاحب لوہارو کے قبضہ میں بتائے جاتے ہیں۔ ہم کو نواب صاحبان ممدوح کی علم دوستی سے توقع ہے کہ وہ مؤلف کو خطوطِ مطلوبہ کی نقل مرحمت فرماکر ایک بہت بڑی علمی ضرورت کو پورا کرنا پسند فرمائیں گے۔

مولانا سیماب اکبر آبادی نے مرزا غالبؔ کے اُردو کلام کی شرح لکھنی شروع کی ہے جو ابھی حرف "ج" تک پہونچی ہے۔ یہ شرح اُن کے رسالہ "شاعر" میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے۔

رنگپور سے عبداللہ یوسف علی صاحب نے اعلان کیا ہے کہ ان کو غالبؔ مرحوم کی قلمی بیاض کا ایک نسخہ دستیاب ہوا ہے جس پر خود غالبؔ کے دستخط موجود ہیں۔

'زمانہ' اگست ۱۹۳۵ء

حیدرآباد دکن کے نوجوان ادیب محمد رفیق صاحب خاور ایم۔ اے نے مرزا غالب کی بعض اُردو فارسی غزلوں کا انگریزی میں آزادانہ ترجمہ کیا ہے جس کا نام "انڈین خیام" رکھا ہے۔ اس ترجمہ پر لندن یونیورسٹی کے پروفیسر گریہم بیلی نے ایک شاندار مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ کتاب جلد شائع ہونے والی ہے۔

(علمی خبریں اور نوٹ)

مُباحثہ

قتیل اور غالب

(از حکیم ابوالعلار ناطق صاحب لکھنوی)

بذکر مرگ شبے زندہ داشتن ذوقیست
گرت فسانۂ غالب شنیدن ست مخسپ

سید اسعد علی صاحب انوری نے "قتیل اور غالب" کے نام سے ایک رسالہ لکھکر مکتبۂ جامعہ دہلی میں چھپوایا ہے جس کا اصل مقصد صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ قتیل کو غالب نے جو زبان و قلم سے مقتول کیا ہے اُس کا انتقام لیا جائے اسی لئے غالب کی زندگی کا کوئی شعبہ باقی نہیں رہا جس کے پوست کندہ حالات قلمبند نہ کئے گئے ہوں اور ہر بات بڑی تحقیقات و استدلال سے لکھی گئی جس کی وجہ سے یہ کتاب قابل توجہ ہوگئی ہے۔

جن لوگوں نے اس کتاب کو تمام و کمال نہیں دیکھا اُن کو یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ قتیل اور غالب کا ادبیات میں مقابلہ اور موازنہ کیا گیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے بلکہ مؤلف نے صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ غالب فارسی میں تو غالب تھا ہی اُردو میں بھی تخیل کے لحاظ سے قتیل کو کوئی نسبت نہیں تھی کیونکہ قتیل کا مایۂ ناز کمال شاعری تھا دوسرے اُردو شاعری سے کوئی خاص تعلق نہ رکھتا تھا۔

انوری صاحب نے قتیل پر سے وہ اعتراضات رفع کئے ہیں جو غالب کی طرف سے وارد کئے گئے ہیں، اور غالب پر ہر حیثیت سے اعتراضات کئے ہیں مثلاً چند عنوان پیش کرتا ہوں جو اس کتاب کے دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

بداخلاقی۔ محسن کشی۔ فحش کلامی۔ عزیزوں سے بے رُخی۔ بی بی سے نفرت۔ انعام و خطاب کی ہوس۔ انگریزوں کی کاسہ لیسی۔ ادبیات میں صحت و سند کا غلط معیار۔ اساتذۂ سلف کا حسب ضرورت اقرار اور انکار۔ معروف و مقبول ادیبوں سے رشک و حسد اور دشمنی۔ قتیل سے دشمنی اور کلکتہ میں غالب پر اعتراضات۔ غالب کی ادبی غلطیاں۔ برہانِ قاطع پر رد و قدح۔

میں (تبصرہ نگار) غالب کا معتقد ہوں، خصوصاً اُردو شاعری کی تخییل و طرز ادا کا، اور فارسی کلام کی تقدیمیت میں فارسی کا، اور ہمیشہ ان حملوں کو تقریراً و تحریراً رد کرتا رہا ہوں جو کسی نے ان پر کئے ہیں۔ مگر انوری صاحب نے غالب پر ایسا ہمہ جہت حملہ کردیا ہے کہ "تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"

تاہم اخلاقی اور ادبی فرض یہ ہے کہ ایک کامل فن شاعر جو مرنے کے بعد دعائے مغفرت کا محتاج ہے۔ یہ اُس کی لاش پر ذلت اور رسوائی کی بارش ہو رہی ہے، اگر سائبان نہ ہو سکے تو چھتری ہی لگا دی جائے۔ اخلاقی حیثیت سے غالب پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے رئیسوں کی جھوٹی کی ہے اور سب سے پہلے انگریزوں کی مدح میں قصائد لکھے۔

واقعہ یہ ہے کہ سلاطین، عمائد اور حکام وقت کی مدح میں متنبی، ابو نواس، اصمعی سے لیکر انوری، سعدی، خسرو، اور انشا، ذوق، اخیر تک سب ہی نے قصائد لکھے اور سب نے دنیوی منافع کے لئے مدح خوانی کی۔ پوری تمام دنیا میں ایسے شعرا بہت کم نکلیں گے جنھوں نے قصیدہ گوئی سے گریز کیا ہو جس کو دیکھنا ہو خزانۂ عامرہ، ان کا تذکرہ دیکھ لے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ غالب نے کچھ زیادہ لوگوں کی مدح سرائی کی یا مدح میں زیادہ قصیدے لکھے۔ تو اس کی ذمہ داری ان رؤسا پر ہے جنھوں نے قدر نہیں کی اور بخل سے کام لیا۔ ورنہ اگر کوئی رئیس قدر دانی کرتا تو وہ کیوں مارے مارے پھرتے۔ امیر خسرو نے کتنی جگہ ملازمت کی، اور کتنی جگہ ایک جگہ سے دوسری جگہ صرف جلب منفعت کے لئے تبدیل ملازمت کر گئے، اور اپنے قدیم وطن کو چھوڑا۔

اردو شاعروں میں میر محمد تقی میر کو غالب سے بھی زیادہ دروازے کھٹکھٹانے پڑے، اور سوائے لکھنؤ کے کہیں نباہ نہ کر سکے۔ غالب کو بھی انھیں لوگوں میں سمجھئے۔

دوسرا اعتراض غالب پر یہ ہے کہ انھوں نے وطن اور بیوی اور اعزا کی شکایت کی اور ان سے اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ ان امور کے متعلق گزارش یہ ہے کہ وطن کیا اگر جنت بھی ہو تو ہر آدمی خصوصاً شاعر جو ایک آزاد طبیعت سے کم نہیں ہوتا ایک جگہ رہتے رہتے کیوں نہ گھبرا جائے۔ خصوصاً جبکہ وطن میں آمدنی محدود ہو اور ضروریات میں اضافہ۔ رہ گئیں بیوی وہ جداگانہ طبیعت رکھتی تھیں، یہ رند وہ نیک۔ ان کی آمدنی میں کوئی حصہ نہ تھا بلکہ کچھ اضافہ ہوتا ہے، وہاں انھوں نے پنشن بھی اپنے نام کرالی تھی۔ پھر اعزا کی کفالت اور کنبہ پروری کہاں سے ہوتی۔

غالب کی فحش کلامی۔ غالب نے غصے میں جو فحش الفاظ استعمال کئے ہیں وہ عام و خاص خصوصاً مذاق سلیم رکھنے والے لوگوں کے نقطۂ نظر سے نہ صرف کریہہ بلکہ غیر شریفانہ ہیں۔ مگر دہلی کے عام مذاق سے کچھ زیادہ نامناسب نہیں ہیں۔ وہاں کے لوگ باہم مزاحیہ طور پر ایسے الفاظ استعمال کرنے کے اکثر خوگر تھے اور ماشاء اللہ سودا اور انشا کے فواحش سخن کو دیکھ کر غالب کا یہ جرم خفیف سمجھنا چاہئے۔ یوں بھی طعن و تشنیع کے پیہم سلسلے نے غالب کے غم و غصہ کے شعلوں کو اس قدر بلند کر دیا تھا کہ ان کی زبان قابو میں نہ رہ سکی۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ غالب سے زیادہ میر کو فلاکت نے در بدر پھرایا تھا۔ اور حوادث روزگار نے جو صدمات

تیر کو یہ پہنچائے تھے وہ غالب کو نہ پہونچے تھے۔ لیکن یہ طبیعتاً صدمات کے اثر کو دل میں جذب اور ضبط کرتے رہتے اور غالب میں اس قدر نفسی قوت نہ تھی۔ بیشک اُن کا یہ جرم کہ انھوں نے قتیل کی روح تک کو غیر مہذب الفاظ کے شعلے پہونچائے قابل معذرت یا قبول معذرت کے قابل نہیں ہیں۔ پھر بھی جس طرح انھوں نے قتیل کی روح کو صدمہ پہونچایا ہے ہم کو مناسب نہیں کہ ہم غالب کی روح کو ترشتہ کریں۔

کلام غالب کے ادبی کارنامے چار شکلوں میں ہیں، اُردو نثر۔ فارسی نثر فارسی نظم اُردو نظم۔ اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط ہیں، بہت کم حصہ تقریظوں کی شکل میں ہے، جیسے فسانۂ عجائب سرور کی تقریظ، جو کہ بالکل اُسی رنگ میں ہے جس رنگ میں فسانۂ عجائب ہے۔ اور یہ طرز عبارت اُس زمانہ کا بہترین اور پُرکار نقش انشا سمجھا جاتا ہے، جو بعد کو سادہ لباس میں تبدیل ہوا، اور جس کے اعلیٰ ترین مناظر یہ خواجہ درد کے سہل ممتنع اشعار میں سب سے بلندی پر نظر آتے ہیں۔ ان دونوں کے بعد غالب کی اُردوئے معلیٰ ہے، اور ذوق و آتش کے کلیات ہیں۔

غالب کی فارسی نثر، جو کلیات نثر فارسی کے نام سے طبع ہو گئی ہے۔ ان کی فارسی نثر و نظم خسرو کے بعد نقش ثانی فخر ہندوستان ہے۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان گلہائے ایران کو ہندیت کے پانی سے غالب نے نہیں سینچا ہے۔

مگر اُردو غزلوں میں اُردو کی بیخ و بنیاد متزلزل کر دی ہے، اگر ذوق و آتش اور خود اُن کے خطوط نہ ہوتے تو اُردو زبان اپنی ترقی اور صناعی و لطافت کی شاہراہ سے گمراہ ہو کر منزل تکمیل سے منحرف ہو جاتی۔ انھوں نے اپنی اُردو شاعری کا اصل اصول یہ رکھا تھا کہ جس قافیے کے ماتحت اُن کو ایسا جدید اور لطیف مضمون مل جاتا تھا کہ شعر ممتنع ہو کر نظم ہو جائے اس میں کوئی اخلاق یا ترکیب فارسی نامانوس داخل نہیں کرتے تھے، اور اگر ایسا مضمون نہیں ملتا تھا تو شعر کو عام سطح سے بلند کر کے ایسی پیچیدگی ڈال دیتے تھے اور الفاظ اس قدر ثقیل کر دیتے تھے کہ خواہ مخواہ الزر یہ مرد آدمی معلوم ہو۔ ان ہی وجہ کہ دیوان میں دو رنگ کے اشعار ہیں جو بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں یہ فارسی ٹکڑے اُردو زبان کے راستے میں روڑے بن گئے ہیں، چونکہ شعر کی تمام لطافتیں، نزاکتوں اور تاثیر و کیفیت شعری کا دار و مدار زبان کی خوبی اور فصاحت ہے۔ جس شعر کے اثر اور پر محل الفاظ کی حقیقت اور فلسفے پر غور کیجئے گا تو اُس کی تہ میں زبان کی خوبیاں پوشیدہ نظر آئیں گی۔

خود غالب نے اپنے اس رنگ کے اشعار میں بے کیفی محسوس کر لی تھی۔ اور ایک مرتبہ ذوق پر ظاہر بھی کر دیا تھا کہ میں اپنے اس ادبی نقص سے ناواقف نہیں ہوں۔ ع یکسر از گلدستۂ اُردو کہ بیرنگ من است۔

یہ بیرنگی صرف اس وجہ سے تھی کہ اُردو بچہ کے حلق میں فارسی کے ٹکڑے اور سخت ذائے ٹھونسے گئے جو اس قدر ثقیل تھے کہ چالیس سال کے بعد ہضم ہوئے اور اب اُن کی قدر ہوئی، مگر قدر کرنے والے ایں

جو شعرا مقلدِ غالب ہو گئے اُن کو نہ تو یہ قابلیت ہے کہ جہاں فارسی ترکیب غلط یا صحیح استعمال کر کے شعرا عام سطح سے بلند کیا ہے، وہاں غالب کی پوری تقلید کر کے غالب کے ایسے سہل ممتنع شعر اور نادر الوجود مضامین ابھی پیدا کر کے دکھاتے۔ ورنہ تقلیدِ مہمل سے بجز تحصیل مہمل اور کیا حاصل۔ اور اُردو کی تخریب گھاتے میں۔ مگر ہندوستان میں کچھ ایسے بھی مقلدِ غالب ہوئے ہیں جو وحشت (کلکتہ) اور صفی لکھنوی کی طرح فارسی کی صحیح ترکیبوں تک غالب کی تقلید محدود رکھتے ہیں اور جدت اور تجدید بھی رکھتے ہیں۔ بہرحال غالب کی فارسی نما اُردو نے اُس وقت غالب کو ذوق کے مقابلے میں ناکام رکھا۔ اُدھر نوجوان اور شوخ مزاج شاعروں نے مہمل ہکڑیے اور مضحک پیوند لگا کے اشعار جوڑے اور غالب کو چڑھانے کے لئے اُن کے سامنے پڑھے اور تمسخر کر کے اُن کو جلایا۔

اُردو کلام کی تو یہ گت ہوئی اور فارسی کا یہ حشر ہوا کہ باوصف کمال و کامیابی اُن کی عدم ہر دلعزیزی کا ایک سیلاب دہلی سے بنگال تک پھیل گیا، ہر طرف سے لے دے ہونے لگی، ہر طرف اعتراضوں کے طومار حملوں کی آندھیاں اور نفرت و عداوت کے شعلے اُٹھنے لگے۔ اتنا بڑا کامل فن جس نے اُردو میں ایسے شعر کہہ دیے کہ لاکھوں مقلد منہ چڑھاتے ہی رہ گئے مگر ایک شعر بھی اس رنگ اور اس ترکیب کا نہ کہہ سکے جس میں غالب نے پچاسوں شعر کہہ دیے۔ بہرحال تمام دنیا نے اس یکتائے روزگار کی دشمنی پر کمر باندھ لی۔ اس کے کیا اسباب ہیں۔ ہم کو مرد ـ اسے اُن اسباب کی تلاش کرنا چاہیے کہ ہم اور ہمارے ہم خیال اِن بلاؤں میں مبتلا نہ ہوں۔

غالب کی ذہنیت اپنے کلام کے بارے میں یہ تھی کہ اُن کی فارسی قابلیت الہامی ہے اور دوسروں کی اکتسابی جیسا کہ اُن کے اشارات سے ظاہر ہے

ع "ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب"

ع "جوابِ خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب"

اس کے متعلق غالب کو اپنے اوپر اعتماد ہو گیا تھا جس کا اظہار صرف شاعری ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ خطوط میں بے شمار مقامات پر اُنھوں نے اپنی خود اعتمادی اور "انا ولا غیری" کو صاف صاف ظاہر کیا ہے۔ ان باتوں سے دو خرابیاں پیدا ہو گئیں، اول یہ کہ خود ستائی کا قدرتی خاصہ یہ ہے کہ لوگوں کو نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور عام طبیعتیں نکتہ چینی کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ دوسری بلا یہ نازل ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص اپنے آپ کو سب سے اچھا سمجھتا ہے تو وہ دوسروں کی زیادہ تحسین و شہرت سنتا ہے تو رشک و حسد اور صدمہ و ملال پیدا ہوتا ہے جب اُس کی اور ترقی ہوتی ہے تو ایک ہنگامۂ عظیم برپا ہوتا ہے، اپنے آپ کو غم و غصہ اور کوفت، دوسروں کو تنبیہ و عداوت حسد رشک کی بیماری لکھنؤ میں قتیل کی قابلیت قدر دانی کی نگاہ سے دیکھنے کے قابل سمجھی گئی تھی بنگال

کے قاضی محمد اختر خاں جن کو غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا قتیل کے شاگرد ہوئے اُدھر مولوی غلام امام شہید حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے اور یہ سلسلہ تمام ہندوستان میں پھیل گیا۔

برہان قاطع کے مصنف نے اپنے دیباچہ میں جو ماخذ اپنے لغات کے تحریر کئے ہیں اُن میں میرزا قتیل کی چار شربت کا بھی نام لیا ہے۔ غیاث الدین نے غیاث اللغات لکھی تو انھوں نے بھی تصانیف قتیل کے حوالے دئیے۔ یہ سلسلہ صرف یہیں تک محدود نہیں رہا بلکہ صدہا دوست حتیٰ کہ غالب کے شاگرد اور معتقد بھی قتیل کے معترف نظر آنے لگے۔ غالب جب کلکتہ گئے تو وہاں بھی اُردو میں اختر او فارسی میں قتیل کا آوازۂ شہرت اس قدر بلند تھا کہ ہر آواز تحلیل ہو کر فانی و نامسموع ہوجاتی تھی۔

ہر طرف کی نااُمیدی پر غالب کے غم و غصہ نے اُنھیں بدمزاج اور بدزبان بناکر عام نفرت و دشمنی پھیلادی۔ ایسے حوادث میں اگر شاعر کے دماغ میں شعر و شاعری سے کوئی گوشہ بچ رہتا ہے تو وہ موقع کی نزاکت اور زمانہ کی ناسازگاری کو دیکھکر تحمل و درگزر کرتا ہے۔ غالب نے ایسا نہیں کیا بلکہ یہ گمان کیا کہ قتیل کو نالائق اور ناقابل بنانے سے لوگ مرعوب و مغلوب ہوکر غالب کو غالب سمجھیں گے۔ مگر اس کا نتیجہ بھی اُن کی اُمید کے خلاف نکلا اور اُن کے خلاف ایک عام نفرت و عداوت پھیل گئی۔ آخر کار اُنھوں نے وہ کام جو پہلے کرنا چاہئے تھا بعد کو کیا یعنی اپنی سخت مزاجی کی کمان اُتاری اور جس طرح ذوق کے مقابلہ میں سہرے کی بنا پر ایک معذرت نامہ اُردو میں نظم کیا تھا اُسی طرح کی ایک نظم کلکتہ میں پڑھی۔ لیکن لوگوں پر اس کا زیادہ اثر اس لئے نہیں ہوا کہ اس سے پہلے برہان قاطع کے قصہ کو طول ہوچکا تھا اور اس فارسی نظم میں بھی قتیل وغیرہ کی توہین کا پہلو نمایاں تھا چنددر چند شعروں میں اہل فن متقدمین علیہ الرحمہ کو ناشائستہ الفاظ میں بُرا بھلا کہا گیا تھا۔

ان عبرت انگیز واقعات سے نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا میں ہر علم و فن اور کمال و کامیابی سے حسن اخلاق ضروری ہے اور اگر بداخلاقی و بدمزاجی شریک حال ہوتی ہے تو کوئی علم کوئی ہنر کوئی کمال کام نہیں آتا، سب کچھ خاک میں مل جاتا ہے۔

اعتراضات۔ غالب نے جو اعتراضات قتیل پر کئے ہیں انوری صاحب نے اُن کے جوابات دئیے ہیں جن پر اب میں ایک اجمالی نظر ڈالتا ہوں۔

(۱) قتیل کی قابلیت پر غالب کا اعتراض یہ ہے کہ قتیل کی نظر ایرانیوں کے کلام پر کافی و وافی نہیں۔

میری رائے میں اس اعتراض کی تردید قتیل کے تصنیفات سے بوجہ احسن ہوتی ہے، کیونکہ چار شربت، شجرۃ الامانی اور دیگر تصنیفات و کتب قواعد کوئی شخص لکھ ہی نہیں سکتا جب تک کہ اہل ایران کے کلام پر وسیع نظر نہ رکھتا ہو۔ اور حالات حیات قتیل سے معلوم ہوتا ہے کہ قتیل کی عمر کا زیادہ حصہ شبانہ روز ایرانیوں کی صحبت اور تحصیل زبان میں گزرا ہے۔ اسی لئے وہ ایران گئے، اسی لئے مسلمان ہوئے، ایرانیوں کی مصاحبت کا اثر جس شخص کے دین و مذہب

دخل کا مدار بڑا اس کی زبان پر کہاں تک نہ پڑا ہوگا۔ ایسی حالت میں غالب کا یہ دعویٰ بے دلیل قابل قبول نہیں قتیل اور غالب میں یہی بحث کتاب کی جان تھی حالانکہ اسی بحث کو لوگ سہل انگاری سے نظر انداز کر گئے۔

۲۔ غالب کا دوسرا الزام یہ ہے کہ قتیل کی ادبی معلومات کا ماخذ اور منبع ایرانیوں کی گفتگو ہے۔ جو کہ روا روی میں غلط سلط سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔

گو یہ بات سچ ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں کہ قتیل کی تمام معلومات ایرانیوں کی صرف تقریر او گفتگو سے مکمل ہوئی ہے۔

۳۔ غالب نے بگردل تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ "یہ اُلّو کا پٹھا قتیل صفوت کدہ و شفقت کدہ و نشتر کدہ، و ہمہ جا، ہمہ عالم، کو غلط کہتا ہے۔

(۱) اس عبارت میں دو اعتراض ہیں: قتیل نے صفوت کدہ اور نشتر کدہ کو غلط بتایا ہے۔

(۲) ہمہ عالم و ہمہ جا کو قتیل نے ناجائز قرار دیا ہے۔

یہ دونوں الزام قتیل پر بہتان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ کیونکہ نہ تو انھوں نے (قتیل نے) کہیں صفوت کدہ اور نشتر کدہ کا نام لیا ہے اور نہ ہمہ عالم و ہمہ جا کو کہیں غلط بتایا ہے۔ ان اعتراضوں کی ماخذ قتیل کی یہ عبارت ہے۔

> کدہ بمعنی خانہ باشد۔ پنج لفظ تحقیق شدہ سوائے آن مسموع نیست بُتکدہ، غمکدہ، آتش کدہ، میکدہ، گلشن کدہ، وغیرہ آں چوں آب کدہ، نمی دانم درست یا نادرست است یعنی اینہا اصول اند و سوائے این فروع و فروع در حسن داخل است چوں حیرت کدہ، سنبل کدہ، ویراں کدہ، حسرت کدہ، ماتم کدہ، راحت کدہ، تغافل کدہ، جنوں کدہ، و بہشت کدہ ہر دو در گلشن کدہ داخل است۔ اگر گلشن جائے گل معنی یہ، و ہم کدہ و عشرت کدہ و محنت و غم کدہ داخل اند در مقصود نیست الخ

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ پانچ لفظ اصول اور باقی الفاظ جو کدہ کے ساتھ مرکب ہیں وہ فروع ہیں اور یہ بھی اصل میں داخل ہیں یعنی ان کا استعمال کرنا بھی جائز ہے۔

قتیل نے یہ نہیں لکھا ہے کہ صفوت کدہ اور نشتر کدہ وغیرہ غلط ہیں۔ مگر میں قتیل کی اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ پانچ لفظ اصول ہیں سوائے اس کے مسموع نہیں ہے۔ مسموع کے بارے میں حسب ذیل گزارش ہے:۔

تسکین کدہ ۔ وحشی دانش :۔

کعبۂ تسکین کدہ و یار تسلی گاہ ست   نالہ سر کن ہمہ جا خانۂ فریاد رس ست

جنگ کدہ ۔ سراج الدین خاں آرزو :۔

دریں جفا کدہ: از کس مجوے رنگِ ثبات ۔۔۔ کہ نقلِ اشک ہم اینجا بہ نالہ بر جائیست

پروین کدہ: حکیم زلالی:-

دریں پروین کدہ چنداں بمانم ۔۔۔ کہ شعرے چند بر شعرے فشانم (ستارہ)

پریشاں کدہ: جلال اسیر:-

دریں پریشاں کدہ یاس بود فیض وصا ۔۔۔ سایۂ بید خوش آیند شمالے دارد

(بہارِ عجم)

مجھے اصول و فروع کی تقسیم سے بھی اختلاف ہے۔ غالب نے جو نشتر کدہ، صعوبت کدہ و شہرت کدہ کے متعلق لکھا ہے کہ قتیل ان الفاظ کو غلط بتاتے ہیں۔ قتیل نے تو کہیں ان الفاظ کا ذکر بھی نہیں کیا، یہ اس غریب پر تہمت ہے بلکہ انھوں نے تو صاف لکھ دیا ہے کہ حصر مقصود نہیں ہے۔ میں نے سامنے نشتر الفاظ کدہ سے مرکب دیکھے ہیں، نہ تو ان میں یہ الفاظ ہیں اور نہ میرا ذاتی ذوق ان الفاظ کو قبول کرتا ہے جب تک کسی ایرانی کے کلام میں دیکھ نہ لوں۔

۴۔ غالب کا چوتھا اعتراض یہ ہے کہ قتیل نے نثر مسجع و عاری کی تعریف غلط بتائی ہے، حالانکہ خود غالب نے بقول انوری صاحب عبدالغفور کے نام ایک خط میں وہی تعریف لکھی ہے جو قتیل نے چار شربت میں لکھی ہے اور جو صحیح ہے۔ یعنی نثر مسجع وہ نثر ہے جس کے فقرے مقفیٰ ہوں، مرجز وہ ہے جس کے ہر دو فقرے ہم وزن ہوں، اور نثر عاری میں نہ قافیہ کا التزام ہوتا ہے نہ وزن کا۔ اس کی تفصیل "قتیل اور غالب" کے صفحات ۳۰، ۵۵، ۵۷ پر ناظرین ملاحظہ کریں۔

۵۔ اس کے بعد ایطا کی بحث ہے، غالب نے قتیل پر اعتراض کیا ہے کہ قتیل کہتا ہے کہ ایطاء جلی وہ ہے کہ بات تأمل ظاہر ہو جائے اور ایطاء خفی غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خود غالب نے یہ تعریف کی ہے کہ مطلع میں ہو تو ایطاء جلی ہے اور غزل یا قصیدہ کے اشعار میں موجود ہو تو خفی ہے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ غالب کی تعریف ایطاء جلی و خفی غلط ہے اور قتیل کی تعریف صحیح ہے مگر تفصیل نہیں کی ہے۔ ایطاء کی صورت یہ ہے کہ مطلع میں اس وقت ایطاء ہوگا جب دونوں قافیوں کے حروف مکرر جو ماقبل روی ہوتے ہیں، اگر علٰحدہ کر دیں تو دو لفظ با معنی رہ جائیں اور باہم مقفیٰ نہ ہوں جیسے ایک مصرع میں گلستاں ہو اور دوسرے میں بوستاں دونوں قافیوں میں 'ستاں' مکرر ہے، دونوں کو جدا کرنے کے بعد ایک 'گل' رہ جاتا ہے دوسرا 'بو'، یہ دونوں لفظ با معنی ہیں اور باہم مقفیٰ نہیں لہذا ایطاء ہے۔

اشعار میں ایطاء یہ ہے کہ بار بار قافیہ مکرر آئے یا ایسے قافیے آئیں جیسے مطلع میں بیان کئے گئے۔ گلستاں، بوستاں، شبستاں وغیرہ۔ ایطاء خفی کی صورت یہ ہے کہ بقول قتیل، اشم زدہ، مثلاً اٹھاتا ہے

دکھاتا ہے۔ وہاں 'اُٹھ' رہ گیا، یہاں 'دُکھ' رہیگا۔ دکھ، وضاحتاً کوئی لفظ معنی دار نہیں ہے۔ مگر چونکہ اصل میں نہ دیکھا ہے اور یہ معنی دار ہے تعلیقاً 'دکھ' بنایا گیا اس لئے ایطا خفی ہے۔

اُردو شعرا صرف مطلع میں ایطاء سے احتیاط کرتے ہیں۔ بقیہ اشعار میں ایطاء کی پروا نہیں کرتے ہیں۔ عربی میں جائز ہے کہ ایک مصرع میں معرفہ ہو اور دوسرے میں نکرہ۔ جیسے رجل، الرجل۔ اور عربی میں علامات نحوی نکالنے کے بعد اگر با معنی لفظ بچے اور دونوں باہم قافیہ ہوں تو بھی ایطاء ہے جیسے شائق و عاشق۔ الف علامت فاعل نکالنے کے بعد شوق، اور عشق رہ جاتا ہے۔ لہٰذا ایطاء ہے

غالب نے قتیل پر آٹھ اعتراضات کیے ہیں جن میں سے صرف ایک اعتراض صحیح ہے باقی غلط ہیں۔ اور وہ یہ کہ قتیل نے فارسی میں ایک جگہ اُردو کا محاورہ ترجمہ کر دیا ہے۔ ؎

یک وجب جائے بکوئے تو زخوں پاک نبود ‏ ‏ ‏ ‏ کشتہ بر کشتہ تپاں بود و گر خاک نبود

'تپیدن نبود' کی جگہ 'خاک نبود' قتیل نے لکھا ہے۔ یہ ہندوستان کا محاورہ ہے نہ کہ ایران کا۔

اس محاورہ کی غلطی کو انوری صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے۔ دیگر حضرات تبصرہ نگار انھیں اعتراضات اور جوابات کو نظرانداز کر گئے ہیں۔ حالانکہ انھیں پر محاکمہ کی ضرورت تھی۔

قتیل پر جو اعتراضات غالب کی طرف سے ہوئے ہیں اُن کے جوابات دینے کے بعد سید اسمٰعیل صاحب نے غالب کے چند اُردو اشعار پر شبہات وارد کیے ہیں جن میں سے بعض غلط ہیں اور بعض صحیح، مگر اس کا ذکر کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا۔ اس سے زیادہ ضروری مسئلہ کتاب کے آخر میں ایک طویل بحث اہل زبان اور زبان دان کے متعلق ہے جس پر غالب اور حالی نے بھی بہت کچھ لکھا ہے اور انوری صاحب نے بھی۔ یہ مسئلہ ہندوستان میں مدتوں سے معرکۃ الآرا رہا ہے۔ اس لئے میں اسی بحث پر اپنے تبصرہ کو ختم کروں گا۔

ہر ملک میں ایک دو شہر ایسے ہوتے ہیں جہاں دارالحکومت کی قدامت کی وجہ سے اہل علم و ادب جمع ہو کر زبان کی اصلاح اور ترتیب کرتے ہیں ان مقامات پر تمام ملک کے علما و ادبا جمع ہوتے ہیں اور یہیں رہ جاتے ہیں ان کے اہل و عیال اور یہاں کے باشندے جو ان علوم سے ذوق و مناسبت رکھتے ہیں وہ اہل زبان کہلاتے ہیں اُن کے اقوال و محاورات مستند سمجھے جاتے ہیں اور نظیر میں پیش ہونے کے قابل ہوتے ہیں مثلاً ایران میں اہل زبان شیراز اور اصفہان مانے گئے ہیں۔ اور دوسرے شہروں کے ادبا ان کے مقلد تھے۔ مگر اہل زبان نے اُن کو تسلیم کیا ہے ہزاروں کا شمار بھی انھیں میں رہا ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی اُردو زبان کے معیار کا مجمع پہلے دہلی میں رہا اور اس سے قبل آگرہ میں بھی تھا۔ مگر اس وقت تک [illegible] سلطنت [illegible] اس سے پہلے دکن

میں بھی اُردو شاعری کا زور شور رہا۔ لیکن یہاں زبان کی اصلاح اور ترمیم نہ ہوئی۔ ہر شاعر مابعد اپنے ماقبل کا مقلد رہا۔ تصرّف اور ترمیم سے ڈرتا تھا۔ مگر جب لکھنؤ میں ہندوستان بھر کے ادیب جمع ہوئے خصوصاً دہلی اور آگرہ کے سخنورانِ کامل تو ان سب نے مل کر اُردو کے صدہا قابلِ ترک الفاظ چھوڑ دیئے اور ہزاروں کی تقلیل کرکے اُن کو فصیح بنایا۔ جیسے "میرے کو" سے "مجھکو" "کرا" سے "کیا"۔ اور "آوے" سے "آئے" بنا کر استعمال کیا۔ یہی اصلاح شدہ الفاظ اور ترقی یافتہ زبان لکھنؤ میں ہر عالم اور جاہل بولتا ہے۔ ہر لکھنوی اور غیر لکھنوی شاعر کا ماحول یہی ہے نہ کوئی اس کے خلاف سنتا ہے نہ بولتا ہے۔ دوسرے شہروں میں اب تک وہی قدیم زبان بولی جاتی ہے۔ مگر ہند کے اُردو مصنف اپنے تصانیف میں بھی لکھنوی زبان جو اصلاح یافتہ ہے استعمال کرتے ہیں۔ ان ہی اسباب سے لکھنؤ کے ادیب اہلِ زبان مانے جاتے ہیں۔ اور دہلی چونکہ لکھنؤ کا ماخذ ہے اس لئے وہ بھی ادباء کا زاد بوم تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس بحث میں دو باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ اول یہ کہ اگر دہلی اور لکھنؤ کو اہلِ زبان اور مستند نہ مانا جائے تو ہر شہر بلکہ ہر قصبہ اور ہر گاؤں یہ دعویٰ کر سکے گا کہ ہماری زبان ہے۔ ہمارے یہاں کا محاورہ یہی ہے۔ اُس کے اس دعوے کا کوئی جواب نہ بن پڑے گا۔ کیونکہ جب تک مرکز نہ ہوگا زبان کی غلطی و صحت کا کوئی معیار نہ رہے گا۔ اس لئے مرکز اور اہلِ زبان کا ماخذ کسی نہ کسی شہر کو ضرور معین کرنا ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اہلِ زبان اُسی کو کہہ سکتے ہیں جو زبان داں بھی ہو۔ یعنی ادب پر اُس کی نظر بلکہ مزاولت ہو۔ اہلِ زبان کا ہر ہم وطن اہلِ زبان ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ تمام اہلِ زبان اُن زباندانوں کے ممنون و مرہونِ منت ہیں جنہوں نے لغات و قواعد اور ہزاروں ادبی و علمی کتابیں تصنیف کرکے اہلِ زبان کو بھی خاطر خواہ فائدہ پہونچایا ہے۔

نومبر ۳۶ء

غالبؒ

(از حضرت روشؔ صدیقی)

فروغِ انجمنِ عشق ہے کلام ترا
ربابِ شوق کو مضراب ہے پیام ترا
چھلک رہا ہے مے آرزو سے جام ترا

وہی نسیمِ غزل کیف بار اب بھی ہے
ترے چمن میں خراماں بہار اب بھی ہے

دیا وہ کیف تجھے زندگی کی صہبا نے
کہ جس کی موج سے برہم ہزار میخانے
خودی فروز تری بیخودی کے افسانے

شکستِ ہوش سے تجھکو عجب سرور رہا
خود اپنی گم شدگی پر تجھے غرور رہا

جھکی ہوئی سی تھی کچھ چشمِ نیمخوابِ غزل
فقیہِ شعر سے اٹھتا نہ تھا نقابِ غزل
پھر ایک بار تھا خاموش سا ربابِ غزل

کہ تو نے حسنِ تغزل کو بے حجاب کیا
سکوتِ شوق کو مانوسِ اضطراب کیا

بسائے نرگسِ اردو میں تو نے خواب کچھ اور
بڑھائے گیسوئے پُرخم میں پیچ و تاب کچھ اور
اُٹھا اُٹھا کے گرائے بھی ہیں حجاب کچھ اور

جمالِ شعر کو تمکیں فروز تو نے کیا
صدائے ساز کو ہم رنگ سوز تو نے کیا

کہیں تصوّرِ روئے نگار کا عالم
کہیں نشاطِ غمِ انتظار کا عالم
ہر اک سکوں میں نہاں اضطرار کا عالم

گدازِ عشق کی تصویر ہے غزل تیری
کتابِ درد کی تفسیر ہے غزل تیری

تباہِ شکوۂ ماضی و حال تھا ہر چند
خرابِ کیفِ نشاط و ملال تھا ہر چند
اسیرِ حلقۂ دامِ خیال تھا ہر چند

مگر جہاں بھی رہا تو بہت بلند رہا
فلک کو شکوۂ کوتاہیِ کمند رہا

ترا سرور رہا کیفِ غم سے محرم بھی
لبوں پہ موجِ تبسم بھی، چشمِ پُرنم بھی
ہے سوزِ برق بھی تجھ میں گدازِ شبنم بھی

رخِ نشاط کو اشکوں سے تو نے پاک کیا
مذاقِ درد کو کچھ اور تابناک کیا

تری نظر کبھی بربادِ امتیاز نہیں
تری مرادِ صنم خانۂ مجاز نہیں
تو راز داں ہے، اسیرِ حجابِ راز نہیں

خودی میں بھی نہ ہوا ذوقِ بیخودی سے جدا
کیا نہ مرگ نے بھی تجھ کو زندگی سے جدا

زمانہ ستمبر سنہ ۳۰ء

مثنوی

حالنامہ

گوی و چوگاں

تصنیف

عارفی ہروی

(م۔ ۹۵۰ھ)

مدوّن

ڈاکٹر متین احمد صبا



معروف فارسی شاعر عارفی هروی کی معروف ترمثنوی گوی وچوگان یا حالنامہ ایک متصوفانہ تمثیلیہ ہے۔

عارفی تیمور کے بیٹے شاہ رخ کے عہد کے مشاہیر میں شمار ہوتے ہیں، ان کی وفات طبقات شاہجہانی کے مصنف نے ۱۴۴۹/۸۵۳ھ لکھی ہے۔ چارلس ریو (برٹش میوزیم) نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔

مثنوی "گوی وچوگان" میں جتنی بار اور جس جس طور سے گوی اور چوگان کا ذکر ہے، اور جس طور سے تانابانا ان دو کے گرد بُنا گیا ہے، اس کے پیش نظر اس کا نام اس کے علاوہ اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ (گوی وچوگان قدیم بادشاہوں اور امیروں کا دل پسند کھیل تھا۔ آج کے پولو کے کھیل سے ملتا جلتا) لیکن بعض نسخوں میں اس کا نام 'حالنامہ' بھی ملتا ہے۔

یہ مثنوی جو ۱۴۳۸/۸۴۲ھ میں لکھی گئی (گوی خور" سے تاریخ نکلتی ہے)

خدابخش لائبریری میں اس کے دو قدیم نسخے موجود ہیں، ان میں سے ایک تو مشہور کاتب میر علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا بھی خوبصورت نسخہ ہے اور لگ بھگ اسی عہد کا ہے۔ (اشعار ۶۰۲) بقول شاعر مثنوی ۵۰۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ لیکن علی الکاتب کے لکھے ہوئے متن میں ۴۹۵ اشعار ہیں۔ علی الکاتب کا نستعلیق کتابت کے مشاہیر کاتبوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کی وفات ۱۵۴۵/۹۵۰ھ کے آس پاس ہوئی۔ (استفادہ: عبدالمقتدر، خدابخش لائبریری کیٹلاگ، جلد ۲، ص ۱۰۱-۲۳) علیگڑھ میں بھی علی الکاتب کا لکھا ہوا گوی وچوگان کا ایک نسخہ محفوظ ہے، جسکا تعارف ڈاکٹر مختار الدین احمد نے کرایا تھا، یہ ۹۲۶ھ کا مکتوبہ ہے۔

خان بابا مشار (فہرست کتابہای چاپی فارسی) کی تحقیق کے مطابق ۱۳۱ صفحات پر مشتمل یہ مثنوی ایک بار لندن سے ۱۹۳۱ء میں گوین سنز کے اہتمام میں شائع بھی ہو چکی ہے۔ (ص: ۴۳۴۲)

ڈاکٹر متین احمد صبا نے خدابخش لائبریری کے دونوں نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک متن تیار کیا ہے اور چونکہ دونوں نسخے خاصے قدیم ہیں اور بہت اہتمام سے لکھے ہوئے ہیں، یعنی متن بڑی حد تک قابل اعتماد سمجھا جاسکتا ہے، اس لیے یہ محدود تدوین بھی معتبر سمجھی جاسکتی ہے۔

ع ر



"حالنامہ" مولانا عارفی ہروی کی ایک عارفانہ تمثیلی مثنوی ہے اور فارسی شاعری میں مناظرہ گوئی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ موضوع بحث کی مناسبت سے یہ "گوی و چوگان" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ایک نہایت عمدہ اور قدیم قلمی نسخہ کتاب خانہ خدا بخش، پٹنہ کے قلمی ذخیرہ میں محفوظ ہے جس کا نمبر شمار فارسی ۴۳۶ ہے اور یہی میرے اس مرتبہ مثنوی کی بنیاد ہے۔ اس نسخہ میں سال کتابت درج نہیں ہے، فہرست نگار نے لکھا ہے کہ اس کا کاتب دور صفویہ کا مشہور و معروف خطاط میر علی ہے۔ چوں کہ میر علی کے انتقال کی تاریخ ۹۵۰ھ ہے اس لیے یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس مخطوطہ کی کتابت ۹۵۰ھ سے قبل عمل میں آئی ہوگی، پروفیسر براؤن کے بیان کے مطابق 'حالنامہ' کا ایک عمدہ نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری لندن میں ہے جو ان کی نگاہ سے گذرا ہے۔ یہ نسخہ ۱۵۴۶ء/۹۵۲ھ میں تحریر ہوا ہے، میری اطلاع کے مطابق، سالار جنگ میوزیم لائبریری، حیدر آباد میں اس کے پانچ قلمی نسخے محفوظ ہیں جن میں ایک ۲۲ جمادی الاول ۹۸۲ھ کا تحریر کردہ ہے اور دوسرے پر سن کتابت ۹۸۹ھ تحریر ہے، اس طرح دریافت شدہ نسخوں کی سال تحریر کی روشنی میں کتاب خانہ خدا بخش کا متذکرہ بالا مخطوطہ سب سے قدیم قرار پاتا ہے اور اہمیت کا حامل ہے۔

چوں کہ یہ مثنوی ہنوز شائع نہیں ہوئی ہے اور اہل نظر کی نگاہ سے پوشیدہ ہے نیز فارسی میں مناظرہ گوئی کی روایت اور اس کے ارتقا کی تاریخ میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے اس کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کا خیال دل میں پیدا ہوا۔ اس مثنوی کی نقل اور مطالعہ کے دوران ایک اور قدیم نسخہ کا علم ہوا جو "گوی و چوگان" کے نام سے اسی کتاب خانہ کی زینت ہے اور اس کا نمبر شمار ۱۸۶۱ ہے۔ مثنوی کی ترتیب و تدوین کے لیے ان دونوں نسخوں سے باہم مقابلہ کا مسئلہ در پیش تھا۔ محب محترم ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ سے جب میں نے رجوع کیا تو انھوں نے نہایت گرم جوشی کا اظہار فرمایا اور ازراہ محبت اور

قدرافزائی میری الجھن کو آسان کر دیا، نیز مخطوط موسوم بہ "گوی و چوگان" کی ایک عکسی کاپی مجھے تحفتاً ارسال فرمائی۔ موصوف کی اس علم دوستی اور کرم فرمائی کے لیے ان کا سپاس گذار ہوں۔ ان دونوں قلمی نسخوں کے تقابلی مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ ان کے متن میں نہ صرف لفظی اختلافات ہیں بلکہ اشعار کی تعداد، ان کی ترتیب، مصرعوں کی تقدیم و تاخیر اور مختلف عنوانات کے الفاظ میں بھی نمایاں فرق موجود ہے۔ مرتبہ مثنوی میں ان دو مختلف نسخوں کے مقابلہ کے دوران جو اختلافات سامنے آئے ہیں انھیں حاشیہ میں تفصیل سے درج کر دیا گیا ہے۔ تعداد اشعار کے اعتبار سے کوئی نسخہ مکمل نہیں ہے۔ داخلی اور خارجی شواہد کی روشنی میں پیش کردہ انتخاب مکمل شکل میں آپ کے سامنے ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

حاشیہ میں جہاں کہیں نسخہ "الف" آیا ہے اس سے مراد مخطوط "حالنامہ" نمبر شمار ۳۶۴ اور نسخہ "ب" سے مراد مخطوط "گوی و چوگان" نمبر ۱۸۶۱ ہے۔

کچھ عارفی کے بارے میں

نویں صدی ہجری آلِ تیمور کی فرمانروائی کا دور ہے۔ اگرچہ یہ زمانہ ایرانی تاریخ میں ظلم و بربریت اور قتل و خونریزی کے المناک دور سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن فارسی شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کو اس دور میں جو نمایاں فروغ حاصل ہوا وہ اس عہد کی تاریخ کا زرّیں عنوان ہے۔ امیر تیمور کے بعد اس کا بیٹا شاہ رخ مرزا (۸۰۷ — ۸۵۰ھ) تختِ سلطنت پر متمکن ہوا۔ وہ نہایت کریم النفس، نیک خو اور علم دوست تھا۔ علما، فضلا اور شعرا کا بے حد قدردان تھا، فارسی زبان و ادبیات کی ترقی و ترویج سے اسے گہری دلچسپی تھی۔ اس کا بیٹا بایسنغر (م۔ ۸۳۷ھ) بھی فنونِ لطیفہ کا دلدادہ تھا، خوش نویسی میں استادِ کامل تھا، اس کے دربار میں شاعروں، مورخوں، خوش نویسوں اور نقاشوں کا مجمع لگا رہتا تھا، شاہ رخ کے زمانہ میں ادبی رونق کے اعتبار سے شیراز کی جگہ ہرات شعر و ادب کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ اس عہد کے بیشتر اکابر ہرات میں ہی نظر آتے ہیں، جن میں مغربی تبریزی، عصمت بخاری، شاہ نعمت اللہ ولی، قاسم الانوار تبریزی، کاتبی نیشاپوری، کمال خجندی، بساطی سمرقندی اور مولانا جامی صفِ اول کے شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مولانا عارفی ہروی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں جنھیں اس دور کے شاعروں میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

مولانا عارفی کا ذکر اگرچہ اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے لیکن ان کی اطلاع اتنی مختصر اور تشنہ ہے کہ اس سے عارفی کے حالاتِ زندگی پر کوئی تفصیلی روشنی نہیں پڑتی۔ ان کا پورا نام معلوم نہیں، وہ اپنے تخلص عارفی سے

مشہور ہیں۔ ڈاکٹر سعید نفیسی[۱] اور ہرمان ایتھ[۲] نے ان کا نام مولانا محمود اور تخلص عارفی لکھا ہے۔ فہرست مخطوطات کتاب خانہ خدا بخش، پٹنہ کے فہرست نگار نے بھی ان کو مولانا محمود عارفی ہی لکھا ہے۔ البتہ تقی اوحدی نے اپنے تذکرہ میں ان کا نام صرف مولانا عارفی لکھا ہے ساتھ ہی اس غلطی کی بھی نشان دہی کی ہے کہ کچھ لوگوں کو محمود عارفی کے نام سے اشتباہ ہوا ہے اور انھوں نے مولانا عارفی کو محمود عارفی سمجھ لیا ہے جو ایک دوسرے شاعر ہیں اور "دہ نامہ" کے مصنف ہیں۔ تقی اوحدی لکھتے ہیں[۳]:

"واکثر مردم ویرا محمود عارفی مذکور متحد دانند"

مولانا عارفی کے تذکرہ سے پہلے تقی اوحدی نے اسی صفحہ پر محمود عارفی کا بھی ذکر کیا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی، امیر علی شیر نوائی اور مولانا عبدالرحمن جامی نے بھی اپنے تذکروں میں مولانا عارفی ہی لکھا ہے۔ دونوں مستند اور قریب العہد تذکرہ نگار ہیں، اس لیے ان کے بیانات کی روشنی میں تقی اوحدی کا قول ہی قرین صحت معلوم ہوتا ہے۔ مولانا عارفی کی تاریخ پیدائش کا ذکر بھی کہیں تذکروں میں نہیں ملتا، البتہ 'حالنامہ' کی داخلی شہادت کی روشنی میں ان کے سال ولادت کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ عارفی کے قول کے مطابق "حالنامہ" ۱۴۳۸ء/۸۴۲ھ میں لکھا گیا اور اس وقت ان کی عمر ۵۰ سال تھی جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

پنجاہ گذشت سال عمرم — یک نیم شکست بال عمرم
چوگانی نکر آزمودم — گوی سخن از میان ربودم

اس اعتبار سے عارفی ۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ میں ہرات میں پیدا ہوئے جو نا خدائے غزل خواجہ حافظ شیرازی کا سال وفات ہے۔ آقای سعید نفیسی اور پروفیسر براؤن[۴] نے بھی یہی تاریخ لکھی ہے۔ عارفی کے حالات زندگی، ان کے آباد اجداد، تعلیم و تربیت، مشاغل اور دیگر امور پردۂ خفا میں ہیں۔ تذکروں کی ورق گردانی کے باوجود مایوسی کے سوا

---

(۱) تاریخ نظم و نثر ایران، جلد اول طبع ایران۔ ص ۳۰۲
(۲) تاریخ ادبیات فارسی، ترجمہ رضازادہ شفق طبع ایران، ص ۱۸۲
(۳) عرفات العاشقین، قلمی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ
(۴) تاریخ ادبیات ایران، جلد سوم (انگریزی) ص ۴۹۵

کچھ ہاتھ نہ آیا، دولت شاہ سمرقندی، تقی اوحدی اور میر علی شیر نوائی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عارفی اس دور کے ارباب فضل و دانش میں شمار کیے جاتے تھے، شاعری کا نہایت اعلیٰ اور ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ شاہرخ مرزا (۸۵۰ - ۷۷۹ھ) کے عہد کے شاعروں میں معتبر مقام کے حامل تھے، شاعری کی جملہ اصناف خصوصاً غزل اور مثنوی میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ میر علی شیر نوائی ان کے علم و فضل اور شاعرانہ بلاغت کی یوں داد دیتے ہیں[1]:

"شخصی در غایت فضل و کمال بوده و در نہایت فصاحت و بلاغت و شعر روان او صافی و روان تر از آب زلال، بسیار خوش محاوره و مجادلہ"

دیوان غزلیات کے علاوہ ان کی مثنوی 'حالنامہ' جو گوی و چوگان کے نام سے مشہور ہے، خاصی مقبول رہی ہے اور اہل نظر سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی جیسے بلند پایہ شاعر اور سخن سنج نے اپنی کتاب "بہارستان" میں اس مثنوی کو ان کی سب سے بہتر نظم قرار دیا ہے، جیسا کہ وہ رقم طراز ہیں:

"صاحب کتاب گوی و چوگان و آن نظم سر آمد ولیت"[2]

مولانا عارفی کو ان کے مداح "سلمان ثانی" کے لقب سے پکارتے تھے، اس کی دو وجہیں تھیں، جیسا کہ میر علی شیر نوائی نے لکھا ہے، اوّل یہ کہ عارفی کا رنگ شاعری سلمان کے طرز سے مماثل تھا اور دوسرے یہ کہ سلمان کی طرح عارفی بھی ضعف بصارت اور درد چشم میں مبتلا تھا، چنانچہ سلمان جب عارضہ چشم میں گرفتار تھا تو اس نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس میں اس تکلیف کا ذکر تھا، عارفی نے بھی اس کی تقلید میں ایک قصیدہ اسی زمین میں قلم بند کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

بر پلک سرخ دیدهٔ من داردی سفید ÷ باشد بعینہ نمک سوده بر کباب

تقی اوحدی اور میر علی شیر نے اس مطلع کی بہت تعریف کی ہے۔ متذکرہ بالا تذکرہ نگاروں کی آرا اور خود عارفی کے کلام کی روشنی میں یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک خوش فکر اور قادر الکلام شاعر تھے۔ پیش نظر مثنوی ان کے صوفیانہ اور عارفانہ مزاج و میلانات کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا تمام تر حصہ ہرات میں بسر کیا۔ ۸۵۳ھ مطابق ۱۴۴۹ء میں لگ بھگ ۶۲ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا اور بقول مصنف مجالس النفائس اور عرفات العاشقین ہرات ہی میں مدفون ہوئے۔

---

(۱) مجالس النفائس، مطبوعہ۔ ص ۱۹۴

کچھ مثنوی کے بارے میں

"حالنامہ" عارفی کے زورِ تخیل کا نتیجہ ہے جسے انھوں نے صرف دو ہفتہ میں مکمل کیا۔ کہتے ہیں :

کردم بدو ہفتہ بہر نامش ؛ ہمچو مہ چاردہ تمامش

مثنوی کے آخر میں شاعر نے مثنوی کا نام اور اپنا تخلص پیش کیا ہے :

این نامہ کہ ساختم تمامش ؛ حالی شدہ و حالنامہ نامش

این حال کہ شعر عارفی راست ؛ ناید صفتش بہر قلم راست

یہ مثنوی خاقانی کی مثنوی "تحفۃ العراقین" اور نظامی کی "لیلیٰ مجنون" کی بحر یعنی بحر ہزج مسدس اخرم مقبوض محذوف میں لکھی گئی ہے اور اس کا وزن مفعول مفاعلن فعولن ہے۔

اس مثنوی کا زمانۂ تصنیف سلطان شاہرخ مرزا (م ۔ ۸۵۰ھ) کا عہد ہے۔ عارفی نے یہ مثنوی شاہرخ کے انتقال سے ۸ سال قبل اس کے پوتے سلطان محمد بن بالسینقر کے لیے لکھی اور اس کے نام سے معنون کی جیسا کہ لکھتے ہیں :

تا گوی سخن تراشم از جان ؛ در خدمت شہ برم بہ میدان

خورشید سریر ماہ مسند ؛ سلطان جہانیان محمد

مثنوی کا موضوع

اس کا موضوع وصال صوفی بہ عشق الہٰی ہے۔ مقام وحدت تک پہنچنے اور وصال احدیت کے حصول کے لیے اپنے آپ سے گذر جانا اور عالم جسمانی اور تمام خواہشات نفسانی کو فنا کر دینا لازمی ہے۔ عاشقان الہٰی راہ عشق میں پروانے کی طرح اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں، گو اور چوگان در اصل دو عاشق عرفانی ہیں جو بطور استعارہ استعمال ہوئے ہیں اور ان کی تمثیل سے شاعر نے اس عارفانہ نکتہ کی وضاحت کی ہے :

پی گوہر معرفت بدارم ؛ تا نام بعارفی بر آرم

مثنوی کا قصہ روایتی اور فرضی ہے جسے عارفی کے جادو نگار قلم نے واقعیت کا رنگ دے دیا ہے جس سے آورد میں آمد کی شان پیدا ہو گئی ہے :

این گفتہ کہ سر بسر خیال است ؛ سحریست کہ آن مرا حلال است

چوگان بازی جسے انگریزی میں POLO کہتے ہیں ایشیائی ملکوں میں امیروں اور بادشاہوں کا محبوب کھیل

رہا ہے۔ جیساکہ اس مثنوی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے سلطان محمد بن بایسنغر چوگان بازی کا شیدائی تھا اور اس فن میں اسے بڑی مہارت تھی۔ عارفی نے مثنوی کی ابتدا میں "در مدح ثنای شہزادہ" کے عنوان سے ۲۸ اشعار لکھے ہیں جن میں شہزادہ کی چوگان بازی کے مناظر کی نہایت دل کش تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ شہزادہ کی تیزی وطراری، فنی چابکدستی اور صلابت وقوت کے نمونے ملاحظہ ہوں:

شاہی کہ چو برگرفت چوگان — مرگوی شد و سپہر میدان
آن لحظہ کہ پا بزین در آورد — گرد از کرۂ زمین برآورد
آن صحن فلک کہ گوی ماہ است — جولانگہ بادپای شاہ است
گوی کہ ہلال آسمانش — چوگان شہ است دصولجانش

چوگان اور گیند کی زد وگیر اور گیند کی ضرب سے جبین ماہتاب کے زخمی ہونے کی یہ حسین شاعرانہ توجیہ دیکھیے:

گوی کہ شہ از رہ ہنر زد — بر لوح جبین ماہ سر زد
آں داغ کہ برجبین ماہ است — گوئی تو کہ زخم گوی شاہ است

شہزادہ کا گھوڑا جس کا نام 'ابرش' تھا اپنی برق رفتاری میں صرصر کو پیچھے چھوڑ جاتا تھا، اوراس کی ٹاپ سے جو چنگاریاں پھوٹتی تھیں آگ اس سے گریزاں رہتی تھی:

چون ابرش بادپا برانگیخت — گوی کہ بہ باد آتش آمیخت
آویختہ صرصر از دُم او — بگریختہ آذر از سُم او

قصہ کا اجمال چونکہ یہ مثنوی شاہزادہ محمد بن بالسینقر کے لیے لکھی گئی تھی اس لیے عارفی نے اس کی طبعی مناسبت کے خیال سے ایک ایسے فرضی قصے کا انتخاب کیا جو گو اور چوگان کے کھیل سے متعلق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانہ میں چین میں ایک بادشاہ تھا، بڑی شان وشوکت اور جاہ وحشم کا مالک تھا، اس کو ایک بیٹا تھا، حسن میں چندے آفتاب چندے ماہتاب، ماہ رو، پری پیکر اور شیریں سخن تھا:

چون ماہ دو ہفتہ یک پسر داشت — کز مہر جمال بیشتر داشت
ماہی کہ تمام دلبری بود — در صورت آدمی پری بود
شیرین سخنی کہ دادہ برباد — از سنگدلی ہزار فرہاد

اس کی زلفِ سیاہ کے مجنوں کی طرح ہزاروں اسیر تھے:

لیلیٰ زلفی کہ داشت مفتون　　در سلسلۂ ہزار مجنون

چوگان بازی سے اس کو بڑی رغبت تھی وہ ہر روز گوی بازی کے شوق میں میدان کی طرف جاتا اور اپنے شوق کا مظاہرہ کرتا تھا:

ہمراہی اسپ تاختن داشت　　ہم میل بہ گوی باختن داشت
بیرون رفتی بگوی بازی　　جولان دادی سمند تازی

ایک روز وہ اپنے حشم و خدم کے ساتھ چوگان بازی کے لیے صحرا کی طرف گیا اور کھیل میں مشغول ہو گیا۔ ناگاہ ایک گوشہ سے ایک غریب و نامراد اور وارستہ حال فقیر ادھر آنکلا، مفلسی اور بیکسی کی مجسم تصویر تھا اور حسرت دماوی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ جیسے ہی اس کی نگاہ شاہزادہ پر پڑی وہ ہزار جان و دل سے اس پر عاشق ہو گیا پھر اس کو اپنے گرد و پیش کی کچھ بھی خبر نہ رہی:

شہ را چو زدور یک نظر دید　　حیران شد و حال خود دگر دید

شاہزادہ اس صورت حال سے بے خبر تھا، لیکن درویش کا صبر و قرار رخصت ہو چکا تھا اور ہر لمحہ فراق محبوب میں آنکھیں اشک بار رہا کرتی تھیں:

ہر بار کہ سوی شہ نظر کرد　　صد گوی سرشک رد برو کرد
پیراہن صبر چاک میکرد　　خود راز غمش ہلاک میکرد

شاہزادہ جب کھیل سے فارغ ہو کر میدان سے واپس ہوتا تو فقیر زمین پر پڑے ہوئے شکستہ چوگان اور گیند کے قریب جاتا، اسے ہاتھ میں لیتا، ان کی قسمت پر رشک کرتا، اپنی نامرادی اور نارسائی پر الحاح و زاری کرتا ہوا یوں گویا ہوتا:

مرغ دل من شکستہ بالست　　چون گوی شکستہ خستہ حالست
ای بارخدای حال گردان　　ہجران مرا وصال گردان
فردا کہ شہ این طرف نہد روی　　خواہم برہش فتاد چون گوی
یا گوی بردن برم ز میدان　　یا سر بہ نہم چو نا امیدان

دونوں زبان حال سے اپنا اپنا درد دل بیان کرتے تھے۔ شہزادہ اپنے حسن و جمال میں مست و مغرور تھا وہ درویش کی طرف التفات نہ کرتا تھا، ادھر درویش اپنی کم نصیبی اور نامردی پر خون کے آنسو روتا اور فراق محبوب میں سسکتا تھا، جب ٹوٹی ہوئی گیند کو دیکھتا تو آہ سرد بھرتا اور دل میں کہتا کہ کاش اس گیند کی جگہ میرا دیدہ و سر ہوتا جو شہزادہ کے چوگان کی ٹھوکر کھا کر مرخرو ہوتا:

کاشم سرِ دیدہ گوی بودی تا شاہ بہ صولجان ربودی

آخر دن رات کی گریہ وزاری سے تنگ آکر راہ محبوب میں وہ اپنی جاں نثار کر دیتا ہے۔ دوسرے دن شاہزادہ جب کھیل کے لیے وہاں پہنچتا ہے تو اس کو اس سانحہ کا علم ہوتا ہے، وہ درویش کی لاش کے پاس پہنچتا ہے، گھوڑے سے نیچے اتر آتا ہے، درویش کی موت پر اس کے دل سے بھی آہ نکل پڑتی ہے، وہ چوگان کو توڑ دیتا ہے اور گیند کو ایک کنارے پھینک دیتا ہے، سیر و تفریح سے اس کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے، آتش محبت اس کے دل میں موجزن ہوتی ہے، اس کی آنکھوں سے آنسو کا سیلاب رواں ہو جاتا ہے۔ فقیر کی پاک محبت اور جذبۂ وفا کے احترام میں شہزادہ کے حکم سے اس کو ایک بلند مقام پر سپرد خاک کیا گیا اور اس کی لوح پر خون دل سے یہ لکھا گیا کہ "یہاں ایک عاشق صادق آسودہ خواب ہے جس کی محبت پر محبوب بھی نازاں ہے۔":

کین بود کہ داد داد در عشق وین بود کہ سر نہاد در عشق

این بود کہ جاں ببرد درحال شد زندۂ عشق و مرد درحال

اور : زین گونہ کسی کہ عشق بازد معشوق بہ عشق او بنازد

یہاں قصہ کا اختتام ہو جاتا ہے۔

تعدادِ اشعار مثنوی کے مختلف نسخوں میں تعداد اشعار میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تقی اوحدی نے اپنے تذکرہ عرفات العاشقین میں اشعار کی تعداد ۵۱۰ بتائی ہے، عصر حاضر کے مشہور ایرانی ادیب و محقق آقای سعید نفیسی نے اپنی مشہور کتاب تاریخ نظم و نثر فارسی جلد اول میں ۸۰۰ اور پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ ادبیات ایران جلد سوم میں اشعار کی تعداد ۵۰۰ بتائی ہے لیکن خود عارفی کے قول کے مطابق یہ مثنوی ۵۰۱ اشعار پر مشتمل ہے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے:

چون بر عددش قلم نہادم بر پانصد و یک رقم نہادم

پیش نظر دو مختلف مخطوطوں یعنی نسخہ "الف" اور نسخہ "ب" میں علی الترتیب اشعار کی مجموعی تعداد ۴۹۵ اور ۴۶۷ ہے۔ ان دونوں نسخوں کے باہم تقابل کے بعد نسخہ "ب" سے ۱۵ ایسے اشعار اضافہ کیے گئے ہیں جو نسخہ "الف" میں نہیں تھے۔ اس طرح میرے مرتبہ نسخہ میں اشعار کی مجموعی تعداد ۵۱۰ ہو جاتی ہے جو تقی اوحدی کے بیان کے عین مطابق ہے، کیونکہ تقی اوحدی کے پیش نظر جو نسخہ تھا اس میں بھی ۵۱۰ اشعار تھے۔ عارفی کے بیان کے مطابق پیش کردہ مثنوی میں ۹ اشعار فاضل ہوتے ہیں۔ اس تضاد یا شعر کی زیادتی کا

سبب یہ ہے کہ مثنوی اصلاً ۱۰۵ اشعار پر ہی مشتمل ہے لیکن اصل مقصود کے بعد بطور خاتمہ ۹ اشعار کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مثنوی ۱۰۵ اشعار پر ختم ہو جاتی ہے، اختتام کے بعد "در خاتمۂ کتاب" کے عنوان سے جو ۹ اشعار ہیں وہ بعد میں عارفی نے شاہانہ صلہ کے حصول کے اعتراف میں اضافہ کیے ہیں جیسا کہ ان اشعار کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے :

بخشید مرا بہ لطف بسیار   چوگان زر و ہزار دینار

••

عکس حالنامہ صفحہ اوّل

نسخہ خدا بخش

کتاب حالنامہ

زان پیش که چوب حال گویم | از خالق ذوالجلال گویم
آن خالق ماه و خور که چون گوی | زو چرخ فتاده در تکاپوی
از حکمت اوست در زد و گیر | چوگان قضا و گوی تقدیر
از ماه برین بلند ایوان | که گوی نمود و گاه چوگان
هر ذره ز ماه تا بماهی | بر وحدت او دهد گواهی
زو گوی سپهر مستدیر است | چوگان هلال گوشه گیر است
صنعش که ز مهر عالم افروخت | بر چوب سپهر گوی زر دوخت
این گوی درست زر که مهر است | بر چرخ ز گردشش سپهر است

عکس حالنامہ صفحہ آخر

نسخہ خدا بخش

بخت در دولتم گشودی
بر گنج مراد ره نمودی

تا من ز سر خیال بندی
گفتم سخنی بدین بلندی

سر رشته [illegible] ز هر
از دولت پادشه به انجام

شه را چو بدین نگاه افتاد
صد بار قبول شاد افتاد

بخشید مرا بلطف بسیار
چوگان زر و هزار دینار

تا هست فلک بقای شه باد
بر دست ملک دعای شه باد

[illegible] تعالی [illegible] علی الکاتب

حالنامه[1]

زان پیش که حسب حال گویم ‌‌ — ‌‌ از خالق ذو الجلال گویم

آن خالق ماه و خور که چون گوی ‌‌ — ‌‌ زو چرخ فتاده در تکاپوی

زو گوی سپهر مستدیر است ‌‌ — ‌‌ چوگان هلال گوشه گیر است

از حکمت اوست در زد و گیر ‌‌ — ‌‌ چوگان قضا و گوی تقدیر

از ماه برین بلند ایوان ‌‌ — ‌‌ گر گوی نمود و گاه چوگان

هر ذره ز ماه تا بماهی ‌‌ — ‌‌ بر وحدت او دهد گواهی

صنعش که ز مهر عالم افروخت ‌‌ — ‌‌ بر جیب سپهر گوی زر دوخت

این گوی درست زر که مهر ست ‌‌ — ‌‌ بر چرخ ز گردش سپهر ست

از شرق به غرب داده راهش ‌‌ — ‌‌ کانجاست محل جایگاهش

در[2] مناجات قاضی الحاجات

ای گوی خور از تو سپید روی ‌‌ — ‌‌ چوگان شب از تو آبنوسی

هم[3] گوی زمین مدور از تو ‌‌ — ‌‌ هم صحن فلک مصور از تو

برگردش چرخ لاجوردی ‌‌ — ‌‌ چوگان زر از هلال کردی

بر روی بتان ماه تمثال ‌‌ — ‌‌ از خط سیاه و نقطهٔ خال

چوگان عبیر و گوی[4] سازی ‌‌ — ‌‌ وز عنبر سوده[5] بوی[6] سازی

چوگان تو کشتی ز آب هر سوی ‌‌ — ‌‌ در صحن صدف تو دُر کنی گوی

از حکم تو گشته بی سر و پای ‌‌ — ‌‌ این گوی سپهر سیم سیمای

در صنع تو این دو گوی زرین ‌‌ — ‌‌ گردیده برد دو صحن سیمین

در لطف تو برده در سخن پی ‌‌ — ‌‌ چوگان زبان هر سخن گوی[7]

---

۱ نسخهٔ ب: یہ عنوان نہیں ہے۔ ۲ ب۔ این ۳ ب۔ مصرع ثانی مقدم اور مصرع اول موخر ہے۔
۴ "بوی" کی جگہ "گوی" ۵ ب۔ سادہ ۶ "گوی" کی جگہ "بوی"۔ ۷ [illegible] یہ شعر نہیں ہے۔

در[1] مناجات دوم و تمهید نعت

ای لال زبان حالم از تو — خالی نبود خیالم از تو
ای از تو[2] زبوده حالی من — سودای سر خیالی من
روشن بودت که حال من چیست — در آینهٔ خیال من کیست
توفیق رفیق حال من کن — دُر در صدف خیال من کن
تا هرچه زروی حال گویم — آمیخته با خیال گویم
حال نو و حالت نوم بخش — شیرینی شعر خسروم بخش
تا سفته دُری ز بحر دُرم ده — شایستهٔ گوش گوهرم ده
بی گوهر معرفت بدارم — تا نام به عارفی برآرم
در صبح بدایتم صفا ده — گویایی نعت مصطفیٰ ده

در[3] نعت خلاصهٔ موجودات صلی الله علیه وسلم

آن پیشرو بساط لولاک — وآن کرده گذر ز کوی افلاک
آن کوکبه بر سپهر برده — وان گوی زماه و مهر برده
هم سیر مه و ستاره کرده — هم قرص قمر دو پاره کرده
هم برده زچنبر فلک گوی — هم کرده دو صولجان زیک گوی
میدان سپهر در نوشته — در حال ز قدسیان گذشته
یکران چو برین بساط رانده — زو طایر قدس باز مانده
یک خانهٔ مه نواز کمانش — یک گوشهٔ فلک ز صولجانش
در حالکهش (کذا) سپهر گوی — وز مملکتش دو کون سوی[4]
گوی سر من نثار بادش — خاک ره مشت و خار بادش[5]

۱ ب۔ یہاں کوئی عنوان نہیں ہے۔ ۲ ب۔ از ۳ ب۔ فی نعت پیغمبر کرم ۴ ب۔ گوی
۵۔ اضافہ شعر نسخۂ الف میں نہیں ہے۔

در خطاب به عشق گوید

ای عشق بحال من نظر کن — وز سرّ حقیقتم خبر کن
تا گوی وصال سر برآرم — ماهیت حال بر سر آرم
گوی ز خیال بر تراشم — تا چند فسرده حال باشم
چوگانی فکر بیش رانم — وز دست خرد عنان ستانم
گوی خیال خوب بندم — دست همه را بچوب بندم
گویم سخنی مناسب حال — بر روی سخن ز گوی هم خال
چوگان ز زبان حال سازم — با گوی سخن خیال بازم
میدان سخن تمام گیرم — در نظم چو دُر نظام گیرم
در چشم جهان شوم گرامی — از گوهر نظم چون نظامی

در سبب نظم کتاب گوید

روزی که ز موسم بهاران — بود ابر دلی نبود باران
خورشید ز ابر پرده بسته — در خرگه غنچه گل نشسته
فراش صبا بساط رفته — هر سوی شگوفه شگفته
گل غرّه بخوب روی خویش — بلبل بسرود گوی خویش
در آب فتاده اضطرابی — گوی شده راست هر حبابی
آب از سر لطف و مهر و خوبی — سبزه بهزار تازه روی
این روی بپای گل نهاده — وان در قدم سمن فتاده
از بس که دمیده سنبل تر — گوی شده خاک گوی عنبر

۱- ب- اندر صورت حال خویش گوید ۲- ب- مثال [illegible] ۳- چوگان- یا [illegible] [illegible]
۵- الف- [illegible] ۶- ب- در صفت [illegible] [illegible] ب- [illegible]

صحرا خوش و دلکش و ہوا خوش — از خوبیٔ آن ہوای دلکش
اندیشۂ گشت در دلم گشت — رفتم چو صبا بہ عزم گلگشت
ناگہ گذرم فتاد جائے — چون باغ بہشت دلگشائے
ہر سو سمنے و یاسمینے — چون گلشن آسمان زمینے
گردون چو نظر در آن زمین کرد — از مہر بگشت[1] و قصد کین کرد
گردید کبود و بس برآشفت — وز غایت کبر با زمین گفت

در خطاب[2] آسمان با زمین گوید[3]

کای نامدہ در برابر من — بنشین کہ نہ تو در خور من
با من تو برابری چہ جوئے — کز دولت من بہ آب روئے
فتح تو ز من بود بھر باب — در جیب تو من کنم دُرِ ناب
تو پستی و من بلند پایہ — بر فرق تو از منست سایہ
ہر جا کہ خدای و السما گفت — والارض نگر کہ در قفا گفت
فرقی بتوام کہ درمیان است — مابین زمین و آسمان است
من دایرہ ام ز گوہر پاک — تو نقطہ و لیک نقطۂ خاک
بازار من از چراغ کوکب — ہم روز مزین است و ہم شب[4]
فیروزیٔ من ز ماہ[5] و مہر است — زانم شب و روز جاہ[6] و قدر است
جای کہ منم کہٴ تو بارے — در پای فتادہ خاکسارے
آباد تو سر بسر خرابست — پیوستہ کوخ تو در آبست
بس کز تو بدل غبار دارم — نی[7] روز و نہ شب قرار دارم
با سنگ دلی و تیرہ رای — در معرض من تو چون درآی
اینہا[8] بہ زمین چو آسمان گفت — لرزید زمین و در زمان گفت

---

۱. مرقات: عاشقین۔ ب: آن۔ ۲. ب: گذشتہ ۳. ب: در صرف فلک زمین را ۴. الف، ب: شعر نہیں ہے۔ ۵. ب: مہر و ماہ
۶. ب: قدر و جاہ ۷. مرقات: ۸. نسخہ "ب" میں یہ مصرع اس طرح ہے: "اینہا چو زمین با آسمان گفت" جو درست نہیں ہے، کیونکہ آسمان کا خطاب زمین سے ہے۔ اصل نسخے "بزمین چو آسمان گفت" کو یہاں موزوں ہے۔

در خطاب[۱] زمین با آسمان گوید

از کوکب اگر مزیّنی تو — یا از گل[۲] مہر گلشنی تو

من نیز بدور لالہ و گل — دارم ز تو بیشتر تجمل

ور تو شب تیرہ می نمائی — از آئینہ شمع[۳] روشنائی

بنگر کہ مرا ہم از سیاہی — در عین صفا چنانکہ خواہی[۴]

چون چشمۂ مہر[۵] می درخشد — آبی کہ حیات خضر بخشد

گر ہست ترا نجوم ظاہر — آراستہ ام من از جواہر

گر کوکبۂ تو از بلندیست — در پستیٔ من صد ارجمندیست

من گویم اگر تو صولجانی — بر من ز چہ خنگ می دوانی

ہر چند تراست خود نمائی — باری ہمہ گرد من برآئی

اینجا چہ مقام خودستائیست — پیداست کہ این سخن ہوائیست

گر فخرت[۶] ز ماہ و مہر است — فخرم بہ بتان ماہ چہر است

من سرمۂ چشم مہر و ماہم — زان روی کہ خاک پای شاہم

این بس بودم کہ ابرش[۷] شاہ — چون آب بروی من کند راہ

چون ہست صد آبرو برینم — روی تو رواست بر زمینم

چون گفت زمین جواب گردون — دیدم کہ چو آفتاب گردون

از ہر طرفی سوار دیگر — گل روی سمن عذار دیگر

جولان دادی سمند تازی — مشغول شدی بگوی بازی

در دست چو سیم ہر جوانی — بود از زر ناب صولجانی

آن سر بہ فلک چو سرو سودہ — این میل چو شاخ گل نمودہ

۱؎ انکار زمین مر آسمان را ۲؎ ب. گل و لالہ ۳؎ ب. ماہ "عرفات" میں "روز" ۴؎ ب. دانی ۵؎ الف. خضر لیکن ب میں آب حیات درج ہے ۶؎ ب. گر فخر تو خود ۷؎ سرخ و سفید رنگ کا گھوڑا ۸؎ ب. ماہ

این جانب گوی روی کرده — قصد زد و برد گوی کرده[1]

آنجا به یکی دگر نموده — در گوی زدن هنر نموده

این گوی ز پیش آن ربوده — آن در خم صولجان ربوده[2]

هر گوی که این ز راه بردی — آن بر سر جایگاه بردی

در هر زدن و ربودن گوی — دیدم که دو صولجان ز هر سوی

قلاب صفت فتاده درهم — انداخته خم چو زلف پُرخم[3]

چوگان شده همچو سایه داری — دیوانه ز دست هر سواری

از آب هر آفتاب روی — گو از سر حال کرده سوی

در[4] صفت پادشاه عصر گوید

القصه چون این بساط دیدم — قومی[5] همه پرنشاط دیدم

صد[6] گونه خیال داد دستم — در حال[7] میان بفکر بستم

چون گوی بگوشهٔ دویدم — چون تیشه روان[8] زبان کشیدم

تا گوی سخن تراشم از جان — در خدمت شه برم به میدان

خورشید سریر و ماه مسند — سلطان[9] جهانیان محمد

شاهی که چو برگرفت چوگان — مه گوی شد و سپهر میدان

آن لحظه که پا بزین در آورد — گرد از کرهٔ زمین بر آورد

چون[10] ابرش باد پا برانگیخت — گوی که بباد آتش آمیخت

چوگانی[11] شه که در تگاپوی — از توسن چرخ می برد گوی

در جستنش ار نه سر کشیدی — بر گوی سپهر بر دویدی

۱، ۲ الف - یہ شعر نہیں ہے - ۳ ب - در ۴ ب - در مدح ثنای شاہزادہ ۵ ب - خلقی ۶ ب - پر ۷ الف - فی الحال و ب - زبان خود کشیدم ۹ اشارہ بہ شاہزادہ محمد بن بایسنقر ہے۔ ۱۰، ۱۱ یہ دونوں اشعار نسخۂ الف میں نہیں ہیں۔

چوں گوی سپہر گرد پستی میداں میداں چو گوی جستی
ہر گاہ[2] کہ در عرق شدی غرق باراں بودی و درمیان برق
آویختہ صرصر از دُم او[3] بگریختہ آذر از سُم او
گوئی[4] ست درست گاہ جولاں بر گوی زدم کشیدہ چوگاں
ہر پی کہ دو دیدہ در پی گوی گردیدہ ز سر عتش سر گوی
ہر بار کہ در نورد رفتہ صد باد صبا بگرد رفتہ
از کوہ چو سیل در گذشتہ وز بحر چون باد بر گذشتہ
آں کوہ نورد زور ناورد ہر گو کہ بدست و پا در آورد
دیدہ فلک از کنار میداں یک گوی میاں چار چوگاں
آں عرصہ کہ شاہ گوی باز د با تازی تیز گوش بازد[5]
میداں سعادتش تواں گفت دُر دیدہ دولتش تواں گفت
آں صحن فلکش کہ گوی ماہ است جولانگہ باد پای شاہ است
گوی کہ ہلال آسمانش چوگان[6] شہ است و صولجانش
چوگان فلک کہ زر نگار است سرگشتہ گوی شہریار است
گوی کہ شہ از رہ[7] ہنر زد بر لوح جبیں ماہ سر زد
آں داغ کہ بر جبیں ماہ است گوی تو کہ زخم گوی شاہ است
ناآمدہ بر زمیں برد آخت زد باز و بر آسمانش انداخت
از ضربت[8] صولجان سلطاں گردوں شدہ نیز[9] گوی غلطاں
ہر گوی کہ زد شہ جواں مرد خورشید نہفتہ گشت در گرد
چوگان سر خود بہ مہ رساندہ خود را بہ کوی شہ رساندہ[10]
ہر گوی چو صولجاں رساندی فریاد[11] بر آسمان رساندی

۱۔ الف۔ یہ شعر نہیں ہے ۲۔ ب۔ بار ۳۔ ب۔ مصرع اول کو موخر اور مصرع دوم کو مقدم کیا ہے ۴۔ ج۔ الف۔ یہ شعر نہیں ہے ۵۔ ب۔ کہ جای ۶۔ ب۔ میدان
۷۔ ب۔ سرو ۸۔ ب۔ جولت ۹۔ ب۔ ہمچو ۱۰۔ الف۔ یہ شعر نہیں ہے ۱۱۔ ب۔ آواز

گوی مه از آسمان فتاده[1] ... رخ بر سم گوی شه نهاده[2]
زیبد ز برای عرصهٔ شاه ... کز نایت مهر آورد ماه
هم گوی ز گوهر کواکب ... هم میل زر از شهاب ثاقب[3]
دارند چو بر قبولش امید ... چوگان هلال و گوی خورشید
تا گوی زمین آسمان است ... چوگان هلال درمیان است
آن شاه سوار عرصهٔ رزم ... وان گنج نثار مجلس بزم
پیوسته خجسته حال باده ... چوگانی او هلال باده

در[4] آغاز داستان شاهزاده و درویش

گویای سخنور[5] سخن سنج ... کز درج سخن برون دهد گنج
فرمود که در اوان پیشین ... از جملهٔ خسروان پیشین
در عرصهٔ عصر[6] بود شاهی ... دارای جهان جهان پناهی
چون مهر به تیغ چین گرفته ... آرام دران زمین گرفته
تنها نه همان گل زمین داشت ... صد ملک[7] دگر ورای چین داشت
هر جا شتگهی بر آستانش ... صد ترک خطا کشیده خوانش
زیبندهٔ چتر بود و چوگان ... گو از همه برده روز میدان
گردون رخشی ستاره خیلی ... هر لمعه ز تیغ او سهیلی[8]
بر ماه کشیده بارگاهش ... مشکین شده چین ز گرد راهش
محتاج[9] درش هزار خاقان ... فغفور یکیش از وشاقان
آن شاه که از بلندی بخت ... بالاتر از آسمان زدی تخت
چون ماه دو هفته یک پسر داشت ... کز مهر جمال بیشتر داشت

۱- فتاده ب۔ ۲- رخ بر سم اسپ او نهاده ب ۳- ب- یه شعر اس طرح ہے "چوگان زر از شهاب ثاقب + هم گوی ز گوهر کواکب" ۴- ب آغاز کتاب حالنامه ۵- ب- هنرور ۶- ب- دهر ۷- ب- شهر ۸- د ۹- ب- یه دونوں اشعار نہیں ہیں۔

ماہی کہ تمام دلبری بود　　　در صورت آدمی پری بود

شائستۂ تاج و تخت شاہی　　　رستہ گلی از درخت شاہی

شیریں سخنی کہ داد برباد　　　از سنگدلی ہزار فرہاد

لیلیٰ زلفی کہ داشت مفتوں　　　در سلسلۂ ہزار مجنوں

صد ترک ختن غلام درویش　　　صد فتنۂ چیں زتار مویش

ہرگہ کہ سمند بر نشستی　　　زلفی چو کمند بر شکستی

آہو بہ کمندش اوفتادی　　　در پای سمندش اوفتادی

در زلف ہزار چیں نہاں داشت　　　در ہر چینی ہزار جان داشت

جاں دادہ بتاں چیں برایش　　　آہوی ختن سبک سرایش

رویش ز غبار خط شبرنگ　　　آئینۂ چیں نمودہ در زنگ

نافہ گرہی زگیسوی او　　　چیں فتنہ شدہ زابروی او

ماہ آمدہ ہندوی کمینش　　　وز خرمن حسن خوشہ چینش

در چیں قبا ہزار جانش　　　آویختہ موی تا میانش

ہر لحظہ زچشم آہوانہ　　　برہم زدہ صد نگار خانہ

بت پیش رخت سجود کردہ　　　رخ سودہ بخاک و سود کردہ

زلفش کہ فتادہ بر زمیں بود　　　در ہر شکنش ہزار چیں بود

صورت گر چیں کہ ہر زمانی　　　بردی قلمش برو زمانی

چوں صورت لعل او کشیدی　　　انگشت ہزار پی گزیدی

نقش قد ابرویش چو بستی　　　از حیرت او قلم شکستی

آں مہر سپہر شہریاری　　　کز ماہ گذشت در سواری

ہمراہی اسپ تاختن داشت　　　ہم میل بگوی باختن داشت

۱؎ ب مصرعوں کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر ہے ۲؎ ب. شام ۳؎ ب. یہ شعر نہیں ہے ۴؎ ب. بندہ ای ۵؎ ب. جان داشت ۶؎ ب. میان داشت۔

یک دم بہوای گوی شتابان — از دست نمی نہادہ چوگان
باحسن و جمال عالم افروز — برصورت آفتاب ہر روز
بیرون رفتی بگوی بازی — جولان دادہ سمند تازی
گویند کہ بود یک غلامش — چون بدر ولی ہلال نامش
ہمچو مہ چاردہ تمامی — در صورت خسروی غلامی
برگوشۂ ابرویش ہلالی — بر ماہ زشب نہادہ خالی
در حسن شکست ماہ کردی[1] — چوگان داری شاہ کردی
چون رغبت بازیش فتادی — چوگان زرش ہلال دادی

رفتن شاہزادہ بگوی بازی

روزی بہ نشاط کامرانی — شہزادۂ چین چنانکہ دانی
برخنگ سبک عنان برآمد — چون مہ کہ برآسمان برآمد
باخیل و سپاہ خود برون رفت — باکوکبہ زحد برون رفت
از بہر نشاط گوی بازی — آراست بساط گوی بازی
وآنگہ زہلال خواست چوگان — برگوی گرفت راست چوگان
چوگان چو بگوی سر در آورد — در معرکہ گوی سر بر آورد
چون پای نہاد بر سر گوی — گوی از ہمہ روی شد سخن گوی

در حالت عشق و گوی چوگان

گفت ای سر من فدای پایت — بر باد دہم سر از برایت[2]
چون از قدم تو سر فرازم — سر در قدمت چرا نبازم
ہر لحظہ و غاز سر گرفتی — از خاک مرا تو بر گرفتی

۱؎ الف و دیدان و ب دونوں مصرعوں میں "ی" کردی ہے۔ یہاں کوئی عنوان نہیں ہے۔ ب۔ ہدایت

برداشتهٔ توام درین کوی
بر خاک رہت زان نہم روی

از خویشتم اگر دہی رہائی
باز از پی من دواسپہ آئی

در پای توام که سرسری نیست
بشنو سخنم که سرسری نیست

دست تو ز من ہمیشه بالاست
ہر جا قدمت سر من آنجاست

برتارک اگر زنی نزارم
سر از قدم تو بر ندارم

خالی نه کنم سر از خیالت
عمریست که می پرم ببالت

از دست تو گر نفیر دارم
خود از تو کجا گزیر دارم

با آنکه نهٔ تو پای برجا
دارم سر آنکه بوسمت پای

گر تو ز سر دراز دستی
صد بار سر مرا شکستی

بی دینم اگر سر از تو پیچم
جز سر که بدست نیست ہیچم

در ہیأت اگر درست ماہم
زیر قدمت تو خاک راہم

تا بود بدین صفت وجودم
در تحت تصرف تو بودم

زینسان توام ارجمند کردی
آوازهٔ من بلند کردی

بر فرق توام که راه داری
این پایه ز دست شاه داری

فی الحال بگوی گفت چوگان

از گوی چو این شنید چوگان
فی الحال زبان کشید چوگان

کای خستهٔ روزگار چون من
گرد سر تو ہزار چون من

زین گونه که سرخ روییم از تو
پیوسته چرا نگوییم از تو

از تو سر من بچرخ ساید
پایم ز تو بر زمین نیاید

در پای فتادهٔ ز دستم
من قدر ترا چنین شکستم

۱ب۔ رہِ تو ۲ب۔ جدائی ۳ب۔ کنی ۴ب۔ یہ مصرع اس طرح ہے: "چوں بیتو قرار نیست ہیچم" ۵ب۔ قدمت ۶ب۔ سرم ۷ب۔ کردی ۸ب۔ کردی ۹ درمیان کوئی عنوان نہیں ہے۔ مضمون کی مناسبت سے "ب" کا یہ عنوان درست ہے۔

قدم که خمیده همچو دالست   بر دوستیت گواه حالست
از هر طرفی که می توانم   خود را بسر توی رسانم
هر لحظه مرا ز دست دیگر   از بهر تو سوده بر زمین سر
دست من و گردن وصالت   پای من و دامن خیالت
دنبال تو جز بسر نگردم   تا سر بود از تو بر نگردم
کار من اگرچه درهم از تست   اصل من و فرع من هم از تست
بی تو قدمن شکست گیرد   خود بی تو مرا که دست گیرد
این سرکشیم ز پستی تست   وین هستی من ز پستی تست
چون نیست قرار هیچم از تو   بر خویش چو مار پیچم از تو
من در پی تو بسر دویده   تو بر طرف دگر دویده
از بی زنگاه کردن من   کج مانده ز دور گردن من
این سر که مراست بر سر دوش   بهر قدم تو دارمش گوش
چون آرزوی تو در سرم هست   دارم سر خود نگه بدو دست
جای من اگرچه دست شاهست   در حال تو شاه را نگاهست
چون پاسخ یک دگر شنودند   آیین وفا ز سر نمودند
در خدمت شاهزاده آن گاه   بر شکل هلال و هیات ماه
این از سر خویشتن قدم کرد   وان پشت ز روی مهر خم کرد

در دیدن درویش شاهزاده را

شهزاده در اوج سرفرازی   مشغول شده به گوی بازی
ناگاه ز گوشهٔ فقیری   در کوی نیاز گوشه گیری

۱ب. دمی ۲ب. می دوانم ۳ب. دامن ۴ب. این شعر نیست ۵الف. شریف ب. پادشاه ۶ب. در رفتن دل ز دست درویش ۷ب. بشغل گوی.

آوارۂ مفلسی غریبی   وز نقد مراد بی نصیبی

سودا زدۂ سیاہ بختی   افتادہ چو سایۂ درختی

ہم چشم ترش سیہ بہاری   ہم چہرہ زگریہ لالہ زاری

برہم زدۂ خراب حالی   وز دست زمانہ پائمالی

برپای دلش زعشق بندی   در گردنش از ہوا کمندی

شہ را چو ز دور یک نظر دید   حیران شد و حال خود دگر دید

دیوانہ شاہزادہ آمد   وز اسپ خرد پیادہ آمد

ہر بار کہ سوی شہ نظر کرد   صد گوی سرشک رو بدر کرد

چوگان چو گرفتی آں پری رو   آں شیفتہ ربودہ چوں گو

گرد آمدی دلبر دو یدی   ہر دم طرفی دگر دویدی

در بازی شہ نگاہ کردی   فریاد زدی و آہ کردی

پیراہن صبر چاک می زد   در عشق دم از ہلاک می زد

از دیدہ دُرِ خوشاب می ریخت   نی دُر کہ عقیق ناب می ریخت

بر چہرۂ زرد واز خط آل   گویا شدہ بود صورت حال

چاووش کہ بود محرم شاہ   آں حال نگاہ کرد ناگاہ

زاں سوختہ خواست حال پرسید   دیدش دُرِ اشک و مہرہ برچید

گفت آہ چہ بازی فتادش   زیں مہر کجا بود کشادش

صد گونہ بلا بود دریں کوی   در کوی بلا کسی نہد روی

زیں ورطہ کہ عقل پی بخون برد   جان مشکل ازیں تواں بروں برد

ایں بادیہ را کراں نباشد   بیروں شد ازیں بجاں نباشد

ترسم کہ بجاں رسد زیانم   کایں قصہ بگوش شہ رسانم

۱ب. یہ شعر نہیں ہے۔ ۲ب. ہوس ۳ب. می کرد ۴ب. اس کے بجای یہ مصرع ہے "پر بخت سرشک و آہ می کرد"

۵ب. برچہرۂ زردش از خط و خال ۶ب. یہ شعر نہیں ہے۔

کاں دلشدہ را بخون نشاند | گر باد بگوش شہ رساند
چاووش اگرچہ سر نگہداشت | از حسن فراستی کہ شہ داشت
حال دل آں ز پا فتادہ | دریافتہ بود شاہزادہ
برگوی کہ صولجاں رساند | کو حالت گوی را نداند
دل را کہ بہ دلبری سپارد | کز مہر دلش نگہ دارد
بر صید کہ زد خدنگ کاری | کش دل نکشید بر شکاری

در نالیدن درویش تمام شب گوید

شہزادہ بدلنوازی آں روز | بہر دل آں غریب دلسوز
گو از ہمہ روز بیشتر تاخت | آں روز برغبت دگر باخت
بر چرخ چو گوی مہر در گشت | شہزادہ عناں کشید و برگشت
درویش چو گوی بر زمیں ماند | حیراں شد و روی بر زمیں ماند
جای کہ نشان گوی شہ یافت | آنجا سر خود چو خاک رہ یافت
جای کہ اثر ز گوی شہ داشت | برداشت بدیدہ و نگہ داشت
افتادہ چو گوی بود برجست | زد بر سر خود چو صولجاں دست
کرد از سر حال نالہ آغاز | وز نالہ بلند کرد آواز
گفت از خودی خودم ملالست | حالم دگرست ایں چہ حالست
بد حالم و ہمچو گوی پامال | یارب کہ مباد کس بدیں حال
زاں بہ کہ فسانہ گوی گشتم | افسانہ شہر و کوی گشتم
گوی دل خود ز دست دادم | در معرض گفت و گو فتادم
از من بر شہ سخن کہ گوید | من کیستم و ز من کہ گوید
مرغ دل من شکستہ بالست | چوں گوی شکستہ خستہ حالست

۱ب۔ یہ شعر نہیں ہے ۲ب۔ یہ عنوان نہیں ہے ۳ب۔ بر ۴ب۔ یہ شعر نہیں ہے ۵ب۔ درد ۶ب۔ یہ دونوں اشعار نہیں ہیں

پا از سر و سر ز پا ندانم — سرگردانم بکوی مانم
سرگشته وخسته دل چو گویم — حال دل خویش با که گویم
عشقم چپ و راست می دواند — حالی که مراست گوی داند
گرز آنکه رسم بگوی حالی — با او گویم که کیف حالی
ای بار خدای حال گردان — هجران مرا وصال گردان
فردا که شه این طرف نهد روی — خواهم برهش فتاد چون گوی
یا گوی بردن برم ز میدان — یا سر بنهم چو ناامیدان
زین گونه بخود خیال می بست — صد نقش ز روی حال می بست
هردم غم تو نواله میکرد — وز جور فراق ناله میکرد
شخصی همه سال همدمش بود — کو در همه حال محرمش بود
چون همدم دیرسالهٔ او — از دور شنید نالهٔ او

در آمدن رفیق درویش گوید

از راه وفا بسویش آمد — چون آینه روبرویش آمد
در گرد نهفته دید رویش — برهم زده یافت مو بمویش
گفتا که بگو چه حال داری — سودائی که در خیال داری
گوی ذقن که در خیالت — گردید و ربوده گشت حالت
بهر که نشسته بدین روز — در آتش کیستی بدین سوز
آخر تو سگی کدام کوی — سودا زدهٔ کدام روی
تو مهر کدام ماه داری — تو رو به کدام راه داری
در عهد کدام بی وفائی — در عشق کدام دلربائی
تو صید کدام شهسواری — آهوی کدام لاله زاری

---

۱ ب. کند ۲ ب. دل ۳ ب. دست ۴ ب. آتش ۵ الف. این شعر نیست.

این ناله و آه زاریت چیست — بی صبری و بیقراریت چیست
آن شیفته حال در جوابش — گریان به هزار اضطرابش
گفت از رخ زرد و اشک آلم — معلوم کن و مپرس حالم
حالِ دل خویش با که گویم — گوید دُرِ اشک من چه گویم
هم کار دل من بجان رسیده — هم کارد باستخوان رسیده
این دیدهٔ اشکبار بنگر — وین روی چو لاله زار بنگر
روز من و روزگار من بین — بستان من و بهار من بین
ره گم شده در دلم نفس را — این حال مباد هیچکس را
این حال چو دید همدم او — زد آه و گریست از غم او
دانست که حالش از چه زارست — در قید کدام شهسوارست
کرد از رهِ یاریش ملامت — کای رفته ز کوچهٔ سلامت
اینجا قدم استوار باید — گر سر برود قرار باید
از رفتن سر بکوی در عشق — آخر چه سرو چه گوی در عشق
بحری که درو دو کون غرقست — اینجا سر و گوی را چه فرقست
این گوی محبت است ازین کوی — نتوان سر خود گرفت چون گوی
چون گوی بکوی عشق بازی — سرباز که نیست عشق بازی
زین درد که هر نفس توان مُرد — یک تن نشنیده ام که جان بُرد
گر تیغ رسد مکش سر از یار — صد سر بکوی بود درین کار
چون این سخنان شنید درویش — خط بر سر و جان کشید درویش
زان حال بصورت دگر گشت — وان درد که داشت بیشتر گشت
بر صبر قرار داد دل را — بر دادن جان نهاد دل را
با دل غم روزگار خود گفت — و آنگاه زجان نثار خود گفت

۱ب. حال دل ریش روبرو یم ۲ب. گوید دُر اشک مو بمویم ۳ب. بنوده ۴ب. گشته ب. حال ۵ب. یہ لفظ چھوٹ گیا ہے ۶ب. بگفت ۷ب. زجاں نثار می گفت۔

یک سرنه گرم مزار باشد | صرف رہ شہریار باشد
جانم چو رود زپیکر من | خواہم کہ ز دیدہ و سر من
در عرصہ شاہ کوی سازی | تا شاہ کند بگوی بازی
وآنگاہ مرا ز روی یاری | در منزل خاک چوں سپاری
از روی وفا و مہربانی | بر تربت من اگر توانی
گوی نہی و صولجانی | کز پاو سرم بود نشانی
زینساں چو بہمدمش سخن رفت | بس بر سر حال خویشتن رفت
ہر سوی بہ جستجوے می گشت | بر روی زمیں چو گوی می گشت
می تاخت چو گوی گرد میداں | می ساخت ز دود آہ چوگاں
بر ہر طرفی کہ راہ کردی | حیراں بہ زمیں نگاہ کردی

گفتن درویش حال خود با گوی

ناگاہ ز دور دیدہ گوی | سرگشتہ و خستہ دل چو اوی
سرگشتہ گوی بے قراری | رقاص بساطِ خاکساری
برخاک نیاز رو نہادہ | وز سر ہمہ آرزو نہادہ
از چرخ بسی جفا کشیدہ | در عاشقی آزہا کشیدہ
گرد ستمش برو نشستہ | آوازۂ او برو نشستہ
خشک و تر روزگار دیدہ | درد سر بے شمار دیدہ
صد کوبہ روزگار خوردہ | صد زخم ز دست یار خوردہ
در کوی وفا دویدہ عمری | با باد ہوا دویدہ عمری
ہم کردہ بباد ہم عنانی | ہم کردہ بخاک سرگرانی

اب۔ کہ ۔ ب ۔ بر سرو کار ۔ ب ۔ در گفتن راز گوی و درویش ۔ ب ۔ بلا ۔ الف ۔ یہ دونوں اشعار نہیں ہیں ۔ ب ۔ ب

درویش دوید بر سر او	وز پای نشست در بر او
تا حال گذشته باز گوید	با گوی شکسته راز گوید
القصه بگوی راز دل گفت	وز عجز خود و نیاز دل گفت
چون گوی شنید گفتگویش	بر خاک قدم نهاد رویش
از فرق نخست راه رفتش	وآنگه بزبان حال گفتش
کای شیفته ستم کشیده	صدگونه بلا و غم کشیده
بردار ز خاک راه رویم	تا پیش تو سرگذشت گویم
گویم چه گذشت بر سر من	وز چرخ چه گشت بر سر من
من نیز دل شکسته دارم	همچون تو درون خسته دارم
آن روز که حال من نکو بود	در پیش شهم صد آبرو بود
می کرد چو شه نگاه در من	حسرت می خورد ماه بر من
صد بار بدور من مه و خور	از رشک زدند بر زمین سر
امروز که ریخت آبرویم	فرقی نبود ز خاک کویم
از گردش روزگار دوار	ناگاه سر آمدم بدیوار
از بازی چرخ این عجب نیست	دنبال کدام روز شب نیست
گر روز و شب است وگر مه و سال	پیوسته کجا بود بیک حال
مه گرچه بدان کمال باشد	گه بدر و گهی هلال باشد

خطاب کردن درویش با چوگان

از کوی چو در گذشت درویش | چوگان شکسته دید در پیش
افتاده و پا دراز کرده | پیوند ز غیر باز کرده
از دست شده ز کار مانده | وز پای فتاده زار مانده

لـ ب بر سر ۔ ی بر ... بعد ازین قصہ صولجان و درویش ... ب ۔ یلہ

سرباختن اختیار کرده — سر در سر عشق یار کرده
چون زلف بتان فتاده در پای — سر داده بباد و پای برجای
از جور سپهر خم گرفته — در پیش رهِ عدم گرفته
پا در گذرِ بلا[۱] نهاده — سر نیز بجای پا نهاده
پا در گل و مانده سر بزانو — نی زور قدم نه زور بازو
برخاک نهاده پهلوی خویش — انداخته خم در ابروی خویش
درویش که حال ازو بتر داشت — از مهر سرش زخاک برداشت
در صورت حال او نظر کرد — آهی زد و حالتی دگر کرد
آن بیهده گوی درد پرورد — برداشت خروش از سر درد
حال دل خود بصولجان گفت — از دل نه که از میان[۲] جان گفت
چوگان چو شنید حالت او — پرحال شد از مقالت او
سرتا بقدم همه زبان شد — آنجا همه تن زبان توان شد
گفتا که برین خمیده قامت — روزی گذرد بصد قیامت
من هم غم[۳] روزگار دارم — صد شکوه ز دست[۴] یار دارم
روزی[۵] که بدست شاه بودم — سر بر سر گوی ماه بودم
گه بر سر دوش شاه بودم — گه فرق سرم بماه سودم[۶]
گه سرزنش هلال کردی — گه در پی گوی حال کردی[۷]
امروز[۸] که مانده بر زمینم — برخاک نشسته این چنینم
کس را چه خبر ز زاری[۹] من — وز خواری[۱۰] و خاکساری من
درویش چو دید زاری او — وان زاری و بیقراری او
اشک دمژه گوی و صولجان کرد — هر گوی بگوشه روان کرد

۱- بلند ... ۲- زبان ... ۳- شکوهٔ روزگار دارم ... ۴- دوری ... یہ دونوں اشعار نہیں ہیں ... یہ شعر نہیں ہے ... دونوں نسخوں میں "خاری" ہے لیکن "زاری" درست ہے۔

از سیم سرشک گوی می ساخت   در صحن دو دیده گوی می باخت

چنداں کہ ز حال خویش می رفت   آتش ز دو دیده پیش می رفت

می رفت و زمین بدیده می رفت   حال دل غم رسیده می گفت

با خود ہمہ شب مقال می کرد   می گشت چو گوی و حال میکرد

میدان ز دو دیده آب می زد   وز ہر مژه راه خواب می زد

چوں گوی بہر سبیل می گشت   وز دیده بگرد میل می گشت

گہ بر سر و دیده خاک می کرد   گہ خاک بدیده پاک می کرد

گہ بر سر جایگاه می رفت   گہ بر سرِ راه شاه می رفت

دَر چوگان بازی شاہزاده گوید

تا روز دگر کہ خسرو چیں   از مہر نمود گوی زرّیں

شہزاده چنیں ز خواب خواست   چوں مہر برخ جہاں بیاراست

پوشید یکی قبای چینی   وز نہایت لطف و نازنینی

بر فرق نہاد تاج شاہی   بر بست کمر چنانکہ خواہی

از زر کمری کہ بر میاں بست   گوی کہ بقصد آں جواں بست

خالی چوں نبود از خیالش   می خواست نظر کند بحالش

زاں روی بدی چو آفتابش   آں روز بر فتن اضطرابش

زیں گفت نہند بر سمندی   کس بود سپہر نعل بندی

زیں نرم روی فراخ گامی   آراستہ از زرش لگامی

گردوں گردی زمیں نوردی   کز چشمۂ مہر آب خوردی

آہو روشی پلنگ خوی   چوگانی کرد ہمچو گوی

در پویہ ز باد گوی بردی   میداں ہوا زمیں شمردی

۱۔ یہ شعر نہیں ہے ۔ ب ۔ چوگان بازی ش ۔ دگر روز ۔ ب ۔ یہ شعر نہیں ہے ۔ ب ۔ بخوان

نی آب بر ابرش دویدی | نی باد بگرد او رسیدی
بر گوی بجائیکی ستادی | چابک تر ازو نبود بادی
چون باد اگر بند قرارش | شهزاده چو باد شد سوارش
پیش و پسش از بتان سپاهی | هر یک چو ستاره او چو ماهی
بر دوش گرفت هر جوانی | مانند هلال صولجانی[1]
در حسن زمه زیاده بودند | هم بازی شاهزاده بودند
این حلقهٔ زر کشیده در گوش | وان حلقهٔ زلف در بناگوش
این جعد سیاه تاب داده | وان خنجر غمزه آب داده
این طرف کلاه برشکسته | وان بر گل تر کلاله بسته
این دست ز سیم ناب برده | وان گوی ز آفتاب برده
این گوی نموده از زنخدان | وان از سر زلف کرده چوگان
این کرده بزه کمان ابرو | وان بسته گره کمند گیسو
این صف شکن بتان چینی | وان غنیته لعبتان چینی
این هر دو بگوی سیم غبغب | صد دست کرو ز ماه نخشب
آن برده ز لعبت خطای | صد بار سبق بدلربای
شهزاده و آن بتان که بودند | جون ماه و ستاره می نمودند
نظارگیان ز هر کناره | دیدی مه و گرد او ستاره
شهزاده چو از کنار میدان | انداخت نظر بگوی و چوگان
چون[1] شه سر خود نهاد بر دست | گوی از شادی زجای برجست
در خدمت آن بتان بروی | آرام نداشت بر زمین گوی
شاه از همه گوی حسن می برد | می دید ز دور و خلق می برد
گوی کرشه از میان ربودی | آن در خم صولجان نمودی

۱؎ ب - یہ دونوں اشعار نہیں ہیں۔

چوگان ہلال و گوی گردون | چون صورت لام و نقطهٔ نون
یا صفر و الف برابر ہم | افتادہ نمودہ در خور ہم
یا ماہ برج تواماں رفت | یا مہر بخانهٔ کماں رفت
یا طرهٔ و خال در بر او | یا قامت عاشق و سر او
شہزادهٔ چین و گوی بازی | درویش چو شمع جانگدازی
شہزادہ و صولجان و خوبی | درویش و چو گوی پای کوبی
شہزادہ و قصد گوی بردن | درویش و خیال جان سپردن
شہزادہ و گوی و حال کردن | درویش و سماع و حال کردن
شہزادہ بحسن خویش مغرور | درویش بعشقبازی از دور
شہ گوی زدی و حال گفتی | درویش بہ صد خیال گفتی
کاشم سر و دیدہ گوی بودی | تا شاہ بصولجان ربودی

در فوت گدای زار گوید

ناگاہ چو نگاہ شاہزادہ | افتادہ بران ز پا فتادہ
صد شوخی و دلبری نمودش | وز چستی و چابکی کہ بودش
گوی بہ کرشمہ سویش انداخت | آن گاہ بناز بر سرش تاخت
برنگ نشرہ بود درویش | انداختہ سر چو صولجان پیش
آتش زدہ بود و مضطرب حال | افتادہ چو لالہ بر زمین لال
زان بی سر و پا چو گوی خود جست | برجست چو گوی از زمین جست
بر آتش دل چو آب زد جوش | کآواز شہش رسید در گوش
اول بدو دیدہ و سر آمد | گرد سر گوی شہ بر آمد

---

۱ ب۔ با صورت نون و نقطهٔ نون ۲ ب۔ و آب گوی اری ۳ ب۔ یہ لفظ یہاں چھوٹ گیا ہے۔ ۴ الف۔ یہ شعر نہیں ہے۔ ۵ ب۔ جان یا تن روان درویش ۶ ب۔ ناگہ چو

وآں گاہ بگریہ آہ برداشت وان گوی ز خاک راہ برداشت
چوں بود ز جام بیخودی مست جاں گوی صفت نہاد بر دست
باگوی بدست شاہ جاں داد جاں خوشتر ازیں کجا تواں داد
جاں باخت رواں و از جہاں رفت آساں تر ازیں کجا تواں رفت
درویش کہ حالتی چنیں داشت گوی تو کہ جاں در آستیں داشت
از ہر کہ دریں بساط سر باخت چوگانِ عشق بیشتر داشت
از عالم سر چو باخبر بود گوی کہ نخست باخت سر بود
زیں حال خبر نیافت مجنوں ویں سلسلہ در نیافت مجنوں
ایں درد کجا کشید فرہاد ویں زہر کجا چشید فرہاد
ایں بیہدہ کرد بی سر و پا واں خاک نشینِ باد پیما
می گشت بہر طریق چوں گوی ناگاہ نہاد سر دریں کوی
چوں گوی ہزار بی سرش گشت تا حال چنیں میسرش گشت
جانی داد و کراں از جہاں برد دستی زد و گوی از میاں برد
دلدار بجست جاں بدنبال آخر ہمہ را بود ہمیں حال
در راہِ وفا قدم ز سر ساخت تا آخر حال گوی سر باخت
تا مرحلہ کہ ہست در پیش رخت از سر حال بست درویش

در حالت شاہ بہر درویش

آں حال چو دید شاہزادہ فی الحال ز اسپ شدہ پیادہ
چوگاں بشکست و گوی انداخت میدان دل از نشاط پرداخت
سررشتۂ عشق داد از دست چوگان طرب نہاد از دست

یہ شعر نہیں ہے ... یہ اشعار 'ب' میں نہیں ہیں ... یہ عنوان تو ہے مگر یہ بلا سات اشعار جو اس عنوان کے تحت نسخہ 'الف' میں ہیں وہ یہاں نہیں ہیں اس حصہ کا آغاز اس مصرعے سے ہوتا ہے "چوں قامت من ز دست دوراں"

بر خاک نشست و زار بگریست ‏ ‏ ‏ ‏ چون ابر که در بہار بگریست
بر برگ سمن گلاب می ریخت ‏ ‏ ‏ ‏ سیارہ بر آفتاب می ریخت
از تاب دل اضطراب می کرد ‏ ‏ ‏ ‏ مہ گرمیٔ آفتاب می کرد
وز عشق اگرت خبر ز خویش است ‏ ‏ ‏ ‏ از جانب دوست عشق بیش است

در خاک سپردن درویش[۱]

شہ را چو بحال او نظر بود ‏ ‏ ‏ ‏ ہم بر سر جایگاہ فرمود
کز راہ وفا کنید خاکش ‏ ‏ ‏ ‏ جای ز برای جسم پاکش
تا من چو بدین طرف گر آیم ‏ ‏ ‏ ‏ گرد سر خاک او بر آیم
در خاک چو پیکرش سپارید ‏ ‏ ‏ ‏ بر لوح بخون دل نگارید
کیں بود کہ داد داد در عشق ‏ ‏ ‏ ‏ دیں بود کہ سر نہاد در عشق
ایں بود کہ جاں فدای دل کرد ‏ ‏ ‏ ‏ سر صرف رہ ہوائی دل کرد
ایں بود کہ قدر عشق دانست ‏ ‏ ‏ ‏ بر خواست ز کوی سر توانست
ایں بود کہ جاں بر د در حال ‏ ‏ ‏ ‏ شد زندۂ عشق و مُرد در حال
ایں بود کہ عشق پاک ورزید ‏ ‏ ‏ ‏ کس چو ہر جان جوی نیرزید
ایں بود کہ نقد جاں رواں باخت ‏ ‏ ‏ ‏ دل کرد گرو بہ عشق و جاں باخت
زیں گونہ کسی کہ عشق بازد ‏ ‏ ‏ ‏ معشوق بہ عشق او بنازد

در صفت عشق بازی گوید[۲]

ای بستہ میاں بہ عشق بازی ‏ ‏ ‏ ‏ در عشق بود کمینہ بازی
نقد دل و جاں ز دست دادن ‏ ‏ ‏ ‏ سر باختن و ز پا فتادن

۱؎ ب میں نسخہ میں نہ تو یہ عنوان ہے اور نہ یہ اشعار ملتے ہیں۔ ج یا س نسخہ میں یہ عنوان بھی نہیں ہے کہ اس کے ابتدائی چار اشعار بھی نہیں ہیں۔ البتہ آخری تین اشعار 'جاں یافتن رواں درویش' کے عنوان کے تحت اس نسخہ میں موجود ہیں۔

عاشق نبود که جاں نبازد | وز بہر گوی رواں نبازد
عاشق ز بلا گذر ندارد | اندیشۂ جاں و سر ندارد
عاشق که بترک سر نه گوید | در عشق به از دگر نه گوید
زیں حال که گفتمت نشانی | گر عاشق و عارفی بدانی
آنرا که به عشق اہتمام است | در عشق ہمیں قدر تمام است

در[1] حسب حال و تاریخ اتمام کتاب گوید

چوں قامت من ز دست دوراں | خم گشت[2] مثال نون و چوگاں
پنجاه[3] گذشت سال عمرم | یک نیم شکست بال عمرم
چوگانی فکر آزمودم | گوی سخن از میاں ربودم
زاندیشه در خیال سفتم | ویں نامه زروی حال گفتم
گفتم سخنی کزو بگویند | ارباب سخن بدیده گویند
گوی سخنم که حال دارد | ہم صنعت و ہم خیال دارد
زیں رو سخنم ہمه خیال است | زاں روی دگر تمام حال است
خالی ز خیال نیست حرفی | بی نقطه خال نیست حرفی
حرفی ز خیال نیست خالی | میدان سخن مراست حالی
ہر بار که یک خیال بستم | صد بار ز جا چو گوی جستم
ہر شب که دریں خیال بودم | گه بدر و گہی ہلال بودم
یعنی که ز فکر تم تن و جاں | گر گوی نمود و گاه چوگاں
آں[4] گو سخنی چو موی دارد | با من سر گفتگوی دارد
اینک[5] شه عادل سخن داں | اینک من و او و گوی و چوگاں

---

[1] در حالت شاه بہر درویش" عنوان ہے جو مضمون سے مطابقت نہیں رکھتا معلوم ہوتا ہے کہ کاتب سے سہو ہوا ہے اس لیے نہ تو اس
[2] اس عنوان کے تحت جو اشعار اصل نسخہ یعنی "الف" میں ہیں لے لکھا ہے اور نہ ہی پیش نظر عنوان لکھا ہے ... یہ اشعار نہیں ہیں
[3] ... ب ... فاش

کو در نظر آی اگر تواند — تا چند ز دور قصه خواند

دائم که چو این خیال بازد — برخیزد و کار خود بسازد

این نامه که ساختم تمامش — حالی شده و حالنامه نامش

صدره ز خیال حالنامه — از حال به حال رفت خامه

از حیرت حال نامهٔ من — دیگر شده حال خامهٔ من

این حال که شعر عارفی راست — ناید صفتش بهر قلم راست

این گفته که سر بسر خیال است — سحریست که آن مرا حلال است

در اوج بلندی آن مه نو — کز مشرق جان گرفته پر تو

کردم بدو هفته بهر نامش — همچو مه چارده تمامش

این نظم که چون دریست غلطان — در رشته برای گوش سلطان

چون بر عددش قلم نهادم — بر پانصد و یک رقم نهادم

گفتم که کنم زیاده گوئی — دل گفت زروی مهر جوی

کم گوی و لطیف همچو دُر گوی — کز اهل صواب نیست پُر گوی

ای آنکه معاینه ندانی — تاریخ بیان این معانی

چون کوکبهٔ سحر نماید — روشن بتو "گوی نور" نماید

این نقش که طبع بنده پرداخت — این گوی که از زر سخن ساخت

بادا همه وقت دست گردان — تا گوی سپهر هست گردان

در خاتمه کتاب گوید

این بخت سرم بلند کردی — زین نامه ام ارجمند کردی

این حال نبود در خیالم — تا گه تو شدی قرین حالم

۱؎ ب۔ یہ شعر نہیں ہے۔ ۲؎ "گوی نور" سے سال تصنیف مثنوی ۸۳۲ھ برآمد ہوتا ہے۔

باعث شدیم بدیں رسالہ — کردی بجناب شہ حوالہ

بر رُخ در دولتم کشودی — بر گنج مراد رہ نمودی

تا من ز سر خیال بندی — گفتم سخنی بدیں بلندی

گر گوی سخن بہ مہ رساندم — از دولت پادشہ رساندم

شہ را چو بدیں نگاہ افتاد — صد بار قبول شاہ افتاد

بخشید مرا بہ لطف بسیار — چوگانی و صد ہزار دینار

تا ہست فلک بقای شہ باد

بر دست ملک دعای شہ باد

ب - یہ شعر نہیں ہے۔ ب: الف چوگان زر دو ھزار دینار۔ "چوگانی" بمعنی تربیت یافتہ گھوڑا جو چوگان بازی میں مشّاق ہوتا ہے۔ یہاں "چوگانی" ہی زیادہ مرجّح ہے۔

جناب زاہد منیر عامر

شعبۂ اردو اورینٹل کالج
پنجاب یونیورسٹی لاہور
پاکستان

دیوانِ میر سوز کا نسخۂ کراچی

سید محمد میر سوز ۱۱۳۶ھ/ ۲۴-۱۷۲۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے فارسی اور عربی علوم کی تعلیم کے ساتھ مختلف فنون کی تربیت بھی حاصل کی۔ ان کے والد اپنے زمانے کے اچھے تیر انداز تھے۔ سوز نے بھی تیر اندازی میں کمال پیدا کیا۔ احترام الدین شاغل نے "صحیفۂ خوش نویساں" میں ان کا ذکر ایک اچھے خوش نویس کے طور پر کیا ہے[1]۔ قایم چاند پوری[2] اور بہت سے دوسرے تذکرہ نگاروں کے ہاں ان کے شفیعا اور نستعلیق میں کمال کا پتہ چلتا ہے۔ ہمارے پاس ان کے دیوان کا ایک خود نوشتہ نسخہ کا عکس محفوظ ہے جس کا ہر ورق میر سوز کی خوش نویسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ شہ سواری اور سپہ گیری سے بھی شغف تھا۔ اسپرنگر[3] نے مردانہ کھیلوں میں مہارت کا تذکرہ کیا ہے۔ محمد حسین آزاد[4] کے مطابق ان کی طاقت خداداد اس قدر تھی کہ ہر ایک ان کی کمان کو چڑھا نہ سکتا تھا، موسیقی سے بھی دل چسپی تھی، ستار نوازی میں بھی دست رسا رکھتے تھے۔

اپنے عہد کی فضا سے متاثر ہو کر شعر گوئی کا آغاز کیا اور میر تخلص سے متخلص ہوئے گمان کیا جاتا ہے کہ سوز نے میر تخلص میر تقی میر سے متاثر ہو کر رکھا لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے رام بابو سکسینہ ہماری اس تردید کی تصدیق کرتے ہیں[5] تاہم جب میر تقی میر نے ملک سخن کی تاجوری حاصل کر لی تو سید محمد میر نے تخلص تبدیل کر لیا اور میر سے سوز کہلانے لگے۔ ہماری تحقیق کے مطابق تخلص کی یہ تبدیلی ۱۱۷۵ھ/ ۶۲-۱۷۶۱ء کے اواخر یا ۱۱۷۶ھ/ ۶۳-۱۷۶۲ء کے آغاز میں عمل میں آئی[6]۔

سوز نے احمد شاہ کی حکومت کے زمانے (۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء تا ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۴ء) میں شاہی توپ خانے کی ملازمت بھی اختیار کی۔ اس ملازمت میں قائم چاند پوری بھی ان کے شریک تھے[7]۔ نادر شاہ کے حملوں سے جب سلطنت کا رہا سہا اعتبار بھی ختم ہو گیا تو سوز نے بھی دہلی کو خیر باد کہا اور تلاشِ روزگار میں فرخ آباد جا پہنچے یہاں قسمت نے یاوری کی اور انھیں نواب احمد خاں بنگش کے چہیتے رکن دربار مہربان خاں رند کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ ان کے بعد سودا بھی وہاں آ گئے اور اس طرح رند، سودا اور سوز میں گاڑھی چھننے لگی۔ رند یار باش اور مجلس پسند آدمی تھے۔ میر حسن نے رند کو "با اہل سخن ہمیشہ سرگرم سخن و با صاحب ہر فن چوں روح در تن[8]" قرار دیا ہے۔

رند کو بقول مفتی ولی اللہ فرخ آبادی "دیوان کی سرکار میں بہت عزت[9]" حاصل تھی اور یوں بھی ان

ریاستوں میں خوش حالی نے دم نہیں توڑا تھا اس لیے یہ قیام بہت یادگار رہا لیکن نواب احمد خاں بنگش کی وفات (جولائی ۱۷۷۱ء/ ربیع الاول ۱۱۸۵ھ) کے ساتھ جہاں یہ دیوانی ختم ہوئی وہاں رند و سوز کی صحبت بھی برہم ہوگئی۔

سوز یہاں سے فیض آباد اور فیض آباد سے لکھنؤ چلے گئے۔ جہاں انھیں نواب آصف الدولہ کی اُستادی میسر آگئی۔ سوز اور آصف الدولہ میں جلد تعلق خاطر پیدا ہوگیا احمد علی خاں یکتا نے دستور الفصاحت میں لکھا ہے کہ:

"آصف الدولہ سچے دل سے ان کی بامزہ صحبت کے عاشق تھے اور بہت عزت واحترام سے پیش آتے تھے۔"

میاں میر تقی میر بھی ان کی طرح آصف الدولہ کی ملازمت میں تھے لیکن ان تینوں اصحاب کے درمیان ویسی کوئی مساوات قائم نہ ہوسکی جس نوع کی صحبت رند، سوز اور سودا کی رہی۔ ۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء میں نواب آصف الدولہ کے انتقال سے یہ صحبت بھی برہم ہوگئی۔ سوز اس حادثے سے دل برداشتہ ہوئے، انھوں نے مرشد آباد اور ٹانڈہ وغیرہ کا رخ کیا لیکن پریشان خاطری کے تسلسل کے باعث واپس لکھنؤ چلے آئے یہاں انھیں زندگی کا سب سے بڑا سانحہ پیش آیا — سوز کے لکھنؤ پہنچنے کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کا جواں سال بیٹا میر مہدی انتقال کرگیا۔ اس صدمے نے سوز کو ہلاکر رکھدیا۔ میر مہدی کی یاد میں لکھے ہوئے سوز کے اشعار ان پر اس حادثہ کے اثرات کا پتہ دیتے ہیں۔ بیٹے کی وفات کے دو ماہ بعد ہی سوز (۱۲۱۳ھ/ ۹۹-۱۷۹۸ء) نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

ناسخ نے تاریخ کہی:

اٹھ گیا میر سوز دنیا سے	ہائے صاحب کمال واویلا
سال تاریخ ہے یہی ناسخ	شاعر بے مثال واویلا

سوز کی زندگی کا اہم ترین اور یادگار دور وہی ہے جو انھوں نے مہربان خاں رند اور مرزا رفیع الدین سودا کی معیت میں بسر کیا۔ یہ دور جہاں سوز کی خوش حالی کے اعتبار سے اہم ہے وہاں سوز کے فنی مطالعے میں بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مہربان خاں رند شعر و سخن سے غایت دلچسپی رکھتے تھے لیکن غالباً خود موزونی طبع کی نعمت سے محروم تھے یا اپنے ملازم (یا اس دور کی اصطلاح میں اُستاد) شعراء سے کلام لکھوایا کرتے تھے سوز نے ان کے لیے کلام لکھا۔ آیا یہ کلام سوز نے انھیں لکھ کر بخش دیا یا بعد از اں اسے پھر اختیار کرلیا؟

آج کی صحبت میں ہم دیوان میر سوز کے جس قلمی نسخے کی بابت معلومات فراہم کر رہے ہیں اس کا مطالعہ اسی حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔

دیوان میر سوز اب تک مرتب ہوکر شائع نہیں ہوا ہے البتہ اس کے متعدد قلمی نسخے بعض کتب خانوں میں

محفوظ ہیں جن کا مفصل تعارف ہم نے دیوانِ میر سوز کی ردیف الف کے مقدمے میں کرادیا ہے۔[۱۱]

اس وقت میر سوز کے جس مخطوطے کا عکس ہمارے پیشِ نظر ہے وہ ۲۱.۵ سم × ۱۵.۵ سم سائز کے ۲۴۸ اوراق پر مشتمل ہے۔ سید میر (کاتب) کا صاف نستعلیق میں لکھا ہوا نسخہ ترقی اردو بورڈ کراچی (پاکستان) کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

چونکہ ہمارے محققین اور نقادوں نے سوز کی طرف بہت کم توجہ دی ہے اس لیے دیوان میر سوز کا یہ مخطوطہ بھی بالعموم نگاہوں سے اوجھل رہا ہے اس کا اولین بالوضاحت تذکرہ فائق رام پوری نے اپنے ایک مضمون میں بدین الفاظ کیا تھا:

"ایک نسخہ غالباً ۱۲۴۵ھ کا مکتوبہ احسان دانش صاحب کی ملکیت رہ چکا ہے"۔[۱۲]

یہاں غالباً کے لفظ سے گمان ہوتا ہے کہ جب یہ تحریر لکھی گئی، فائق صاحب نے وہ نسخہ نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ احسان دانش کی ملکیت میں رہا تھا کیونکہ "رہ چکا ہے" کے الفاظ نسخہ کے دانش کے ہاں عدم وجود کو ظاہر کر رہے ہیں۔

جب ہم اس عبارت کو اردو نامہ کے اولین شمارہ میں شائع شدہ ایک مختصر تحریر سے ملاتے ہیں تو ہمیں اس نسخے کے سفر کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے احسان دانش کے ہاں سے کدھر کا رخ کیا۔ اردو نامہ کے اولین شمارہ کی ایک مختصر تحریر بعنوان نادرات (لکھنے والے کا نام درج نہیں) میں ذیل کا جملہ موجود ہے۔

"میر سوز کا کلام ان دنوں نایاب ہے لیکن ترقی اردو بورڈ نے ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۲۴۵ھ حاصل کر لیا ہے"۔[۱۳]

اس کے بعد یہ تذکرہ پھر وقت کی گرد تلے گم ہو گیا اور قریباً بیس برس بعد مشفق خواجہ کے مرتبہ و محققہ جائزہ مخطوطات اردو جلد اول کے ذریعے اس کا نہ صرف یہ کہ تذکرہ زندہ ہوا بلکہ مفصل تعارف بھی اہل علم تک پہنچا[۱۴] کہ اس میں غزلیات کی تعداد ۲۷۰ ہے اور اشعار کی مجموعی تعداد ۱۳۱۴ ردیف الف ۱۳۹، نون ۸۵، واو ۰۶۴، را ۰۳۲ تا ۱۱، لام ۱۵، میم ۱۳، ہائے ہوز ۱۷، ثا، جیم، ذال معجمہ، صاد، ضاد، ظوئے ایک ایک۔ خا، شین، عین، غین، قاف میں دو دو اور باقی ردیفوں میں دو سے زائد اور دس سے کم غزلیات ہیں۔

مشفق خواجہ نے اس کے اوراق کا شمار دیا ہے جو ۱ الف تا ۲۴۸ ب ہے۔ ہمارے پاس اس نسخے کا جو عکس موجود ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اب اس نسخے پر صفحات کے نمبر بھی لگا دیئے گئے ہیں اور یوں اس کے صفحات کی تعداد ۴۹۶ ہے۔

آغاز: جز شکر قلم صفحہ پہ خلاق جہاں کا — چاہے جو کرے وصف تو منہ کیا ہے زباں کا

اختتام: یہ میں مت کہ چہرہ سوز — تو میں میں بہانہ سوز

ترقیمہ: تمت تمام شد کارمن نظام شد کاتب الحروف احقر العباد سید میر علی اللہ عنہ تحریر فی التاریخ شہر جمادی الثانی روز شنبہ ۱۲۴۵ھ (نومبر دسمبر ۱۸۲۹ء)

ہر کہ خواند دعا طمع دارم — زانکہ من بندۂ گنہ گارم

اس نسخے کا احسان دانش کی ملکیت میں رہنا صفحۂ آخر پر احسان دانش کے دستخطوں سے ثابت ہے ——

"احسان دانش کاندھلہ ضلع مظفر نگر ۱۸ر جولائی ۱۹۳۹ء" علاوہ ازیں صفحہ اول پر بھی احسان دانش کی ایک تحریر ہے۔

"اب تک جتنے مضامین میں حوالے دیئے گئے ہیں ان میں سب سے مکمل ترین نسخہ ہے۔"[۱۵]

اب ہم اس نسخہ کے سب سے زیادہ توجہ طلب پہلو کی جانب آتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس میں آغاز سے لے کر صفحہ نمبر ۳۰ تک کی غزلیات کے تمام مقطعوں میں تخلص پر سیاہی پھیر دی گئی ہے —— اس طرح کہ یہ تخلص بالکل پڑھنے کے قابل نہیں رہا گو بعد میں کسی اور شخص نے ایک دوسرے اور نسبتاً بھدے قلم سے سطور کے اوپر سوز لکھ رکھا ہے لیکن غالباً یہ زمانہ بعد کی اصلاح ہے۔

گذشتہ اوراق میں واضح کیا جا چکا ہے کہ سوز، رند کے ہاں ملازم رہے اور اس حیثیت میں وہ رند کو کلام لکھ کر دیتے رہے، ہم زیر نظر مخطوطے کے مقطعوں میں مٹائے گئے تخلص پر رند کا قیاس کرتے ہیں کہ کاتب نے یہ غزلیات کلام رند سمجھ کر کتابت کی ہوں گی لیکن بعد ازاں کسی قاری یا مصحح نے حقیقت حال سے واقفیت کی بنا پر ان میں تخلص درست کر دیا۔ لیکن ہمارے اس قیاس پر دو اعتراضات ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ جو کلام سوز، نے رند کے لیے کہا اسے پھر دیوان سوز میں کیونکر شمار کیا جا سکتا ہے۔ دوم یہ کہ سوز کی طرح سودا بھی رند کے ملازم تھے کیا ضروری ہے کہ رند سے منسوب کلام کا تعلق سوز سے ہی ہو وہ سودا کا کلام بھی ہو سکتا ہے!

پہلے اعتراض کا جواب ہمیں سعادت خاں ناصر کے تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا سے ملتا ہے ناصر نے ترجمۂ رند میں لکھا ہے:

"اکثر وہی غزلیں میر سوز صاحب کے دیوان میں موجود اور نام رند کا ان میں سے نابود یہ نہ چاہیے جو چیز بالعوض گئی ہو اس کا دعویٰ انصاف سے بعید ہے واللہ اعلم بالصواب۔"[۱۶]

مشفق خواجہ کی تحقیق کے مطابق سعادت خاں ناصر تیرہویں صدی ہجری کی دوسری دہائی میں پیدا ہوئے۔[۱۸] یہ زمانہ میر سوز کے انتقال کا ہے اس اعتبار سے ناصر، سوز کے قریب تر تذکرہ نگار ہیں اور ان کی بات بنیادی اہمیت دیئے جانے کی مستحق ہے اور ناصر کے متذکرہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رند کی راجدھانی ختم ہونے پر سوز نے وہ

کلام جو وہ رند کو لکھ کر دیتے رہے خود اختیار کر لیا تھا اور اسی بات پر ناصر نے ترجمہ رند میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

اب آیئے دوسرے ممکنہ اعتراض کی طرف:

میر حسن نے ترجمہ رند میں لکھا ہے:

"بسیاری کلامش راچوں کلام سودا و میر سوز سر لوح دیوان خود می انگارد"[۱۹]

قدرت اللہ شوق نے طبقات الشعرا کے ترجمہ رند میں لکھا:

"اکثر اشعار در دیوان او یافتہ شد کہ آں را میر سوز نسبت بطرف خود می کند و بعضی گویند کہ از مرزا رفیع است والعلم عنداللہ"[۲۰]

قدرت اللہ شوق نے کسی قدر ملحقات کی تفصیل بھی دی ہے اور آخر میں لکھا ہے:

"علیٰ ہذا القیاس اکثر غزلیات مربوط و مضبوط کہ داخل دیوان اوست آنرا بہ مرزا رفیع و میر سوز وغیرہ نسبت می کنند۔ خدا داند کہ واقعہ از کیست"[۲۱]

قاضی عبدالودود نے ایک مضمون میں شوق کا جو اقتباس دیا ہے اس کے مطابق:

"رند کے دیوان میں جو پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے سودا و سوز کے بکثرت اشعار ہیں"[۲۲]

یہی وجہ ہے کہ مختلف تذکروں میں رند کا انتخاب دیتے ہوئے متعدد تذکرہ نگاروں نے سوز کے اشعار درج کیے ہیں کچھ یہی حال سودا اور سوز کے کلام کا بھی ہے کلیات سودا مرتبہ عبدالباری آسی اور نسخہ مصطفائی میں متعدد غزلیں ایسی ہیں جو مقطعوں کے مصرعہ اولیٰ کے علاوہ) بعینہٖ دیوانِ سوز میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر ولی الحق انصاری نے بھی ایک مختلف مبحث میں اس موضوع کیطرف اشارہ کیا ہے کہ:

"سوز اور سودا کا کلام خلط ملط ہو گیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ قدیم نسخہ سودا کا ہے یا سوز کا جس میں متنازعہ فیہ کلام شامل ہے اس سے اندازہ ہو گا کہ مہربان خاں رند کے کلام میں صرف سوز کا حصہ ہے یا سودا کا بھی میری تحقیق کے مطابق بہت سی غزلیں جو سوز کی قرار دی جا رہی ہیں وہ حقیقۃً سوز کی نہیں"[۲۳]۔

یہ تمام اقتباسات و نکات اس اعتراض کی تائید کرتے ہیں کہ کیا ضروری ہے کہ رند سے منسوب کلام کا تعلق سوز سے ہی ہو وہ کلام سودا کا بھی ہو سکتا ہے! اب ہم اس اعتراض کا جائزہ پیش کرتے ہیں:

سودا کے کلام کے ضمن میں نسخہ جانسن کو سب سے زیادہ مستند مانا گیا ہے کیونکہ یہ سودا کی زندگی میں کتابت ہوا اس نسخے کی تاریخ کتابت ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے اکتوبر ۱۷۸۰ء (مطابق شوال ذی قعدہ ۱۱۹۴ھ) اور جون

۱۷۸۱ء (مطابق جمادی الآخرہ ۱۱۹۵ھ) کے درمیان قرار دی ہے۔ میر سوز کا انتقال ۱۲۱۳ھ / ۹۹-۱۷۹۸ء میں ہوا۔ گویا اس نسخے کی کتابت کے وقت سوز بھی زندہ تھے۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کے نتائج تحقیق ہمیں بتاتے ہیں کہ کلام سودا کے ضمن میں:

"نسخۂ جانسن تمام نسخوں میں بہتر اور معتبر نسخہ ہے کیونکہ یہ سودا کی زندگی ہی میں اس کی عمر کے آخری حصے میں اسی کی ہدایات کے تحت لکھا گیا اور سوائے مثنوی در ہجو فدوی کے اس نسخے میں اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے الحاقی یا مشکوک قرار دیا جا سکتا ہو۔"[۲۴]

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے اپنے مرتبہ کلیات سودا میں جہاں سودا کا محقق کلام درج کیا ہے وہاں منسوب اور ملحق کلام بھی دیا ہے۔[۲۵] لیکن غزلیات کے چھ حصوں میں کسی حصہ میں بھی ایسی غزلیات نہیں ہیں جو سوز سے بھی منسوب ہوں یا جن کا انتساب رند کی جانب بھی کیا جاتا ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رند سے منسوب کلام کا تعلق صرف سوز سے ہے سودا سے نہیں۔[۲۶]

قاضی عبدالودود اپنے ایک مضمون میں ملحقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اردو میں سودا کے کلیات مطبوعہ میں میر سوز کی سَو سے زیادہ غزلیں داخل ہیں اور ناقدین کرام کلام سودا کی خصوصیات کے بیان میں بے تکلف ان سے کام لیتے رہے ہیں۔"[۲۷]

قاضی صاحب کے اس بیان سے بھی کلام سوز کا سودا سے الحاق معلوم ہوتا ہے قاضی صاحب نے ہی ایک اور جگہ اس بارے میں لکھا ہے:

"دیوانِ رند کے نسخۂ مذکورہ (یعنی نسخۂ کلکتہ - ناقل) کا یہ حال ہے کہ غالباً اس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو سوز کے کسی نسخہ میں نہ ہو لیکن ایک شعر بھی ایسا نہیں جو کلیات سودا کے کسی معتبر نسخے میں موجود ہو۔"[۲۸]

یہ تمام شواہد ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ رند سے منسوب کلام کا تعلق میر سوز سے ہے سودا سے نہیں۔ کلیات سودا کے جن نسخوں میں سوز یا رند کا کلام پایا جاتا ہے وہ ساقط الاعتبار ہیں۔ کم از کم ایک سَو سات غزلیں ایسی ہیں جو سوز کی ہیں لیکن کلیات سودا کے غیر معتبر نسخوں میں پائی جاتی ہیں۔[۲۹]

الحاقات کی اس بحث کے بعد ہم پھر مخطوطے کی طرف رجوع کرتے ہیں، مخطوطے کا املا نستعلیق ہے اس کی خصوصیات درج ذیل ہیں۔

● کاتب الف ممدودہ کی جگہ الف مقصورہ استعمال کرتا ہے ● یائے مجہول اور معروف میں کسی قاعدے کی پابندی نہیں کرتا جہاں یائے مجہول لکھی جا سکتی ہے وہاں معروف اور جہاں مجہول لکھی جانی ہے معروف لکھتا ہے۔ اس میں بالعموم کتابت کی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے ● ہمزہ کی جگہ اس عہد کے رواج عام کے مطابق واؤ معدولہ لائی گئی ہے ● کاف فارسی کی جگہ کاف تازی کا استعمال کیا گیا ہے ● نون غنہ کی جگہ اعلان نون کرتا ہے ● ہائے ملفوظ سے گریز اور ہائے مختفی کی ترجیح

ملم ہے • الفاظ کی حد بندیوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ جا بجا مرکبات وضع کیے گئے ہیں • تکرار حروف کے مقامات پر تشدید استعمال کی گئی ہے۔

جہاں تک غزلوں میں تعداد اشعار کا تعلق ہے تو یہ نسخہ متعدد دانتمیلات پر فضیلت رکھتا ہے لیکن بجائے خود کامل تر نسخہ کہلانے کا حق دار نہیں ہے اس کے مقابلے میں برٹش میوزیم لندن میں محفوظ دیوان سوز کا نسخہ کامل تر ہے اس اعتبار سے نسخے کے آغاز میں احسان دانش کی یہ اطلاع کہ "اب تک جتنے مضامین میں حوالے دیئے گئے ہیں یہ ان میں مکمل ترین نسخہ ہے" درست نہیں ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد اگرچہ لندنی نسخہ سے زیادہ ہے لیکن نسخۂ لندن پندرہ سطری مسطر پر لکھا گیا ہے اور نسخۂ کراچی کا مسطر گیارہ سطری ہے ہر صفحہ میں چار سطریں زیادہ ہونے کی وجہ سے ۳۷۸ صفحات کے اس مخطوطے میں تعداد اشعار ۵۶۷۰ ہو گئی ہے جبکہ نسخۂ کراچی ۴۹۶ صفحات کے باوجود قریباً ۵۴۵۶ اشعار پر مشتمل ہے۔

نسخۂ کراچی میں کہیں بھی غزلوں میں در آنے والے قطعات کو ممیز نہیں کیا گیا جبکہ نسخۂ لندن میں اس امر کا بہت اہتمام ہے۔

اس نسخہ کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اس میں کلام بالعموم میر سوز کے خود نوشتہ نسخہ کے مطابق ہے۔ اگرچہ اشعار کی تقدیم و تاخیر سے یہ بھی محفوظ نہیں ہے۔ اسکی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ نسخہ زمانی اعتبار سے میر سوز کے عہد سے زیادہ قریب ہے۔

ترقی اردو بورڈ کراچی کے کتب خانے میں اس مخطوطے کا داخلہ نمبر ۱۴۳۴ ہے اور مختلف قارئین نے اپنے مطالعے کی یادداشت درج کر رکھی ہے آغاز میں چار صفحات پر مشتمل خلیق نقوی اسکالر اردو بورڈ نے ایک تصحیح نامہ ایزاد کر دیا ہے

اب ہم اس نسخے سے ایک غزل پیش کرتے ہیں اور پھر اس کے مقابلہ کے لیے لندنی نسخہ اور خود سوز کے نوشتہ نسخوں کا متن بھی دیا جائے گا تاکہ نسخے کی متنی حالت کا اندازہ لگایا جا سکے۔

بعہد میر سوز ایک وقت میں شیخ علی حزیں کی غزل:

می گرفتیم بجاناں سر راہی گاہی　　　او ہم از لطف نہاں داشت نگاہی گاہی

کا چرچا تھا مختلف شعراء نے اس زمین میں طبع آزمائی کی۔ سودا نے کہا:

نہیں جوں گل ہوس ابر سیاہے گاہے　　　کاہ ہوں خشک میں اے برق نگاہے گاہے

قلندر بخش جرأت نے کہا:

سرسری ان سے ملاقات ہے گاہے گاہے　　　صحبت غیر میں گاہے سر راہے گاہے

آزاد نے زمانہ بعد سے ذوق (یا بہادر شاہ) کا یہ مطلع بھی دیا ہے:

اس طرف بھی تمھیں لازم ہے نگاہے گاہے | دمبدم لحظہ بہ لحظہ نہیں گاہے گاہے

میر سوز نے اولاً یہ مطلع کہا:

نہیں نکلے ہے مرے دل کی ایاہے گاہے | اے فلک بہر خدا رخصت آہے گاہے

سودا نے اس بندش پر طنز کی اور بقول آزاد کہا "میر صاحب! بچپن میں ہمارے ہاں پشور کی ڈومنیاں آیا کرتی تھیں یا تو جب یہ لفظ سنا تھا یا آج سنا۔"[۲۹]

آزاد نے آب حیات میں سوز کا یہی مطلع درج کیا ہے لیکن مختلف قلمی نسخوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوز نے بعد کو یہ مطلع تبدیل کر دیا تھا۔ اس تبدیل شدہ مطلع کے ساتھ پوری غزل نسخۂ کراچی سے ذیل میں نقل کی جاتی ہے:

یوں تو نکلی نہ مرے دل کی ایاہے گاہے | اے فلک بہر خدا رخصت آہے گاہے
جز تری خاک درائے دوست برب کعبہ | دل میں ہو گر ہوس عزت و جاہے گاہے
نہ شفاعت ہو پیغمبر کی نہ تیرا دیدار | ہو جو فردوس بریں پر بھی نگاہے گاہے
ہے وہ عشاق میں گردن زدنی سوختنی | الم زخم سے جو دل کے کراہے گاہے
نعش کو میری سر راہ ہی رہنے دینا | گر کرے قتل گناہے گاہے[۳۰]
منت باد صبا خاک کو ہے میری یار | ابھی روندے گا وہ پا جل سیاہے گاہے
خرمن عمر بصد جان کروں میں قرباں | اس طرف دیکھے اگر برق نگاہے گاہے
میں تری تیغ کی برش کی کروں سب میں ثنا | تو مرے زخم اٹھائے نہ سراہے گاہے
ایک نے سوز سے پوچھا کہ صنم سے اپنے | اب بھی ملتے ہو بدستور کہ گاہے گاہے
دیکھ منہ اس کا گھڑی ایک میں بھر کر دم سرد | یوں اشارت سے بتایا سر راہے گاہے[۳۱]
بولو اے دوزخیو جھوٹ نہ کہیو اب بھی | سوز سا تم میں ہوا نامہ سیاہے گاہے

اب اسی غزل کی صورت نسخۂ لندن میں ملاحظہ ہو:

یوں تو نکلی تو میرے دل کی ایاہے گاہے | اے فلک بہر خدا رخصت آہے گاہے
جز تری خاک در و دوست برب کعبہ | دل میں ہو گر ہوس عزت و جاہے گاہے

۳ بشفاعت ہو پیمبر کی نہ تیرا دیدار ق ہو جو فردوس بریں بھی لگا ہے گا ہے (کذا)
۴ جان پر برق پڑی کھاتے ہوئے تیری گاہ دل میں شیشے کے بھی کرتے ہو پناہ ہے گاہے
۵ ہے (کذا) عشاق میں گردن زدنی سوختنی الم زخم سے جو دل کے کراہے گا ہے
۶ نعش کو میری سر راہ ہی بہائے دینا ق گر کرے قتل وہ کچھ رکھ کے گناہ ہے گاہے
۷ منت بادِ صبا خاک کو ہے میری بہار (کذا) ابھی روندے گا وہ ناصل (کذا) سیاہ ہے گاہے
۸ خرمنِ عمر بصد جان کروں میں قربان ق اس طرف دیکھے اگر برق نگاہ ہے گاہے
۹ میں تری تیغ کی بریش کی کروں سب میں ثنا تو میر (۱) زخم اٹھائے نہ سراہے گا ہے
۱۰ بولو لے دوزخیو جھوٹ نہ کہیو اب بھی سوز سا تم میں ہوا نامہ سیاہ ہے گا ہے
۱۱ ایک نے سوز سے پوچھا کہ صنم سے اپنے ق اب بھی ملتے ہو بدستور کہ گاہ ہے گاہے
۱۲ دیکھ کر منہ کو گھڑی ایک میں بھر کر دمِ سرد یوں اشاروں سے بتایا سراہے گاہے [۴۲]

اب ہم اس غزل کے دونوں متنوں کا موازنہ میر سوز کے خود نوشتہ متن سے کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ کس نسخے کا متن اصل متن سے قریب تر ہے اور کس میں غزل کے اشعار کی تعداد کا اختلاف ہے۔

مخففات کی توضیح۔

ل = لندن ، نسخۂ لندن۔ ک = کراچی ، نسخۂ کراچی۔ س = سوز ، میر سوز کا خود نوشتہ نسخۂ سوز۔

پہلا شعر : ل : نکلی تو۔ ک : نکلی نہ۔ س : نکلی نہ

دوسرا شعر : ل : خک درو دوست
ک : خاک در اے دوست
س : خاک در اے دوست

تیسرا شعر : ل : بشفاعت ہو پیمبر
ک : نہ شفاعت ہو پیغبر
س : نہ شفاعت ہو پیمبر
مصرعۂ ثانی
ل : فردوس بریں بھی لگا ہے
ک : فردوس بریں پر بھی نگاہے
س : فردوس بریں پر بھی نگاہے

چوتھا شعر : ک : میں یہ شعر موجود نہیں
ل :

چوتھا شعر : مصرعۂ ثانی
ل : دل میں شیشے کے بھی کرتے ہو پناہ ہے گاہے
ک : پورا شعر موجود نہیں ہے

س : دل سے سینہ کے لیے گر ہونا ہے

پانچواں شعر : ل : ہے عشاق میں

ک : ہے وہ عشاق میں

س : ہے وہ عشاق میں

چھٹا شعر : ل : سر راہ ہی بہلانے دینا

ک : سر راہ ہی رہنے دینا

س : سر راہ ہی رہنے دینا

مصرعۂ ثانی

ل : گر کرے قتل وہ کچھ رکھ کے گنا ہے گا ہے

ک : گر کرے قتل گنا ہے گا ہے (؟)

س : گر کرے قتل وہ کچھ رکھ کے گنا ہے گا ہے

ساتواں شعر ل : منت باد صبا خاک کو ہے میری بیمار

ک : " خاک کو ہے میری عار

س : " خاک کو ہے میری ننگ

مصرعۂ ثانی

ل : آپ ہی روندے گا وہ نا چل سیا ہے

ک : ابھی روندے گا وہ باچل سیا ہے

س : آپ ہی روندے گا وہ باچل سیا ہے

آٹھواں شعر ل : میں قربان

ک : میں قربان

س : میں تو نثار

نواں شعر : ل : کی برش کی کروں سب میں ثنا

ک : کی برش کی کروں سب میں ثنا

س : کی برش کا کروں سب میں ثنا

مصرعۂ ثانی

ل : میرا زخم اٹھاتے ۔

ک : مرے زخم اٹھاتے

س : مرے زخم اٹھائے

دسواں شعر : ک میں ۸ دیکھ منہ اس کا الخ ل میں ۸
بولے روز خیو ۔ الخ س میں ترتیب ل کے مطابق ہے

گیارہواں شعر : (ک میں یہ شعر نویں نمبر پر ہے)

بارہواں شعر : (ک میں یہ شعر دسویں نمبر پر ہے)

ل : دیکھ کر منہ کو

ک : دیکھ منہ اس کا

س : دیکھ کر منہ کو

مصرعۂ ثانی : ل : یوں اشاروں سے بتایا

ک : یوں اشارت سے بتایا

س : یوں اشارت سے بتایا

نسخۂ لندن میں اس غزل کو چار قطعات میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن نسخۂ کراچی میں کسی قطعے کا نشان نہیں ملتا اور یہی معاملہ نوشتۂ سوز کا ہے البتہ ایک فرق بہت واضح ہے کہ درج ذیل قطعہ بند دو اشعار :

ایک نے سوز سے پوچھا ۔ الخ   دیکھ کر منہ کو ۔ الخ

غزل میں آٹھویں اور نویں اشعار کے مقام پر دئے گئے ہیں جبکہ لندن نسخہ میں ان کا مقام گیارہویں بارہویں شعر کا ہے ۔

اور نسخۂ کراچی میں نویں دسویں نسخۂ کراچی میں چونکہ اس غزل کا ایک شعر کم ہے اس لیے اس کی ترتیب اشعار نسخۂ سوز کے قریب تر قرار پائی ہے یہی حال اشعار کے متن کا بھی ہے۔ ان تفصیلات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ میر سوز، ان کے کلام اور الحاقات کے سلسلہ میں نسخۂ کراچی بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور اس نسخے سے مقابلہ کیے بغیر دیوانِ سوز کا کوئی مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ احترام الدین احمد شاغل عثمانی: صحیفۂ خوش نویساں، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۷ء، ص ۱۹۱۔

۲۔ قیام الدین قائم چاندپوری: مخزن نکات مرتبہ اقتدار حسن، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۱۔

۳۔ اسپرنگر: یادگار شعرا مترجمہ طفیل احمد، لکھنؤ: اترپردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۵ء، ص ۹۵۔

۴۔ محمد حسین آزاد: آب حیات، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۵۷ء، ص ۱۹۴۔

۵۔ رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو مترجمہ مرزا محمد عسکری مرتبہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لاہور، علمی کتب خانہ ص ۱۱۴۔

۶۔ اس موضوع پر ہمارا مقالہ "میر سوز۔ تبدیلی تخلص کا مسئلہ" کے عنوان سے رسالہ "اردو" میں زیر اشاعت ہے۔

۷۔ قائم چاندپوری: محولہ بالا ص ۱۳۱۔

۸۔ میر حسن: تذکرہ شعرائے اردو مرتبہ حبیب الرحمن شروانی، دہلی: انجمن ترقی اردو ۱۹۴۰ء، ص ۷۵۔

۹۔ ولی اللہ فرخ آبادی: عہد بنگش مترجمہ شریف الزماں شریف مرتبہ محمد ایوب قادری، کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ۱۹۶۵ء، ص ۳۸۸۔

۱۰۔ اسد علی خاں یکتا: دستور الفصاحت مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، رام پور: ۱۹۴۳ء، ص ۵۲۔

۱۱۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ہمارا مقالہ "میر سوز۔ درویش یا دل افگار"۔

۱۲۔ زاہد منیر عامر: دیوان میر سوز (تدوین ردیف الف) تحقیقی و تنقیدی مقالہ (غیر مطبوعہ) مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور۔

۱۳۔ فائق رام پوری: میر سوز مقالہ مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین لاہور یونیورسٹی اورینٹل کالج ایڈیٹر سید عبداللہ ج ۳۸ عدد ۱۵۰ ص ۸۰ (اگست ۱۹۶۲ء)

۱۴۔ نادرات: اردو نامہ (پہلا شمارہ) نگراں ممتاز حسن اگست ۱۹۶۰ء، ص ۴۸

۱۵۔ مشفق خواجہ: جائزہ مخطوطات اردو لاہور: مرکزی اردو بورڈ ۱۹۷۹ء ج اول ص ۵۴۸

۱۶۔ میر سوز: دیوان میر سوز (قلمی) مکتوبہ ۱۲۴۵ھ مملوکہ اردو لغت بورڈ کراچی صفحہ اول

۱۷۔ سعادت خاں ناصر: خوش معرکہ زیبا مرتبہ مشفق خواجہ لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۷۰ء ج اول ص ۲۱۵

۱۸۔ مشفق خواجہ: تحقیق نامہ لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۱۹۹۱ء ص ۱۷۴

۱۹۔ میر حسن: تذکرہ شعرائے اردو مرتبہ حبیب الرحمن شروانی دہلی: انجمن ترقی اردو ۱۹۴۰ء ص ۷۵

۲۰۔ قدرت اللہ شوق: طبقات الشعراء مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۶۸ء ص ۴۸۵

۲۱۔ قدرت اللہ شوق: محولہ بالا ص ۴۸۸

۲۲۔ قاضی عبدالودود: کلیات سودا کا پہلا مطبوعہ نسخہ (مقالہ) در سویرا شمارہ ۲۹ لاہور سویرا آرٹ پریس (۱۹۶۱ء) ص ۵۵

۲۳۔ ولی الحق انصاری، ڈاکٹر: مقالات پر بحث مشمولہ تدوین متن کے مسائل (خدابخش سمینار) پٹنہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری ۱۹۸۲ء ص ۱۳۴

۲۴۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر: مستعملہ مخطوطات کی تفصیلات/کلیات سودا از مرزا رفیع سودا لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۷۳ء ج اول ص ۱۷

۲۵۔ شمس الدین صدیقی: پیش لفظ کلیات سودا محولہ بالا ص ۸

۲۶۔ قاضی عبدالودود: اصول تحقیق (مقالہ) اردو میں اصول تحقیق مرتبہ ایم سلطانہ بخش، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۸ء ج دوم ص ۲۲

۲۷۔ قاضی عبدالودود: کلیات سودا کا پہلا مطبوعہ نسخہ، مشمولہ سویرا۔ ۲۹ لاہور: سویرا آرٹ پریس (۱۹۶۱ء) ص ۵۵

۲۸۔ ان غزلیات کی فہرست قاضی صاحب کے محولہ بالا مضمون میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ زاہد منیر عامر

۲۹۔ محمد حسین آزاد: آب حیات لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۵۷ء ص ۱۹۶

۳۰۔ یہاں حاشیہ لکھا گیا ہے "رکھو کے مرے کچھ"

۳۱۔ میر سوز: دیوان میر سوز (قلمی) مملوکہ اردو لغت بورڈ کراچی ص ۱۳۴۔ (املائی ترامیم: مرکبات کا انفصال، یائے معروف و مجہول کی باہم تبدیلی، کاف تازی کی جگہ کاف فارسی کا استعمال، نون کے اعلان کی بجائے نون غنہ، ہائے مختفی کی جگہ ہائے مخلوط)

۳۲۔ میر سوز: دیوان میر سوز (قلمی/عکسی) مملوکہ برٹش میوزیم لندن ص ۳۳۔



ڈاکٹر کلیم سہسرامی
پروفیسر راجشاہی یونیورسٹی
بنگلہ دیش۔

دیوانِ ہاشم

بنگلادیش میں خصوصاً ڈھاکا یونیورسٹی کا کتب خانہ قلمی نسخوں کے لیے بہت اہم ہے، یہاں تصوف سے متعلق اب تک جتنے قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان میں ویسے تو مختصر سے بہت سارے منظوم نسخے میری نظر سے گذرے ہیں لیکن **دیوانِ ھاشم** واحد نسخہ ہے جس کی ضخامت کافی ہے اور ہر طرح مکمل کہا جاسکتا ہے، اس دیوان کا یہ نسخہ دنیا کے قدیم ترین نسخوں میں شمار کیا جاسکتا ہے، یہ ڈھاکا یونیورسٹی کی ملکیت ہے اور قلمی نسخوں کی فہرست میں اس کا نمبر (۲۸۶) ہے۔ اس کے دو اور نسخوں کا انڈیا آفس لائبریری کے مخطوطہ نمبر (۲۸۹۸) اور روسی مستشرق ایوانوف کی فہرست منظوطات کے نمبر (۴۷) سے پتا چلتا ہے۔ نسخہ زیر بحث کے آغاز و اختتام پر بعض مہریں لگی ہوئی ہیں، جن میں ایک مہر کی تاریخ (۱۰۸۳ھ/ ۱۶۷۲ء) درج ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ یہ نسخہ انڈیا آفس لائبریری کے مکتوبہ (۱۰۸۷ھ/ ۱۶۷۶ء) سے چار سال پہلے تحریر کیا گیا، لیکن ایوانوف نے جس نسخے کا تذکرہ کیا ہے اس پر سنہ کتابت (۱۰۶۶ھ/ ۱۶۵۵ء) درج ہے۔ یعنی ایوانوف سے کوئی اکیس سال بعد ترتیب دیا گیا گویا ایوانوف اور انڈیا آفس لائبریری کے نسخوں کی درمیانی مدت میں یہ نسخہ لکھا گیا ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس نسخے پر کاتب کا نام اور تاریخِ کتابت درج نہیں ہے۔

اس نسخے میں کل ۱۹۸ اوراق ۳۹۶ صفحات ہیں، دیدہ زیب نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے، سرخ و سیاہ جدولیں بنی ہوئی ہیں۔ بعض جگہ کرم خوردہ لیکن مرمت شدہ ہے۔ شاعر کے حالات کی تفصیل اس میں نہیں ملتی، البتہ اس کا نام یوں درج ہے "خواجہ محمد ہاشم ابن محمد قاسم الکشمی البدخشانی برہان پوری"، اس سے یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ شاعر کا تعلق "بدخشاں" سے تھا، اور یہ خاندان وہاں سے ہجرت کرکے "برہان پور" (ہند) میں سکونت پذیر ہوگیا تھا، اس امر کا داخلی ثبوت خود اس کے اس شعر سے ملتا ہے:

زنقش آں صنم برگشت ہاشم، ہر سر مریم
بہندستاں ندانم تا کجا بتخانہ خواہم شد

بہر کیف دیوان سے شاعر کے ایک بھائی محمد اسحٰق کا بھی پتا چلتا ہے جس کی وفات پر اس نے مرثیے لکھے ہیں۔

موجودہ نسخے کے شروع میں شاعر کی تاریخ وفات کا جو قطعہ درج ہے اس پر بیکار ہاشمی کے دستخط ہیں اور اس سے ۱۰۴۳ھ یعنی ۱۶۳۳ء نکلتے ہیں۔ قطعہ ملاحظہ ہو:

آں قطبِ زمانہ خواجہ ہاشم — در کشورِ ملک خود می شد
تاریخ وصال گفت ہاتف — گو، نزدِ رسولِ ہاشمی شد

لیکن اسپرنگر کے خیال میں خواجہ ہاشم ۱۰۵۶ھ مطابق ۱۶۴۶ء میں زندہ تھے۔

دیوان کی ورق گردانی سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو مختلف اصنافِ سخن پر عبور تھا، آغازِ دیوان میں اس نے پیرِ طریقت خواجہ بہاء اللہ محمد فاروقی (مجدد الف ثانی) کے روحانی شجرے کی تفصیل پیش کی ہے، اس کے بعد ترجیع بند اور ایک ساقی نامہ مسمّیٰ بہ "سبعہ سیارہ مرغان آتشخوار" ہے اور سبعہ سیارہ کی تفصیل اختر اول سے اختر ہفتم تک درج ہے۔ اس کے بعد غزلیات کا حصہ شروع ہوتا ہے، پھر رباعیات و فردیات اور تاریخی قطعات ہیں، حصۂ غزلیات کا آغاز، اس غزل سے ہوتا ہے جس کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

بسملِ دلہا بُوَد، بسم اللہ عنوان ما — مایۂ دیوانگی، موی سرِ دیوان ما
ہست ہر سطری زما، ابروی معشوق سخن — گوشۂ ابرو، اشارتہای بی پایان ما
ہر کہ دید آں خندۂ پنہاں نکتہای دگر — یابد از رازِ نہفت و قصۂ پنہان ما
رشحِ کلکِ ملت ہاشم، سیل و در دلہا رکہ — کافر از مومن نداند، موجہ طوفان ما

اس امر کی وضاحت بیجا نہ ہوگی کہ خواجہ ہاشم کو سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت تھی، اور اپنے پیرِ طریقت حضرت مجدد الف ثانی سے انتہائی عقیدت کی بنا پر "مکتوباتِ احمد فاروقی" (مجدد الف ثانی) کے عنوان سے ان کے مکتوبات کی تیسری جلد تدوین کی ہے، اور ان کی حیات سے متعلق "زبدۃ المقامات و برکاتِ احمدیہ" کے نام سے ایک دوسری کتاب بھی ترتیب دی ہے۔ اس سلسلۂ بیعت کا اثر ان پر اس قدر گہرا اور پختہ ہے کہ سارا کلام تصوف میں ڈوبا ہوا ہے۔ اپنے پیرِ طریقت کی تاریخ وفات اس طرح نظم کی ہے:

تا عیسیٰ جانہا شد، از عالم پاک — دلہا شدہ، چون پیرہن یوسف چاک
چوں رفت بسوی روضۂ پاک بہشت — تاریخ وصال او بگو "روضۂ پاک" ء
بہار و باغ عرفاں، ابر رحمت — کزیں گلشن، بہ تعجیل صبا رفت
مگر صبحِ قیامت سر برآورد — کہ از مشکوٰۃ دیں شمع ہدیٰ رفت

چو شاہ اولیائی عہدِ خود ، بود   خرد گفتا کہ شاہِ اولیا رفت

دیوانِ ھاشم میں مجموعی طور پر غزلیات و رباعیات کے حصے جاندار اور قابلِ توجہ ہیں۔ شاعر کی کہنہ مشقی، قدرتِ کلام اور زبان و بیان پر اس کے عبور کا یہ عالم ہے کہ کوئی شعر کہیں سے پڑھیے ہر جگہ کلام میں یکسانی، رنگ میں پختگی اور زبان و بیان میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔ شاعر نے بعض اشعار میں متداول عربی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں لیکن اس خوبصورتی اور چابک دستی سے نبھایا ہے کہ کلام بوجھل نہیں ہو پاتا اور اس کی روانی میں فرق نہیں آتا۔ بطور مثال چند الفاظ درج کیے جاتے ہیں، تعجیل، رشح، ہستور، سبعہ، اربعین، درۃ التاج، سوادِ اعظم وغیرہ۔

اوپر یہ ذکر آچکا ہے کہ شاعر نقشبندی طریقۂ تصوف سے منسلک ہی نہیں بلکہ غایت درجہ شفقت بھی رکھتا ہے اور عبادت و ریاضت میں چالیس سال گذارنے کے باوجود بھی مطمئن نہ تھا، وہ خود کہتا ہے:

چل سال رفت و ره بحقیقت نیافتیم   زین اربعین نتیجۂ طاعت نیافتیم
بس از سنان آه، شکستیم قلب خویش   خوشتر ز درد، ہیچ غنیمت نیافتیم

ہاشم کے کلام کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عارفانہ اور صوفیانہ خصوصیات کا حامل ہے، اس میں معرفت وحقیقت اور طریقت و شریعت کے مسائل بھی ہیں۔ جذب وکیف اور درد وعشق کی باتیں بھی ہیں، کفرِ جنوں، آتشِ ایمن، سینۂ صدپارہ، دلِ دیوانہ، سرگذشتِ عشق، دیدۂ بےخواب، شکستِ دل، صہبائے فنا، داوِ عشق، خوشتر ز درد، آبِ تیغ، آبِ زندگانی اور عمرِ جاودانی جیسی ترکیبیں بھی نظر سے گذرتی ہیں جن سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پردازِ خیال کا مرکز ایک ہی ذات اور اس کے فکر و نظر کا محورِ معرفت وحقیقت ہی سے عبارت ہے، اس پر ایسی والہانہ کیفیت طاری رہتی ہے کہ شاعر خود کہہ اٹھتا ہے:

جہاں در خوابِ خرگوش است، ہاشم پاک دامن است
زمستی بر زبان آوردہ، افسانۂ خود را

ایک غزل کے مقطع میں شاعر نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کا دیوان دفترِ اسرارِ محبت ہے، میرے خیال میں "دیوانِ ہاشم" کا قاری اسے تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا، پوری غزل بعد میں پیش کی جائے گی، ابھی صرف مقطع سنیے:

دیوانِ نوای ہاشم دیوانہ چہ باشد   سرتا بقدم "دفترِ اسرارِ محبت"

شاعر نے اپنے آپ کو ایک جگہ فارسی شعر و ادب کے عارف و صوفی حضرت فریدالدین عطار اور دوسری جگہ عربی کے شاعر لبید سے مماثلت و مشابہت دی ہے، اس کا فیصلہ قاری پر چھوڑتا ہوں کہ یہ محض تعلّی ہے یا حقیقت خواجہ ہاشم

کی زبان میں ادعا پیش کیا جاتا ہے:

در سخنِ ہاشم فریدالدین عطار دلی — از درو بامت شمیم طبلۂ عطار کو
بعد از ہزار ہاشمؒ اندر عجم لبید است — پیش از ہزار اگر بود، اندر عرب لبیدی

ایک اور مقطع میں شاعر نے اپنی غزل کے متعلق یہ اظہار خیال کیا ہے:

رنہ شپہر وزدہ عقل، بر تر آمدہ عشق — زہاشم این غزل پر ہنر، زتحفہ بری

اب "دیوان ہاشمؒ" سے چند منتخب غزلیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱)

چناں دیوانہ می خواہم، دلِ فرزانۂ خود را — کہ اندر خانۂ خود می نیابم، خانۂ خود را
زہر موصد زباں رو یند و رازِ دل نشد روشن — مگر از شمعِ پرسم، قصۂ پروانۂ خود را
بہر در چوں گدایان، از مرادِ دل سخن گفتم — دریغا ز آشنا نشاختم، بیگانۂ خود را
بجز داغی تو، گنجی نیست، در گنجینۂ سینہ — بسی از آماج، تا خن کافتم، ویرانۂ خود را
تو بدعہدی و من بدمست، در عشق و دل شاعر — تو ہر دم بشکنی پیمان و من پیمانۂ خود را
جہاں در خواب خرگوش است ہاشم با کدامن آت — زمستی بر زباں آوردۂ افسانۂ خود را

(۲)

مجروح شود گر دلت از خارِ محبت — گرد دُبن ہر موی تو، گلزارِ محبت
تا سیم نریزی و سر شکی نہ ستانی — ہرگز نہ بری سود زبازارِ محبت
از نقطۂ خالی کہ بر آں صفحۂ سیمین است — سرگشتہ دلی آمدہ پرکارِ محبت
دائم کہ محبت بہ کسی ہست خریدار — اماں بجہاں کیست خریدارِ محبت
کشتم ہمہ از سوزِ جگر داغ کہ روید — چوں باغِ براہیم، گل از نارِ محبت
در کفرِ جنوں، آتش ایمن شدہ مستور — سر رشتۂ شمع آمدہ زنّارِ محبت
دیوانِ تو ای ہاشم دیوا جہ باشد — سرتا بقدم دفترِ اسرارِ محبت

(۳)

سینۂ صد پارہ دارم، گرچہ دلم پارہ نیست — جملگی چشم ولیکن رخصت نظارہ نیست

عشق فتح اندر، شکست کار پنہاں کردہ است — چارۂ این غم نداند، ہر کہ او بیچارہ نیست

یک دل و یک دوست باشد صد کتاب این سخن — گفت صد بار بشنو، زندگی صد پارہ نیست

دیدہ یک شو دہ گردوں، از پی شمع رخت — این کہ می بینی تو ہر شب، این مہ و استارہ نیست

ہفت بیت آمد غزلہای تو ہاشم بیشتر — ہر ترا این سبعہ، کم از سبعہ سیارہ نیست

(۴)

خیال گنج می بندم مگر ویرانہ خواہم شد — پری در خواب می بینم مگر دیوانہ خواہم شد

دو آغاز حدیث من، خرد را خوب می آید — ہمانا از شب موی کسی افسانہ خواہم شد

کنون حرفی کہ می گویم زباں بر خویش می پیچید — بدان ماند کز این پس، از سخن بیگانہ خواہم شد

ز نقش آن صنم برگشت ہاشم بر سر مریم — بہ ہندوستاں ندانم تا کجا بتخانہ خواہم شد

(۵)

ما ز بس عقل، این دل، پیدا کردہ ایم — سور صحرا از متاع خانہ پیدا کردہ ایم

سرگذشت سرگذشتن عشق می گوید بہ گوش — دیدۂ بے خواب ازین افسانہ پیدا کردہ ایم

چاکہا افگندہ ایم از آہ دل، بر لخت دل — گیسوئے آشفتگی را شانہ پیدا کردہ ایم

در قفس ای مرغ دل، فارغ نشین خوشتر ز باغ — کت ز اشک ناب، آب و دانہ پیدا کردہ ایم

دید طاعت را بسی پیماں چو دل بشکستہ ایم — تا بہ صہبائی فنا، پیمانہ پیدا کردہ ایم

از شکست دل رسد ہاشم، بہ سخنہائی درست — این گرامی گنج، از ویرانہ پیدا کردہ ایم

(۶)

چل سال رفت در راہ بحقیقت نیافتیم — زین اربعین نتیجۂ طاعت نیافتیم

در عمر نوح شیوۂ طفلی ز ما نرفت — لقماں شدیم و نبض طبیعت نیافتیم

دیدم بخلد و بس قرن را بگریہ گفت — اینجا فراغ گوشۂ عزلت نیافتیم

داؤد عشق، دست بمضراب زد و گفت — بہ زین کلید قفل شریعت نیافتیم

بس از سنان آہ شکستیم قلب خویش — خوشتر ز درد ہیچ غنیمت نیافتیم

(۷)

آب تیغ، آب زندگانی من — مرگ من، عمر جاودانی من

آہ دل، برگ تن، نجاک افگند | چند از صرصر خزانی من
سر باریک آں میاں نیافت | خاک بر فرق نکتہ دانی من
اولیں حرف عشق اینت کہ نیست | در ہمہ کائنات ثانی من
ہاشما کی بدل فتد سرو کار | ملی شود دفتر زبانی من

رباعی ایک مشکل فن ہے جس میں شعرا کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی اور نہ ہر شاعر فنی طور پر اس سے دامن بچا کر کامیابی سے ہم کنار ہو سکتا ہے، لیکن خواجہ ہاشم کی رباعیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ شاعر نے رباعی کے تمام لوازم کو بطور احسن برتا ہے اور جہاں تک مواد و ہیئت، زبان و اسلوب کا تعلق ہے کہیں بھی عجز بیانی کا اظہار نہیں ہوتا اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شاعر کو اس صنفِ سخن پر پوری گرفت اور فنی مہارت حاصل ہے۔ غزلیات کی طرح شاعر نے رباعیات میں بھی کچھ خاص ترکیبیں استعمال کی ہیں جن سے اس کے مخصوص مزاج اور مذاق و ماحول کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً مرہم جان، دل سوختہ، کشت کار، خم بادہ، نقش تن، دود آہ اور سایۂ بید وغیرہ۔

رباعیات میں بھی غزلیات کی طرح بڑی یکسانی و روانی اور ہم آہنگی و ہمواری پائی جاتی ہے۔ عارفانہ سپردگی اور دل گداختہ کی دھیمی آنچ کا احساس ہوتا ہے، جذب و کیف کا عالم، تصوف کی چاشنی اور شرابِ معرفت کی سرمستی و سرشاری رباعیات کے مرکزی موضوعات ہیں، چند رباعیوں کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، لیجیے کام و دہن اور ذوقِ سخن کی آزمائش ہے۔

(۱)

ای دلِ سجدہ نخلِ بالای ترا | سرتا پای جہاں، سراپای ترا
در قدرت بر کمالِ حق شبہ نماند | زاندام کہ نمود ذات والای ترا

(۲)

پیری بسر افگندہ کنوں سایہ مرا | جز موی سپید نیست پیرایہ مرا
شد صرف ہوس عمر گرانمایہ مرا | ای دہر بخواں کودک صد سالہ مرا

(۳)

ای دوست رخی بہ ہجر کیشاں بنما | وز لب نمکی بسینہ پریشاں بنما
سر رشتۂ جمعیت دل می طلبم | یک تار از آں زلف پریشاں بنما

(۴)

ای مرہم جان، این ہمہ آزار چرا
وی گل ز تو بر پای جگر خار چرا
ای آبحیات کشتن خلق از چہ
وی مہ ز تو روز ما، شب تار چرا

(۵)

خون گشت ز مخموری من جان شراب
بگداخت ز گرمی شبم مستی خواب
زان سان کہ چراغہا ز روغن سوزد
ز آب مژہ ام سوخت دل شعلہ تاب

(۶)

رمزی بشنو ز نوبہاران شباب
عہدیست کزو برق برد رسم شتاب
سرگشتہ تنم در دو بحر سو چو صبا
با جامۂ آسمان و با چشم سحاب

(۷)

ای ہر دو جہان قافلۂ سودایت
سررشتۂ کار، موی عنبر سایت
معراج تو آنکہ پا نہی بر سر عرش
معراج من آنکہ سر نہم بر پایت

(۸)

ای آنکہ خیالات پی تاراج من است
خاک قدم تو ذرۂ التاج من است
معراج تو صد راز بایزد گفتن
حرف شب معراج تو معراج من است

(۹)

جانان سمت قبلہ بجز سوی تو نیست
محراب جہانیان جز ابروی تو نیست
دیدم سواد اعظم ملتہبا
سوگند بموی تو کہ جز موی تو نیست

(۱۰)

بسیار مگو کہ یک سخن بسیار است
وین خرقہ بہل کہ تن بسیار است
زنہار بصد قافلہ این رہ مپوی
کین بادیہ سخت و راہزن بسیار است

(۱۱)

چون دل نگشود، روزگار تو عبث
نشگفت چو این غنچہ بہار تو عبث

گرداند آشکی بزمین نقشانی　　　ای خواجه تمام کشت کار تو عبث

(۱۲)

ای دل کہ مصاحب نکوخوی من　　　سرگشتۂ عالمی و در کوی من
شد عمر، بکار من نبرد راہی　　　باآں کہ شب و روز بپہلوی من

خواجہ ہاشم کے یہاں بعض بعض جگہ عمر خیام کے رنگ کی جھلک دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کے باوجود ان کا اپنا مخصوص رنگ کلام قائم و دائم رہتا ہے۔ اس رنگ کی چند رباعیاں درج کی جاتی ہیں:

(۱۳)

چوں جان من از قید تن آزادہ شود　　　وز نقش ثم، لوح جہاں سادہ شود
گر یک رگ دل نجاک بگشادہ شود　　　ہر ذرۂ خاک من، خم بادہ شود

(۱۴)

دل دوہمہ دود آہ، جاوید غنود　　　چوں خستہ کز زیر سایۂ بیند غنود
افسانۂ عمر رفت و صبحی ندمید　　　ما نا کہ ازیں فسانہ خورشید غنود

(۱۵)

زخم دل ما بجوں بہا خندہ زند　　　جام مے ما، بتو بہا خندہ زند
لعلت (بہ) شتاب، عمر ما خندہ زند　　　چوں غنچہ کہ باد صبا خندہ زند

دیوانِ ہاشم کی آخری رباعی یہ ہے:

(۱۶)

ہاں وامق و فرہاد ستودن تا کی　　　سرخوش بحدیث غیر بودن تا کی
بردار سر از خواب کہ شب آخر شد　　　افسانہ شنودن و غنودن تا کی

○○

ڈاکٹر نورالسعید اختر
لکچرار شعبۂ فارسی
مہاراشٹر کالج، بمبئی ۸

شیخ غلام محمد داول اور ان کا ناری نامہ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دکن میں قدیم اردو کی داغ بیل صوفیائے کرام کے ہاتھوں پڑی۔ ان کا منشا اسلام کی توسیع و اشاعت تھا۔ لہذا قدیم اردو کی ابتدائی تصانیف کا ورثہ ہمیں ملفوظات، اقوال اور چھوٹے چھوٹے منظوم و منثور رسالوں کی شکل میں دستیاب ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام کے ان دستیاب شدہ کارناموں پر ندہبیت کی چھاپ واضح طور پر نظر آتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر ان مختصر کتابوں کی زبان مخلوط ادبی ہے باقاعدہ طور پر تصنیف و تالیف کی روایت سترہویں صدی کے نصف سے کچھ پہلے شروع ہوتی ہے۔ اس عرصہ میں دلچسپ ادبی تحریروں کو قابل اعتنا سمجھا گیا اور غیر ادبی تخالیق پس منظر میں چلی گئیں جس کا اثر یہ ہوا کہ قدیم اردو کا مذہبی ادب ایک مدت تک شائقین ادب کی خصوصی توجہ کا مرکز نہ بن سکا۔ دکن میں میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم (۹۹۰ھ/ ۱۵۸۲ء) ایسی قد آور صوفی منش ہستیاں ہیں جن کی قائم کردہ ادبی روایتیں دکن میں مدتوں سرمدی نغمے الاپتی رہیں۔ ان بزرگوں نے روحانی مطالب کی ترویج و اشاعت میں ادبی راہوں پر ایسے چراغ روشن کیے جن کی ضوفشانی آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ روحانیت کی اس شمع کو ان کے مریدوں نے خداشناسی کے روغن سے منور رکھا۔ ان برگزیدہ مریدوں میں شیخ محمود خوش دہان شاہ امین الدین اعلیٰ کے علاوہ شیخ داول بھی قابل ذکر ہیں۔

دکن کی تاریخ میں تقریباً چار نامور ہستیاں ایسی ہیں جو شاہ داول اور سید داول کے نام سے معروف ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مقبول و معروف ہستی شیخ عبداللطیف داور الملک کی ہے۔ مرآۃ احمدی، مرآۃ سکندری اور تذکرۂ اولیائے دکن میں ان نامور شخصیات کے حوالے ملتے ہیں۔ البتہ ان کے صاحب تصنیف یا شاعر ہونے کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ بزرگان دین رشد و ہدایت کے متوالے تھے اور علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھے۔ ایسے ہی ایک بزرگ کا تعارف پیش کرتے ہوئے ماہر دکنیات ڈاکٹر محمد اکبرالدین صدیقی رقمطراز ہیں کہ:

"درگاہ قلی خاں نے سالار جنگ نے ایک اور شاہ داول پورہ کا نام شاہ غلام محمد داول پورہ بتایا ہے اور انھیں شاہ سعد اللہ گلشن کا معاصر کہتے ہیں لیکن تفصیلات میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ محمود بیگڑہ

ابیقرہ۔ حاکم گجرات: متوفی ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء) کے امراء عظام میں تھے۔ ان کی ایک مثنوی موسوم بہ "ناری نامہ" (ناری نامہ) نظر سے گزری ہے جو ۲۵۶ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں حقوقِ شوہر کو مختلف عنوانات سے دلچسپ پیرایہ میں سمجھایا گیا ہے اور نمونتاً ذیل کے شعار دیئے۔

ابتدا: ناریاں سنو پیو کا بیان
بن سر گھڑی نا ہوئے ایمان
نا چیز ہے دنیا نکل
پیو باج کوئی پیارا نہیں

اختتام: زن تھے ہوا جو کون دُکھیا
دکھ نار تھے سینا پکیا
دو بین یوں داول لکھیا
پیو باج کوئی پیارا نہیں[1]

مرقع دہلی کے مصنف نے مزید صراحت کی ہے کہ شاہ غلام محمد داول پورہ جیسا کہ ان کے لقب سے ظاہر ہو رہا ہے اسی سلسلے کے (یعنی شاہ عبداللطیف داور الملک) کے ایک فرد ہیں۔ یہ وہ بزرگ تھے کہ حضرت مغفرت مآب میر قمر الدین خان نظام الملک آصف جاہ اول متوفی ۱۱۶۱ھ/۴۸ء اوان کی محفل سماع میں حاضر ہوتے تھے۔

راقم عظیم المرتبت ڈاکٹر محمد اکبر الدین صدیقی کے اخذ کردہ نتائج سے متفق نہیں ہے اسکی تین وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ مرقع دہلی کے مصنف نے شاہ غلام محمد داول کے نام کے ساتھ لفظ "پورہ" کا استعمال کیا ہے لفظ پورہ کسی محلے یا گاؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے گمان غالب ہے کہ لفظ "داول پورہ" شہر دھاول پورہ (دھول پور) کی تخریب شدہ شکل تو نہیں ہے؟

دوسرے یہ کہ مرقع دہلی میں درگاہ قلی خان نے وہ اشعار حوالے کے طور پر نہیں دیئے ہیں جن کی بنا پر ڈاکٹر صاحب موصوف کو یہ تسامح ہوا ہے۔

تیسرے یہ کہ "ناری نامہ" کی زبان کا کینڈا گیارھویں صدی کی زبان کی نمائندگی کرتا ہے۔ بارھویں صدی کے نصف دہے کے بعد قدیم اردو کی روایت فارسیت سے نکل کر خود ساختہ روشوں پر گامزن ہو چکی تھی۔

لہٰذا مندرجہ بالا حقائق کے پیشِ نظر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ غلام محمد داول پورہ کی شخصیت شیخ غلام محمد داول

---

[1] مرقع دہلی از درگاہ قلی خان مترجمہ متن فارسی از ڈاکٹر نور الحسن انصاری (مرحوم)۔ نوٹ: حضرت شاہ ملک عبداللطیف سلطان محمود بیقرہ کے ایک سردار کے لڑکے تھے۔ آپ کا لقب داول شاہ پیر ہے اور آپ کا خطاب داور الملک ہے۔ آپ کا مزار جونا گڑھ کے قریب ہے۔ دیکھئے تاریخ صوفیائے گجرات: ڈاکٹر محمود الحسن شارب ص؟، اور اقوالِ صوفیہ: اردو ترجمہ اخبار الاخیار ص؟۔ [2] کشف الوجود از شاہ داول مرتبہ ڈاکٹر محمد اکبر الدین صدیقی ص؟ (قدیم اردو) اول مصرعہ: خداوند شاہ بے شر داول بندہ شد خان محمد کال از خلیفہ جام: شاہ داول محمد ص؟ ایضاً۔

(۲) شعر۔ سائیں حضرت شاہ بریاں: صحبت جو کر کیتے داں از کشف الانوار داول ص؟، (۳) شعر۔ داول جسکا اونچے جگ: اس کے سر پر پریم بھگ از کشف الانوار داول ص؟، (۴) اشعار شاہ تقی مرشد میرے پیر: اوہیں میرے دستگیر ایضاً، شاہ داول کے چرنوں لاگ: شاہ محمد پایا جاگ ص؟۔

متوفی ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء سے علیحدہ تھی جیسا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے "کشف الوجود" کے مقدمے کے صفحات نمبر ۲۸۸، ۲۸۹ اور ۲۹۰ میں ظاہر کی ہے۔

شیخ غلام محمد داول بیجاپوری :۔ شیخ غلام محمد داول کا تعلق بیجاپور کے معروف صوفیائے کرام سے ہے۔ وہ بذات خود ایک ثقہ صوفی اور اچھے شاعر تھے۔ انھوں نے شاعری میں اپنے پیر و مرشد شاہ برہان الدین جانم کے مسلک کی پیروی کی ہے اور انھیں موضوعات کی نمائندگی کی ہے جن کی جھلک میراں جی اور اسی قبیل کے بزرگوں کے یہاں موجود ہے۔ شیخ داول نے اپنی نظم "چہار شہادت" میں واضح طور پر اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ وہ شاہ برہان الدین جانم (۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء) کے مرید تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں :

تن تھی بولوں چہار شہادت سائیں گُر کا گیان　　　سانچا گُر ہے پیر و مرشد میرا حضرت شاہ برہان[1]

اس بیان سے ایک بات تو واضح ہو گئی کہ شیخ داول کا تعلق عہدِ آصف جاہی سے نہیں تھا۔ البتہ ہم ان کے سال پیدائش اور وفات کے سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں بہم پہنچا سکتے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مصنف تاریخ ادب اردو (حصہ اوّل) کے تحقیقی مشاہدات ان حقائق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ :

"ان کے سنہ وفات کے سلسلے میں تاریخ اور تذکرے خاموش ہیں لیکن قدیم مخطوطات اور بیاضوں کے مطالعے کے دوران "شرح تمہیدات ہمدانی" (فارسی) کا ایک مخطوطہ نظر سے گذرا جس کے آخر میں :

"مرتب شد لفرمان اللہ تعالی بتاریخ بست دوم ماہ رجب ۱۰۶۷ھ کاتب الحروف شیخ داول"

کے الفاظ تحریر تھے۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور مخطوطہ "رسالہ عشقیہ قاضی ناگوری" نظر سے گذرا جس کے آخر میں :

"کاتب الحروف فقیر الحقیر فتح محمد ابن شاہ داول قادری" کے الفاظ تحریر تھے۔ یہ مخطوطہ ۱۰۶۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ ان دو حوالوں سے دو باتوں کا پتہ چلا۔ ایک تو یہ کہ کتابت شاہ داول کا پیشہ تھا جسے ان کے بیٹے فتح محمد نے بھی اختیار کیا۔ دوسرے یہ کہ شاہ داول ۱۰۶۷ھ تک زندہ تھے۔ اسی عرصہ میں ۱۰۶۸ھ کا لکھا ہوا ایک مخطوطہ[2] نظر سے گزرا جس میں میراں جی شمس العشاق، جانم، اعلیٰ اور شاہ داول وغیرہ کا کلام شامل ہے۔ اس میں شاہ داول کی نظم کشف الانوار کے اوپر یہ الفاظ درج ہیں :۔

"کشف الانوار از تصنیف شیخ داول رحمۃ اللہ علیہ" ——————— لیکن "چہار شہادت" پر جو اسی بیاض میں لکھی ہوئی ملتی ہے نام کے ساتھ "رحمۃ اللہ علیہ" کے الفاظ درج نہیں ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ شاہ داول نے ۱۰۶۸ھ میں وفات پائی جبکہ یہ بیاض لکھی جارہی تھی"[3]

---

[1] چہار شہادت : از شیخ داول ۔ بیاض قلمی انجمن ترقی اردو، پاکستان کراچی ۔

[2] شمس العشاق : (بیاض قلمی) ۱۰۶۸ھ نمبر قاطلیح انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ، [3] تاریخ ادب اردو حصہ اول از جمیل جالبی لاہور [illegible]

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں شاہ داول کے سال وفات کا تعین ہوجاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے پیشے اور فرزند سے متعلق ہمیں معلومات فراہم ہوجاتی ہیں۔

شاہ داول کے فنی شہ پاروں کی جستہ جستہ چھان بین کے بعد اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان کی نظم "چہار شہادت" دراصل مریدوں کے لیے ایک ہدایت نامہ ہے جس میں شاہ داول شاعری کے ذریعہ عشق کی سرفرازی اور سربلندی کی تشریح کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے انسان چاروں تن پر قابو پالیتا ہے۔ اور وہ حق کی شہادت حق سے پکھ لیتا ہے ان خیالات کی وضاحت سے وہ طالبان حق کی بخوبی رہنمائی کرسکتے ہیں۔ چنانچہ حق پرستی اور حق شناسی کے تصور کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

چاروں تن سوں جیسے اچکر موت کا پیالا پینا   حق کی مارگ دے جس اپنا حق میں حق ہو جینا
داول اپنے چاروتن پر لوجن پرچت بوجھیا   حق کی شہادت حق تھی پایا عشقوں جھگڑا بوجھیا

شاہ داول کا دوسرا منظوم کارنامہ مثنوی "کشف الانوار" ہے۔ اس مثنوی کا آہنگ پیر و مرید کے سوال جواب پر منحصر ہے۔ مرید اپنے مرشد کامل سے راہ حقیقت کی پیچیدگیوں کی کشادگی پر زور دیتا ہے۔ شاہ داول اپنے سلسلۂ تصوف کے رموز و غوامض کی توضیح شاہ برہان الدین جانم کے فکری پیمانوں، لہجہ اور بیان کے مطابق کرتے ہیں، جس طرح جانم نے اپنی مثنوی میں پانچ عناصر اور تن، روح اور عرفان کی تشریح کی ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی "داول نے نورنبی کی اہمیت و لطافت پر روشنی ڈال کر چار تن کے موضوع کی تشریح کی ہے۔ اس نظم کے شروع میں امین الدین اعلیٰ کی نظم "رموز السالکین" کے جو اللہ پاک منزہ ذات سے شروع ہوتی ہے، چند اشعار بھی دیے گئے ہیں اور پھر اپنے اشعار کی روشنی میں نور ظہور، جسم، روح اور عرفان کی تشریح کی گئی ہے"[1]

شاہ داول نے کشف الوجود میں جانم کا تتبع کیا ہے۔ حتیٰ کہ نظم کی ساخت پرداخت پر جانم ہی کے فکر و اسلوب کی گہری چھاپ ہے۔ شاہ داول نے جو اور موضوع بھی وہی منتخب کیا جو ان کے پیرو مرشد جانم نے "منفعت الایمان" میں اپنایا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں جانم کے کلام سے ویدانت اور سنسکرت زبان کے آثار نمایاں ہیں اس کے باعث ان کے زبان و بیان پر ہندوی رنگ غالب ہے۔ جس کے باعث ان کا اسلوب قدرے گنجلک ہے۔ اس کے برخلاف داول کے یہاں بھی رنگ ہندوی کی آب و تاب کے ساتھ "فارسی کے زیر اثر" زیادہ نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اس بیان کی تائید میں ڈاکٹر محمد اکبر الدین صدیقی رقمطراز ہیں کہ:

"شاہ داول کا علم و فضل اتنا زیادہ نہیں اس لیے وہ مشکل مسائل بھی پیش نہیں کرتے اور اسی لیے زبان قدرے آسان ہے

---

[1] تاریخ ادب اردو حصہ اول از جمیل جالبی، لاہور ص ۳۰۳

ان کی مثنوی "کشف الوجود" مترنم بحر میں لکھی گئی ہے۔ اس میں تصنع اور ترصیع نہیں ہے انھوں نے ابتدا سے آخر تک[1] تدریس و تفہیم کا انداز قائم رکھا ہے۔ (تصوف کی باتیں پیر و مرشد کی ہی ہیں) مثلاً: از کشف الوجود:

جیتا ہے کچھ مخلوقات — کل شے عالم ہر ہر دھات
سب جگ پیدا جس کے نور — عرش کرسی چندر سور
بہشت ہور دوزخ ہیں آسمان — لوح، قلم، جن ہور حیوان
سات سمندر ڈونگر پہاڑ — بن کھنڈ باجے جنان جھاڑ
توران طیران، بجلیاں مور — ایسے بھی کئی لاک کروڑ
ظاہر باطن دیک بچار — نور نبی تھے سب اظہار
پرگٹ نور کون دیا فضل — جوں جگ عالم اس کے تل[2]

شاہ داول نے راگ اور ستے بھی نظم کیے ہیں۔ انھیں وہ "خیال" کا نام دیتے ہیں۔ شاہ داول کے "خیال" غزل کے لوازمات کی نمائندگی کرتے ہیں کیونکہ ان کی ہیئت غزل سے ہم آہنگ ہے۔ مطلع اور مقطع رکھنے والے "خیال"، مجازی عشقیہ جذبات سے لبریز ہونے کی بجائے اخلاقی موضوعات، صوفیانہ خیالات اور عشق حقیقی کا والہانہ انداز میں اظہار کرتے ہیں بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

"خیال" محفلِ حال و قال میں گانے کے لیے ہوتا تھا۔ اسی لیے اکثر "خیال" مخصوص راگ، راگنیوں کے مطابق ترتیب دیئے گئے ہیں۔ شاہ داول کے "خیال" میں ترکِ دنیا، بے ثباتی دہر دنیائے دوں، خوفِ خدا، روح، نور کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ شاہ داول کے "خیال" کو "غزلیہ گیت" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس میں غزل کی ہیئت بھی ہے اور گیت کا مزاج بھی مثلاً چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دنیا یو باغِ شاہی ہو دھات بلا آئی — کچھ یادگار جائی لے وہاں لیجان ہارے
مہمان ہیں یہاں کے رہن ہار میں ہاں کے — بعد از دنیاں تھی بھاگنے نیں کوئی یان ہارے
دے دان مجھ دیدار کا جو کا پیا بھوجن کروں — داول کہے اس دان تھی نہیں دان بھی کوئی خوبتر[3]

[1] کشف الوجود از شاہ داول مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی (قدیم اردو جلد اول ۱۹۶۵ء) ص ۲۹۲
[2] ایضاً ص ۳۰۱ ـ ۳۰۲
[3] تاریخِ ادب اردو از جمیل جالبی لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۳۰۳

ناری نامہ: تقریباً دو سال قبل تحقیق و جستجو کا جنون لیے راقم کراچی (پاکستان) پہنچا تھا جہاں انجمن ترقی اردو اور نیشنل میوزیم کراچی کے کتب خانوں کی زیارت نصیب ہوئی۔ اور یہیں دکنی شہ پاروں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ خوش قسمتی سے میوزیم کے ڈائریکٹر نے ان شہ پاروں کے زیراکس حاصل کرنے کی اجازت دیدی۔ راقم انجمن ترقی اردو اور نیشنل میوزیم پاکستان کے عملے کا تہہ دل سے ممنون ہے۔ ان جواہر پاروں میں شاہ داول کا "ناری نامہ" بھی ہے۔ جو ۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ ۹ سطری ہے۔ کاغذ قدیم، آب زدہ اور کرم خوردہ بھی ہے کاتب کم سواد ہے لیکن خط نستعلیق ہے۔ مخطوطہ میں آخری دو بند نہیں ہیں اور ہر حال کتابت نہیں ہے۔ شاید اس مخطوطے کا آخری صفحہ ضائع ہو گیا ہے۔ راقم نے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ اس مخطوطے کو بار بار پڑھا ہے اور حسب استطاعت اس کا متن تیار کیا ہے۔

مرتب شدہ "ناری نامہ" میں کل ۳۱۵ بند ہیں ایک بند میں دو شعر ہیں اس لحاظ سے اس نظم میں ۶۳۰ اشعار ہیں ایک شعر کرم خوردگی کی نذر ہو گیا ہے۔ لہٰذا پیش نظر نظم میں صرف ۶۲۹ اشعار ہیں اشعار ہیں۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی "شاہ داول نے تقریباً ۱۲۳۰ اشعار[۲] پر مشتمل ایک نظم "ناری نامہ" مربع ترجیع بند کی ہیئت میں بھی لکھی ہے۔ جس میں مربع کا چوتھا مصرعہ ٹیپ کے مصرعہ کے طور پر بار بار آیا ہے۔ مثلاً :- "پیو بارج کوئی پیارا نہیں"

راقم کا خیال ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے کسی تسامح کے باعث اشعار کی تعداد ۱۲۳۰ لکھدی ہے۔ غالباً یہ مصرعوں کی تعداد ہے یعنی ۳۱۵×۴ = ۱۲۳۰

شاہ داول کی زود گوئی اور ناری نامہ کے محاسن ترکیبی پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی گرانقدر رائے کا اظہار ذیل کے الفاظ میں فرماتے ہیں کہ :-

"داول نے یہ نظم ایک رات میں لکھی تھی: ع کیتاں فکر یک رات میں[۳]"

اس نظم میں دنیا کی بے ثباتی، دوزخ، جنت، روزِ حشر اور قیامت کا ذکر کر کے سنت کی پیروی اور اخلاقِ حسنہ کا درس دیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ ہر بیوی کو اپنے شوہر سے خواہ وہ کیسا بھی ہو محبت کرنی چاہیئے۔ اس طویل نظم میں مختلف حالات کو الف پر اظہارِ خیال کر کے، جو عام خاندانی زندگی میں پیش آتے ہیں، بتایا گیا ہے کہ ایک عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کو سکون بہم پہنچائے، اس کی وفادار اور جاں نثار رہے۔ وہ کام کرے جو شوہر کو پسند ہوں۔ غصہ اور سختی سے پرہیز کرے اور سوکن کے ساتھ بھی مل کر رہے۔ اس نظم میں ایک ایسی روانی ہے اور الفاظ ایسے سیدھے سادے روزمرہ کے استعمال کیے گئے ہیں کہ

---

[۱] ناری نامہ: ب۔ نیشنل میوزیم، کراچی پاکستان ، [۲] تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی لاہور ص ۳۰۴ ،

[۳] ناری نامہ، شاہ داول مرتبہ راقم بند نمبر ۳۱۴ ،

انھیں نہ صرف ترنم کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے بلکہ وہ آسانی کے ساتھ یاد بھی ہو سکتے ہیں۔ ساری نظم میں بات چیت کا سا لہجہ ہے اور ایک ایسا گمبھیر پن اور لوچ ہے کہ نظم دل پر اثر کرتی ہے۔ اس کا ناصحانہ انداز دل کو مٹھی میں لے لینے والی کیفیت کا حامل ہے۔ مثال کے طور جو بند نقل کیے ہیں وہ بالترتیب نہیں ہیں۔ (۱) ۱۳۰ (۲) ۱۳۲ (۳) ۸۲ (۴) ۸۳ (۵) ۸۵ ،

"ناری نامہ" کی زبان و بیان پر عالمانہ تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی رقمطراز ہیں کہ "یہ زبان و بیان تقریباً سوا تین سو سال پرانے ہیں۔ شاہ داول کی زبان فارسی کے زیر اثر آنے کے باعث ہمارے لیے آج بھی اجنبی نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں ذرا سی کوشش سے آج بھی ہم تک پہنچ رہا ہے۔ وہ حاتم کی روایت کے مقلد و مفسر ہیں اور جب بھی حاتم کا نام آئے گا، داول کا نام انھیں کے ساتھ لیا جائے گا۔ یہی وہ روایت ہے جو، حاتم، داول، خوش وہاں سے ہوتی ہوئی امین الدین اعلیٰ تک پہنچتی ہے اور وہ اسے مکمل کر دیتے ہیں۔"[۱]

"ناری نامہ" دراصل شاہ برہان الدین جانم کی صوفیانہ تعلیمات کی صدائے بازگشت ہے۔ داول کا تخاطب براہِ راست عورتوں سے ہے جن کی گود تعلیم و تہذیب کا گہوارہ اور جن کی زندگی ایثار و محبت کا پیکر ہوتی ہے۔ داول کا طرز تخاطب ناصحانہ ہے۔ زبان بے حد عام فہم ہے۔ ان کا ذہن گھر کی چہار دیواری کی گردش کرتا ہوا نظر آتا ہے لہٰذا انھوں نے مخصوص قسم کا صوتیاتی نظام برتا ہے جس میں مختلف زبانوں (پنجابی، ہریانی، برج، راجستھانی، گجراتی اور مراٹھی) کے اثرات نمایاں ہیں۔ انھوں نے ہندوؤں کی مقدس کتابوں سے بھی خوشہ چینی کی ہے اور عورتوں میں پائی جانے والی تیس خصوصیات (لکشنوں) کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ عورت کو ہندوی فلسفہ کے مطابق "پتی ورتا" ہونے کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ کہیں ان کا انداز نہایت سبک ہے اور کہیں کہیں پر اس میں سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود بھی نظم میں اپنائیت کا عنصر برقرار رہتا ہے۔ اس بات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہ داول کو عامیانہ زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ شاہ داول نے اپنی نظم میں مسلم معاشرے کی بے باکانہ عکاسی کی ہے۔ انھوں نے مردوں کے ہاتھوں عورتوں پر ہونے والے مظالم کی نشاندہی کی ہے۔ ایک سے زائد بیویاں رکھنے والے شوہروں کے ساتھ نباہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ اپنے اور سوکن کے بچوں میں تمیز نہ کرنے کی ہدایت کی ہے۔ ان خیالات کی نمائندگی کے لیے شاہ داول کا ذخیرۂ الفاظ کسی ایک زبان تک محدود نہیں رہا۔ حتیٰ کہ انھوں نے مراٹھی اور سنسکرت الاصل الفاظ سے بھی اپنی نظم کو زینت بخشی ہے۔ ان زبانوں کے محاورے اور کہاوتیں بروئے کار لائے ہیں۔ کبھی کبھی ان کا جزوی ترجمہ استعمال کیا ہے۔ فارسی اور مراٹھی الفاظ کے مرکبات سے نئی ترکیبیں اختراع کیں ہیں زبان و بیان کا یہ گنگا جمنی امتزاج شاہ داول کے "ناری نامہ" کی اہم خصوصیت ہے۔ شاہ داول نے نصیحت آمیز باتیں نہایت سلیس، پرمغز، متین اور پرکشش انداز میں کہی ہیں۔ وہ ایک شیریں بیان مصلح کی طرح عورتوں

---

[۱] تاریخ ادب اردو: از: جمیل جالبی ص۳۰۲ ، [۲] تاریخ ادب اردو: از جمیل جالبی ص۳۰۳ ،

سے خاطب کرتے ہیں گویا وہ اپنی ہی بیٹی (ابتری) سے مخاطب ہوں۔ وہ کٹر واعظ کی طرح درشت گو نہیں ہیں بلکہ ان کے انداز بیان سے خیر تی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی باتیں دل کی گہرائیوں کو چھولیتی ہیں۔ بہر کیف شاہ داول کی نصیحتیں عورتیں کے لیے بہشتی زیور سے کم نہیں ہیں۔ "ناری نامہ" کے ابتدا میں شاہ داول نے فارسی میں پیش لفظ کے طور پر چند جملے تحریر کیے ہیں۔ ان جملوں کا مطلب یہ ہے کہ ایک نیک صالح اور خدمت گذار بیوی اپنے شوہر کے لیے بہشت کی متقاضی ہے اور بد خصال عورت اپنے شوہر کے لیے جہنم کی آگ سے متشابہ ہے۔

شاہ داول کی نظم میں استعمال شدہ بیشتر الفاظ فی زمانہ متروک ہو چکے ہیں ان میں کچھ الفاظ ایسے ہیں جو مروجہ استعمال اور معنی کے خلاف لکھے گئے ہیں۔ قدیم اردو کے ابتدائی نقوش میں اس نظم کا شمار ہوتا ہے کیونکہ اس نظم کو کم و بیش ۔۵ سال گذر چکے ہیں۔ گیرائی اور گہرائی کے لحاظ سے یہ نظم ایک مخصوص تاثر پیدا کرتی ہے جیسے ایک مشفق باپ اپنی نورِ چشم کو زندگی کے تقاضوں اور نشیب و فراز سے آگاہ کر رہا ہو۔ ان تقاضوں کی تکمیل میں شاہ داول نے شعری قواعد کی سختی سے پابندی نہیں کی ہے۔ املائی غلطیوں کے باوجود لسانی نقطۂ نظر سے اس نظم کا مطالعہ قدیم اردو کے ارتقائی عمل کے رازہائے سربستہ کو فاش کر سکتا ہے۔ زبان کو ٹکسال کے معیار پر کھرا اترنے کے لیے کن کن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے یہ اندازہ بھی اس نظم کا تحقیقی جائزہ ثابت کر سکتا ہے۔ شاہ داول ضرورتِ شعری کو مقدم سمجھتے ہیں اور اس کی خاطر صحت لفظی کا خیال نہیں رکھتے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بیشتر الفاظ کو توڑ مروڑ کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ بعض جگہ ناموزوں مصرعے بھی پائے جاتے ہیں بلکہ شاہ داول بحر کے بدل جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ وہ ان خامیوں کو معیوب نہیں سمجھتے۔ بس ان کا پیغام گوش گذار ہو جائے یہاں ان کی سچی نیت رہتی ہے شاہ داول کے یہاں غلط قافیہ بندی کی چند مثالیں ملتی ہیں۔ ان ادبی اور لسانی نقائص کے باوجود "ناری نامہ" قدیم اردو کا گنج گرانمایہ ہے اس کی اشاعت سے نئے گوشوں پر روشنی پڑے گی اور نئی اصطلاحیں، تراکیب اور الفاظ کا ذخیرہ میسر آئیگا۔

ناری نامہ کا جائزہ:- "ناری نامہ" کے ابتدائی بندوں میں شوہر کے حقوق، شوہر کی تشریح کی گئی ہے اور بار بار یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا فانی ہے لہٰذا "پیو" یعنی شوہر (ہندی شاعری کے زیر اثر) سے ناراضی، بے رخی، بیزاری، کج روی اور نافرمانی گناہِ عظیم کے مترادف ہے۔

چوتھے بند میں اہل ہنود کے مذہبی عقائد کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

ع جنمیں جنم کا ہے بنا (بند نمبر ۴)

شاہ داول نے ایک سے زائد جنم (زندگی) کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہندو عقائد کے بموجب خوشحال میاں بیوی متواتر سات زندگیوں (سات جنموں) تک ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے اور تب کہیں جا کر انھیں "موکش" ملے گا۔ ایک لحاظ سے

شاہ داول نے یہاں پر فلسفۂ آواگون کی ترجمانی کی ہے۔

اسی فلسفہ کی شاہ داول نے بند نمبر ۵ میں نفی بھی کی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں :-

"وہی بت ہے تیرا صنم   پیؤ نا ملے جنمیں جنم

اسلامی تعلیمات کے پیش نظر خدا اور اس کا محبوب رسولؐ اس عورت سے زیادہ خوش ہیں جو شوہر کی خدمت گذار ہوتی ہے اور شوہر کی زیادتیاں سہہ لیتی ہے۔ شوہر کے غصّے اور کڑوی کسیلی باتوں کو صبر کے ساتھ پی جاتی ہے۔ تند خوی اور زبان درازی سے دور رہتی ہے۔

وہ عورت جو گھر کو لڑائی جھگڑے کی آگ سے دور رکھے، شوہر کے غصّہ کی آگ کو مسکراہٹوں کے پھولوں سے بجھاتی رہے اور شوہر کے عیوب کی پردہ پوشی کرتی رہے ایسی عورت کا اللہ کے نزدیک بڑا درجہ ہے۔

اہلِ ہنود کے یہاں عورت کا شوہر پرست ہونا لازمی ہے۔ ان کے یہاں "پتی" ہی پرمیشور ہے۔ دُنیوی خدا ہے لہٰذا عورت کا پتی ورتا ہونا لازمی ہے۔ شاہ داول بھی اسی فلسفہ کے قائل نظر آتے ہیں۔ ذیل کا بند ملاحظہ کیجئے :-

پت ورتا بی بی پاک عمل   انصاف کرنا سگل

تب ہوئے خاصو میں دخل   پیؤ باج کوئی پیارا نہیں   (بند نمبر:)

نیک صفت عورت کو شاہ داول نے "پاک ونتی نار" کے نام سے یاد کیا ہے۔ ایسی عورت نہایت صابر، فقر پرور اور فاقہ کش ہوتی ہے۔ اس عورت کا رتبہ ہر لحاظ سے اعلیٰ وارفع ہے وہ ایک مثالی عورت اور بیوی ہے کیونکہ وہ نیک صالح، وفا شعار اور ایفائے وعدے کی پابند ہے۔ اس کی پیش بینی سے مرد کی زندگی سنور سکتی ہے۔ ایسی عورت کی شوہر پرستی "بھگتی" کا روپ دھار لیتی ہے جیسا کہ دیانت میں عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے ؎

نس دن کر پیؤ کی بھگت   تن ماس سب کالی رگت

سکھ دکھ ستی پیؤ کے سنگت   پیؤ باج کوئی پیارا نہیں   (بند نمبر: ۲۱۵)

شاہ داول تلقین کرتے ہیں کہ بیوی ایسے کام کرے جو اس کے شوہر کو پسند خاطر ہوں۔ شوہر کے روبرو وہ خود کو خوب سے خوب تر انداز میں پیش کرے کیونکہ بقول شاہ داول "جوگن صفت" عورت، شوہر کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکتی لہٰذا وہ کہتے ہیں ؎

جوگن پیا کو بھائے ناں   سوکن کدھیں دکھلائے ناں

بن مُہ پیا کوں پائے ناں   پیؤ باج کوئی پیارا نہیں   (بند نمبر: ۲۷)

شاہ داول بھاتے ہیں کہ بیوی کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ شوہر سے راضی بہ رضا رہے اس کی نافرمانی نہ کرے ایسی

نیک عورت سے شوہر تو شوہر ملائک ارض وفلک بھی خوش رہتے ہیں۔ اس کی سلامتی اور خیر و برکت کے لیے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ بہشت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ عورت اگر ایثار و قربانی کی مورت بن جائے تو وہ اپنے شوہر کے دل پر راج کر سکتی ہے۔ ایسی عورت میں شاہ داول کے نزدیک کئی مخصوصیات ہوتی ہیں۔ ایک مثالی اور ہندوستانی بیوی میں جس قدر صفات ضروری ہیں ان کی طرف شاہ داول کا اشارہ ملاحظہ فرمائیے۔

جو نار نرل بھوگنی[1] جو سار سمرت پدمنی
مقبول بتیس لکھنی[2] پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۴۲)

مندرجہ بالا بند میں عورت کی ۳۲ صفات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ شرنگار رس میں پائے جانے والے ناٹک بھید[3] کے مطابق عورت میں جن ۳۲ لکشنوں (صفات) کی نشاندہی کی گئی ہے ان کی تفصیل پر غور کیجئے۔

۱۔ بھاؤ (پریم)
۲۔ ہاؤ
۳۔ ہیلا
۴۔ شوبھا
۵۔ کانتی
۶۔ دیپتی (چمک)
۷۔ مدھر (مٹھاس)
۸۔ سہنشیل

۹۔ اودارتا
۱۰۔ دھیریہ
۱۱۔ لیلا
۱۲۔ ولاس
۱۳۔ سندر وِش بھوشا والی
۱۴۔ پریم میں گرو کرنے والی
۱۵۔ ہنسنے والی (خوش مزاج)
۱۶۔ کولین (خاندانی)

۱۷۔ مدگا مینی
۱۸۔ پان کے جیسے چہرے والی
۱۹۔ چھریری
۲۰۔ کم بولنے والی
۲۱۔ پدم گندھا
۲۲۔ گنونتی
۲۳۔ کلاوتی
۲۴۔ سوکشم بھوجن (کم کھانے والی)

۲۵۔ نرالس (جو سست نہ ہو)
+ ۷
۳۲

[سامودرک لکشن جو جوتشی کے حساب سے ہوتے ہیں (مجموعی خصوصیات)]

شاہ داول کا صالح مشورہ ہے کہ ایک غلط کار اور بے راہ رو شوہر کو ایک صالح بیوی راہِ راست پر لا سکتی ہے۔ شوہر کو بری اور نازیبا حرکتوں سے باز رکھ سکتی ہے۔ اگر دلبستگی سے کام لے تو اپنا گرویدہ بنا سکتی ہے۔ ایک نیک، فرشتہ صفت اور خاموش طبیعت بیوی کی پہچان بھی یہی ہے۔

اس کے برخلاف باتوں کی حامل بیوی شاہ داول کے خیال میں دوزخ نشیں ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

جیو نار بے فرمان ہے شیریاں بھری شیطان ہے
دوزخ منیں اس ٹھان ہے پیو باج کوئی پیارا نہیں

اسلام میں ایک سے زائد شادیاں جائز ہیں۔ اسی مناسبت سے شاہ داول نصیحت آمیز لہجے میں عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ نہ صرف سوکنوں سے بلکہ ان کی اولاد سے بھی اپنی اولاد کی طرح پیار کریں۔ انھیں اچھی تربیت دیں۔

---

[1] بھوگنی (متعدد صفات رکھنے والی) [2] لکھنی، لکشن लक्षण۔ [3] بشکریہ پروفیسر مسز اگنی ہوتر شعبہ ہندی مہاراشٹر کالج بمبئی

ہر وقت کھانا کھلائیں۔ نہلائیں دھلائیں اور کپڑے پہنائیں۔ روٹھے ہوئے بچوں کو منائیں اور ان کو دل و جان سے خدمت کریں اس طرح وہ اپنے شوہر کے علاوہ اہل خانہ کے دل موہ سکتی ہیں۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں ؎

نہلا، دُھلا کسوتِ[1] پنا — بھوت چاؤ کران کو منا
پر پنچ نہ کران تھے پنا (ہ) — پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۹۰)

شاہ داول نیک طینت بیوی کو غرور، سُستی اور غیر سے دلبستگی نہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ چالاکی سے زندگی بسر کرنے کے طریقہ کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں ؎

مغرور ہو مستی نہ کر — دل غیر سوں بستی نہ کر
چالاک ہو ستی نہ کر — پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۹۵)

شاہ داول کا کہنا ہے کہ زبان درازی اچھی بیوی کا شیوہ نہیں ہے۔ اس سے گھر کا سکھ چین جاتا رہتا ہے۔ خوشحال جوڑے پر اللہ کی رحمت برستی ہے۔ میاں بیوی میں بے بناؤ زندگی کو وہ بھر بنا دیتا ہے۔ دراصل عورت کی کامیاب زندگی کا راز اسی نکتہ میں پوشیدہ ہے۔ ورنہ زندگی میں کڑواہٹ کا زہر پھیل جاتا ہے۔ عورت کو شوہر اس کی قسمت سے ملتا ہے۔ لہٰذا اسے بلا تخصیص اپنے شوہر کے ساتھ نباہ کرنا چاہئیے۔ حتیٰ کہ بقول شاہ داول 'اندھا' مجذوب بدشکل بھی اس کیلئے محبوب ہے۔

؎ اندلا اگر مجذوب ہے — صورت طمع ناخوب ہے
جیسا اچھو محبوب ہے — پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۱۳۰)

؎ کانا، بوچا، تھوتنا اچھو — پانگل اگر نکٹا اچھو
کپٹی، کھوچڑ، کھوٹا اچھو — پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۱۳۱)

؎ جیسا اچھو جس دھات کا — تجھ میں پُنم کی رات کا[2]
روشن طمع ظلمات کا[3] — پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۱۳۲)

شاہ داول ہدایتاً کہتے ہیں کہ خوب سیرت عورت منتر، سحر، جادو ٹونے[4] سے اپنا اور دوسروں کا گھر نہیں جلانا چاہیئے۔ یہ نہایت ذلیل حرکت ہے اور اس سے ایمان کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ ایسی عورتیں مکر و فریب کے چکر میں اپنا گھر تباہ کر لیتی ہیں۔ اللہ ان کو ناشائستہ حرکتوں سے باز رکھے ؎

---

[1] کپڑے ، [2] گورا چٹا ، [3] سیاہ فام ، [4] سفلی عمل کے مطابق دوسروں کا گھر جلانے پر مراد یں بر آتی ہیں۔

ایساں بڈھیاں مکر زناں | اللہ رکھے اُن تھے پنہاں(ن)
سمجھے نہ کوئی ان کی منتاں(ن) | پیؤ باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۱۷۸)

بیوی کو چاہیے کہ وہ اپنے دل سے کدورت دور کردے۔ خود کو نور اور اللہ کی دیگر نعمتوں سے معمور کرے۔ یہی اس کی معراج ہے ؎

دل کا کپٹ دور کر | سب نور سوں معمور کر
نعمت بہتر بھرپور کر | پیؤ باج کوئی پیارا نہیں

بیوی گھر کی چہار دیواری میں حاکم ہوتی ہے۔ اسے اپنے اور شوہر کے عزیز و اقارب سے بدسلوکی نہیں کرنی چاہیے اس کی بایردہ آواز بھی اس کی عفت کی پاسدار ہے۔ لہٰذا اسے اس پر بھی قابو رکھنا چاہیے۔ عورت کے لیے زیور اس کے اخلاق ہیں چاندی، سونے کے زیورات نہیں۔ یہ اس کی عارضی زیب و زینت ہیں۔ چنانچہ شاہ داول کہتے ہیں ؎

زیبا زریشا تن اوپر | کئی صد گُرایاں من اوپر
لعنت اہے اُس زن اوپر | پیؤ باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۱۸۳)
صورت شکل چوں شہری | پینے اوڑھے کسوت کری
کیا کام آئے خصلت بری | پیؤ باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۱۸۴)
صورت اہے خصلت نہیں | خوبوں نے حرمت نہیں
دل سوں کرے قربت نہیں | پیؤ باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۱۸۵)

ایک باوفا بیوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ سکھ اور دکھ میں اپنے شوہر کا برابر ساتھ دے۔ اس سے گھر میں سکون اور اطمینان کے علاوہ خوشحالی قائم رہتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو شاہ داول کے نزدیک اس گھر کی عورت عورت نہیں بلکہ جہنم کی متقاضی ہے ؎

نار ی نہ ہوئی یو نار ہے | اس نار تھے بیزار ہے
دوزخ میں اس کا ٹھار ہے | پیؤ باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۱۹۹)

سگھڑ، وفا شعار اور اچھے رنگ ڈھنگ والی بیوی نہایت مقبول ہوتی ہے اس کے کردار کی خوشبو سے سارا گھر مہکتا ہے۔ اگر اس میں یہ خوبی نہیں ہے تو اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اس کا حال شاہ داول کے نزدیک کچھ ایسا ہے ؎

لہ جولا ہی کی طرح۔

سوگند نہیں صندل بھتر   ہیزم ہے ناچیز تر
پس جالنا جو لیے بھتر   پیو باج کوئی پیارا نہیں   (بند نمبر ۲۰۴)

شاہ داول نے ایک وفادار خوش مزاج اور حلیم الطبع شوہر کے لیے بھی کچھ ہدایتیں کی ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ شوہر بھی اپنی بیوی کا ہر طرح سے خیال رکھے اس سے محبت کرے اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ اس کی جائز فرمائشوں کو رد نہ کرے ان خوبیوں کی وجہ سے وہ بیوی کا محبوب بن سکتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

ہونا مرد اسس سار کا   خاطر رکھے اس نار کا
تو وہ مرد ہوئے پیار کا   پیو باج کوئی پیارا نہیں   (بند نمبر: ۲۰۷)
زن کا جتاہٹ تت چلا   جب ہوئے گرم، کرنا گلا
تو وہ مرد اس کوں بھلا   پیو باج کوئی پیارا نہیں   (بند نمبر: ۲۰۸)

اگر شوہر ہوشمندی سے کام نہ لے تو وہ ضرور دھوکا کھائے گا۔ شوہر کی مثال ایک چابکدست سوار کی سی ہے۔ لہٰذا اسے ہر کام پر چوکنا رہنا ضروری ہے ورنہ اسے نقصان کا احتمال ہے۔ چنانچہ شاہ داول کہتے ہیں ؎

عورت ہتی[1] ہے سوار توں   کھائے گا دغا، ہشیار توں
بُدھ[2] سوں اسے لیا تھار توں   پیو باز کوئی پیارا نہیں   (بند نمبر: ۲۱۱)

عورت کو چاہیے کہ وہ جھوٹ، مکر اور بدگوئی سے پرہیز کرے۔ زندگی کو خوشیوں سے نکھارے۔ غیروں سے پردہ کرے۔ ضد سے باز رہے۔ کیونکہ عورت کی کج فہمی خوشحال زندگی اور عاقبت کو خراب کرسکتی ہے۔ سماج بھی اس سے متنفر رہتا ہے۔ اگر وہ ان باتوں سے دور ہے تو خاندان بھر میں اس کا بول بالا رہتا ہے۔ سماج میں اسکی عزت دوچند ہوجاتی ہے۔ بیوہ عورت کی زندگی بقول شاہ داول کسمپرسی سے دوچار رہتی ہے ؎

جیو لگ مرد کی بھالو ہے   تو لوگ سہاگن نالو ہے
گذریا لو رنڈایا نو ہے   پیو باج کوئی پیارا نہیں   (بند نمبر: ۲۶۱)

صالح عورت بہتر سے بہتر ازدواجی زندگی بسر کرسکتی ہے۔ اس کے لیے ہر قسم کا آرام اور سکھ اسی دنیا میں میسر ہے آخرت میں وہ جنتی بن سکتی ہے ؎   کرتی خوشی کا کاج وے   بھوگ بھوگی سکھ راج وے
جنتی دنیا میں آج وے   پیو باج کوئی پیارا نہیں   (بند نمبر ۲۴۳)

---

[1] ہتی: ہاتھی   [2] بدھ: بدھی، عقل و ہوش۔

اس نظم کے آخری دو بندوں میں شاہ داول نے اس امر کی صراحت کی ہے کہ انھیں یہ نظم کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ۔ عورتوں کی فلاح وبہبود کے پیش نظر اور اپنے صوفیانہ مزاج کے مطابق انھوں نے ایک رات میں یہ نظم مکمل کی ۔ ان کا مدعا عورتوں اور مردوں کی ازدواجی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے پیش نظر بہتر سے بہتر بنانا تھا ۔

(۳۱۴) دیکھیا دنیا کی دھات میں
کیتاں فکر ایک رات میں
بولیا زناں کی بات میں
پیو باج کوئی پیارا نہیں

(۳۱۵) زن تھے ہوا جو دُکھیا
دکھ نار تھے سنیا پکیا
دو بین یوں داول لکھیا
پیو باج کوئی پیارا نہیں

لسانی خوبیاں :۔ "ناری نامہ" میں پائے جانے والے مراٹھی الفاظ :

مراٹھی الفاظ :۔ گھرن घुण ، بھاگ ، گمبھیر ، پت ورت ، سوسنا ، جیوڑا ، کنے ، اوگرم ، کاڑنا ، گوت ، گوتی ، بھیں ، دمنی ، سگلے (سگڑے) ، سمجاو (سبھاو) ، سمرت ۔ समृद्ध ۔ خوشحال ، ناکد (ناکدھیں) ، کھان (کان) ، رگت ، کھٹول ۔ क्षमा سما बो ड़िपाल ۔ بونب ، اگن (اگنی) ، لکھن (لکشن — लक्षण) ، لابھ ، جوڑنا ، موکلا मोकाताना मोकाला ، شتت ۔ सतत ، بھگا ، बली ، پرپنچ ، گرستی ، ٹوٹ टोटा ، جوسی ، ناتھی नाती ، کلھن ؛

دکنی اثر :۔ دکھلاپہ ، نکو ، اپہ ، کنے ، گرتیاں (گرتی) ۔

نئی تراکیب و الفاظ :۔ بوچا (پستہ قد) ، اھا ساس (رونا پیٹنا) ، منصالا (غصیلا) ، چھڑالا (چھپا ہوا) ، ہوکن ہار ، تن ترک (توں تڑاک) ، ہم یار (ساتھی) ، پر بھری (پرائی عورت) ، پرم رس (پریم رس) ، پاک وتی ، تمس لکشنی (۳۰ خصوصیات رکھنے والی) ، کھوٹی کھچڑ (جھوٹی اور کھچڑ) ، پرم باس (پریم باس) ، سکھ پان ، پٹ پٹانا (بڑبڑانا) ، سکھ راج ،

غلط املا :۔

فطن (فتنہ)	منا (منع)	غصا (غصہ)	اکھ (آنکھ)
صحی (صحیح)	وعدا (وعدہ)	اُپر (اوپر)	بھل (بھلا)
بجا (بجھا)	خار (خوار)	اپ (آپ)	وتا (اتنا)
سوکا (سوکھا)	خُش (خوش)	بزار (بیزار)	پناں (پناہ)
اسطراب (اضطراب)	قرب (قریب)	بزاں (بعدازاں)	بھنور (بھنورا)
غلا (غلّہ)	جاب (جواب)	دُنو (دونو)	
حلا (حیلا)	راہ راس (راہ راست)	بری (بھری)	
نفا (نفع)	پرت (پریت)		

ضرب المثل :۔ جیسا پریا ویسا گھٹے (بند نمبر: ۵۳)

(جیسا بوو گے ویسا کاٹو گے)

فارسی ضرب المثل کا ترجمہ: گندم از گندم بروید جو از جو

حدیث نبوی :۔ (بند نمبر ۲۱۵) "زن کی عقل میں نہیں نفا" (عورت ناقص العقل ہے۔)

قول حضرت علیؓ (بند نمبر ۲۲۱)؟

شاہ داول کی نظم میں تشبیہ، تلمیح، استعارہ اور مختلف تجانیس کے علاوہ صنعت تعلی بھی پائی جاتی ہے۔

مثلاً :۔ "یو بول جوں ہیرے رتن"

عربی فقرہ :۔ فوق القہر (بند نمبر ۱۶۱) (غصہ کے عالم میں)

پنجابی اثر :۔ ناہوسی، توڑسی، چنگے،

واؤ زائد کے ساتھ الفاظ :۔ روخ بجائے رخ، دوکھ بجائے دکھ،

الف زائد :۔ داکھ بجائے دکھ ۔ زھار بجائے زہر،

نون غنہ بڑھا کر بنائے گئے الفاظ : فناں بجائے فنا۔ پنہاں بجائے پناہ، ناں بجائے "نا"

نئے محاورے :۔ بول پکڑنا، دسا اترنا، جیب کھولنا، چلائے کرنا، کھشوئی لینا، ہٹ تٹ چلانا، بول مکر آنا، گلا باندھنا، ٹوٹ ہونا، پرم کھولنا، سفر پکڑنا (راہی اجل ہونا)، باٹ لیانا، رنجکوں تلملنا)، بستی کرنا (دل بستن سے)، باراں جھڑنا، ماؤ کرنا (مر جانا) فہام کرنا (فہم کردن سے)، روس اترنا۔ غصہ ٹھنڈا ہونا، دلبست ہونا۔ دل بستن سے، جیو جوڑنا۔ دل لگانا، امر توڑنا۔ حکم عدول کرنا، انجھو لوٹنا۔ آنسو پرونا، منہ سوٹ کرنا۔ سونٹھ کی طرح منہ بنانا، منہ کھشا کرنا۔ تلخی ظاہر کرنا، مکھ جیب جتن کرنا۔ زبان کو قابو میں رکھنا۔

پروفیسر مختار الدین احمد
سابق صدر شعبۂ عربی
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

دیوان مصحفی کا خدا بخش ایڈیشن

آپ نے بہت اچھا کیا کہ دیوان مصحفی (قدیم ایڈیشن) کو دوبارہ شائع کر دیا جو بے حد کمیاب تھا۔

دیوان ہفتم و ہشتم پنجاب یونیورسٹی میں نہیں۔

انجمن سے عقد ثریا ہی نہیں تذکرۂ ہندی اور ریاض الفصحا بھی شائع ہوئے ہیں۔

آپ کی تحریر بھی دیکھی، بہت محنت کر کے بہت مفید معلومات آپ نے درج کیے ہیں، مجھے یقین ہے کہ آئندہ مصحفی پر کام کرنے والے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔ مختلف عنوانات کے تحت اشعار کے انتخاب میں آپ کو بہت کھکھیڑ اٹھانی پڑی ہوگی، لیکن اس طرح یہ ایک مفید کام ہو گیا۔ فرنگ و فرنگی محل دو دخل پر دو تین شعر مشہور تھے آپ نے دس شعر تلاش کر لیے ہیں۔

عہد مصحفی کے کچھ متفرقات اور "فرہنگ مصحفی" میں بڑے کام کی باتیں آپ نے لکھی ہیں اور شعر خوب تلاش کیے ہیں اس کی میں داد دیتا ہوں۔ الفاظ و فقرات پر صفحہ نمبر بھی دے دیتے تو یہ فہرستیں اور مفید بن جاتیں۔ شعر بہر حال لکھ دیے ہیں اس طرح اس مجموعے سے نکالے جا سکتے ہیں۔

لق لق والا شعر پورا نقل نہیں کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا کہ مصحفی نے یہ کس مفہوم کو ادا کرنے کیلیے استعمال کیا ہے۔
لق لق دبلا پتلا پرندہ ہے بگلے کی طرح، ہم نے بچپن میں بہار میں کئی لق لق شکار کیے ہیں۔ لاہور کے صحافی حاجی لق لق دبلے پتلے آدمی تھے اس لیے وہ اس نام سے مضامین لکھتے رہے۔

مصرع لکھا ہے ع خوش آئی کب ہے یہ لق لق کسی کو

یہ لق لق (بک بک) تو نہیں۔ پہلا مصرع میرے سامنے نہیں اس لیے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، ویسے لق لق اڑ گیا بولتے ہیں؟ لق لق اڑ گئی نہیں۔ میرا انتخاب دیوان مصحفی دیکھا تو اس میں یہ شعر ہی نہیں ملا۔ اس سے خیال ہوا کہ آپ نے مصحفی کے سارے دواوین پیش نظر رکھے ہیں۔ ورنہ مصحفی کی مثنوی طفل حجام کا مصرع: ع منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال۔ نقل نہ کر سکتے یہ مثنوی وہاں کے دیوان میں ہے اور میں نے کوئی پچاس سال پہلے رسالہ ندیم (گیا) میں شائع کی تھی اس کا پہلا مصرع مجھے اب تک یاد ہے۔ ع سنے ہے مصحفی اک توبہ فی الحال۔ اس زمانے میں میں مثنویات مصحفی مرتب کر رہا تھا لیکن یہ ایک لمبا قصہ ہے۔

سرور صاحب کی فرمائش پر قاضی صاحب نے آٹھوں دواوین کا انتخاب مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ میں نے ان سے کہا اچھا ہے اس طرح مصحفی کے بہت اچھے اشعار پڑھنے کو مل جائیں گے، کہنے لگے یہ انتخاب بہترین اشعار کا نہیں بلکہ انتخاب میں

متعدد امور پیش نظر رکھے ہیں میں نے۔ کہتے تھے چار دواوین کا انتخاب کر لیا ہے۔ مجھے دو تین چھوٹی چھوٹی کاپیاں پوسٹ کارڈ سائز کی پنسل سے لکھی ہوئی دکھائیں ان سے صرف وہی کام لے سکتے تھے، افسوس ہے وہ یہ کام مکمل نہ کر سکے۔

معصمت کا دو جگہ ذکر ملا (صفحہ سینتیس) یہ ان کی محبوبہ تھیں۔ آپ نے "مزاری" پر اوپر خط کیوں کھینچا ہے؟ (صفحہ تنتالیس)۔

کیا آپ کو یقین ہے کہ گلزار ابراہیم سے علی ابراہیم خاں حالؔ کا تذکرہ مراد ہے؟

"کاٹ" کو میں مونث سمجھتا تھا۔ ع۔ نہ دیکھی ہم نے کاٹ ایسی کسی شمشیر براں میں۔ لیکن مصحفی کے یہاں "تلوار کا کاٹ" ملا۔ ہم "بندوق کی نال" بولتے ہیں، اس زمانے میں "بندوق کا نال" کہتے ہوں گے۔ "ابتدا" کو مذکر استعمال کیا ہے "دوستی کا ابتدا" لسانی حیثیت سے یہ باتیں اہم ہیں۔

آپ نے بعض شعروں کو قلابین [   ] میں کیوں رکھا ہے سمجھ میں نہیں آیا۔

مضمون کے بارے میں کچھ مزید باتیں:۔

دیوان قصائد سے مراد نسخہ رام پور ہوگی۔ قصائد کے دیوان کا ایک نسخہ کئی سال پہلے غالب انسٹی ٹیوٹ نے خریدا ہے، اچھا نسخہ ہے اس پر ایک تفصیلی مضمون غالباً نثار احمد فاروقی کا شائع بھی ہوا ہے۔ مستند نسخہ ہے۔ اس کا عکسی اڈیشن شائع کر سکتے ہیں۔ قصائد کا ایک نسخہ شاید ڈھاکا میں بھی ہے اگرچہ میں نے نہیں دیکھا۔ قاضی صاحب ذکر کرتے تھے۔

دیوان فارسی نسخہ رام پور جس کا آپ نے ذکر کیا ہے غالباً غیر مکمل ہے۔ دیوان کا ایک نسخہ جامعہ ڈھاکا کے کتب خانے میں میری نظر سے گذرا ہے۔ اس کا عکس بھی میں نے حاصل کر لیا ہے۔ نسخہ رام پور میرے پیش نظر نہیں۔ یہ غیر مکمل دیوان ممکن ہے وہی ہو جو نظیری کے جواب میں انھوں نے مرتب کرنا چاہا تھا۔ اب اگر دیوان فارسی نسخہ ڈھاکا جس کا عکس میں نے حاصل کیا ہے وہی ہو جو جلال، اسیر اور ناصر علی کے تتبع میں تھا اور پورا ہو گیا تھا، تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔

ہاں نگار کا مصحفی نمبر بہت قیمتی ہے اور اب کبریت احمر کا درجہ رکھتا ہے، اس کا عکسی اڈیشن آپ چھاپ دیں تو کیا کہنا! اس پر میں نے ایک طویل مکتوب نیاز صاحب کو لکھا تھا اور تحقیقی مضامین پر سخت تنقید کی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی اور مسرت بھی کہ انھوں نے اس ناچیز خط کو مضمون بنا کر اگلے ماہ شائع کر دیا۔ افسوس ہے کہ یہ شمارہ میرے پاس نہیں رہا۔ تلامذۂ مصحفی پر بھی میرا مضمون نگار کی متعدد اشاعتوں میں چھپا جو مصحفی نمبر کے لیے میں نے لکھا تھا لیکن تاخیر سے بھیجا تھا۔ آپ مصحفی نمبر کے ساتھ ان دونوں تحریروں کو بھی شائع کر سکتے ہیں۔

○●

جناب عارف نوشاہی
معارف نوشاھیہ
اسلام آباد، پاکستان
(حال مقیم تہران)

تصوّف مخطوطات

جرنل کا مخطوطات نمبر (۶۹-۴-۷) دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کے ادارے نے مخطوطات سے دلچسپی برابر قائم رکھی ہے بلکہ علاقے کے بہت سے محققین اور طلاب کو بھی اس طرف لگا رکھا ہے۔ مخطوطات سے یہ اعتنا یقیناً تحقیق کی نئی راہیں کھولے گا۔ ہمارے ہاں پاکستان میں ایرانی حکومت کی دلچسپی سے فارسی مخطوطات پر تو توجہ دی جارہی ہے مگر عربی اور اردو مخطوطات کی فہرست نویسی پر خاطر خواہ کام نہیں ہو رہا ہے۔ خدا جانے کیا عمرانی تبدیلیاں آئی ہیں کہ ہمارے اُمّہات ادارے (انجمن ترقی اردو، پنجاب یونیورسٹی) ساٹھ اور ستّر کے عشروں میں مخطوطات شناسی پر کچھ کام کر کے اب اس سے لاتعلق بیٹھے ہیں۔ حالانکہ جس طرح مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد نے فارسی مخطوطات کی مشترک فہرست تیار کروائی ہے اُسی نہج پر پاکستان میں عربی اور اردو مخطوطات کی مشترک فہرست مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ عربی مخطوطات کے سلسلے میں معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر احمد خان صاحب (رکن ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد) کسی عرب ملک کے ایما پر تن تنہا جامع فہرست تیار کر رہے ہیں، خدا انھیں اس کی تکمیل کی توفیق بخشے، فارسی کو ایرانیوں کی اور عربی کو عربوں کی سرپرستی میسر آگئی، کیا اردو ہی اپنے وطن میں غریب الوطن رہے گی؟ راقم السطور کی یہ تجویز ہے کہ خدابخش لائبریری اپنے وسائل اور ہمت افزائی سے کم از کم ہندستان میں عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی الگ الگ جامع فہرستیں بنوائے۔ عربی اور فارسی مخطوطات کی فہرست نویسی کے لیے یقیناً اسے ہندستان میں قائم عرب۔ ایران ثقافتی مراکز سے بھی مدد مل جائے گی۔ مخطوطات پر سمینار منعقد کروانا اور ان میں خواندہ مقالات کی اشاعت یقیناً مفید اور مخطوطات شناسی کی تحریک کو زندہ رکھنے کی عمدہ کوشش ہے، لیکن شائع شدہ مقالات اور ملخص فہارس دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ رطب و یابس جمع کر دیا گیا ہے اور کچھ کام سپاہی لشکر بڑھانے کے ذیل میں بھی آتا ہے۔ جب اتنا وقت اور سرمایہ صرف ہو ہی رہا ہے تو اس علمی منصوبے میں فنی باریکیوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ کیا ہی بہتر ہوتا مخطوطات نمبر کا اشاریہ بھی بنوا کر ساتھ لگا دیا جاتا تاکہ اس خاص شمارے کے پہلے ۴۸۶ صفحات سے بھی بسہولت استفادہ ہو سکتا۔

ہندستان کے کتابخانوں میں فارسی و عربی مخطوطات اِس اعتبار سے تو مفید ہے کہ کم از کم یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں

کتاب ہندستان میں موجود ہے لیکن اگر کوئی ان کی عکسی نقل حاصل کرنا چاہے تو کس نمبر کا حوالہ دے، ایک ہی کتاب کے متعدد نسخوں کی صورت میں یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ نسخے کی ماہیت بھی معلوم نہیں ہوتی۔

احقر نے پہلے بھی اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ آپ کا ادارہ یہ فہرست "غیر مطبوعہ" کتابوں کی تخصیص کے ساتھ پیش کر کے ایک شدید علمی مغالطے اور مبالغہ کا شکار ہو رہا ہے۔ اس خاص شمارے میں بھی ہندستان اور پاکستان میں مخطوطات تصوف کی جو فہرستیں پیش کی گئی ہیں وہ اسی دعوے کے ساتھ پیش کی گئی ہیں حالانکہ یہ سراسر گمراہ کن ہے ہمیں مندرجہ ذیل حقایق کو مدنظر رکھنا ہوگا:

اولاً: ابھی تک تمام فارسی مطبوعات کی فہرست تیار نہیں ہوئی؛

ثانیاً: جو فہرستیں تیار ہوئی ہیں وہ بھی تمام کی تمام ایک شخص کی دسترس میں نہیں ہیں؛

ثالثاً: فارسی زبان کی قلمرو اس قدر وسیع ہے کہ ہم ایک دوسرے کی اشاعتی سرگرمیوں سے بے خبر ہیں، اس پر مستزاد یہ کہ غیر فارسی ممالک میں بھی فارسی کتابیں چھپ رہی ہیں اور ان کی اطلاع بھی کم ہی پہنچتی ہے۔

"پاکستان میں تصوف کے مخطوطات" کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ "جو طبع نہیں ہوئے اور صرف پاکستان میں موجود ہیں"۔ یہ دونوں باتیں صحیح نہیں۔ ان میں سے طبع بھی ہو چکے ہیں اور ہندستان میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً حسب ذیل کتب طبع ہو چکی ہیں۔

چہار بہار، حسنات الحرمین، حورائیہ از عبید اللہ احرار، حورائیہ از یعقوب چرخی، خلاصۃ العارفین، رشف الالحاظ فی کشف الالفاظ، شرح اسماء الحسنیٰ یعقوب چرخی، نسایم گلشن، مفاتیح الاعجاز، شرح مثنوی معنوی شاہ داعی شیرازی، شرح فصوص الحکم خواجہ محمد پارسا، معارف تصوف، نی نامہ جامی و چرخی، یواقیت الحرمین۔

یہ چند نام حافظے کی بنیاد پر لکھ دیے ہیں ورنہ اور بھی رسائل ہیں، جو طبع ہو چکے ہیں۔

احسن الشمائل کے ایک نسخے کا ذکر صفحہ ۹۷ پر ہوا ہے جو علی گڑھ میں ہے جب کہ فہرست پاکستان ص ۱۹۷ پر اسے منحصر بہ پاکستان بتایا گیا ہے۔

اشاریہ مصنفین مخطوطات تصوف کی ترتیب میں مزید دقت نظر کی ضرورت تھی۔ ایک ہی نام مختلف شکلوں میں درج ہو گیا ہے۔ مثلاً عبید اللہ احرار کا نام صفحہ ۲ پر بذیل عبد اللہ بن محمود شاشی صفحہ ۴ پر عبید اللہ احرار اور اسی کے نیچے بذیل عبید اللہ بن محمود شاشی (کذا) ضبط تحریر ہوا ہے۔ شمارہ ۷۵ کے تحت خوارق کا ذکر ہے اور خواجہ عبید اللہ احرار کو اس کا مصنف بتایا گیا ہے۔ چونکہ احقر کے پاس اسی نسخے کا عکس موجود ہے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ احرار کی تصنیف نہیں بلکہ ان کے خوارق ہیں جو مولانا شیخ نے جمع کیے ہیں۔ شمارہ ۹۱

کے تحت رسائل سماع مکتوبہ خواجہ عبداللہ احراری کا ذکر ہے اور اشاریہ میں اسے عبیداللہ احرار کی تصنیف قرار دیا گیا ہے۔

مخطوطات نمبر کے پہلے حصے میں جو متفرق مقالات چھاپے گئے ہیں ان میں سے بعض بالکل قلم برداشتہ ہیں اور تعارف مخطوطات کے بنیادی تقاضوں کو بھی پورا نہیں کرتے مثلاً صفحہ ۳۶۳ پر بنگلہ دیش کے نوادر، اس مقالے میں کہیں نہیں بتلایا گیا کہ یہ مخطوطات کس کتب خانے میں ہیں۔ صفحہ ۳۸۳-۳۸۴ پر جواہر الاسرار کے تعلق میں اس کے کاتب کے بارے میں تو بحث کی گئی ہے مگر کتاب کے مندرجات پر دو سطریں ہی لکھی گئی ہیں اگر اس کتاب کی دس فصلوں کا تعارف لکھ دیا جاتا تو اس مجہول المولف کتاب کی شناخت میں مدد ملتی۔ صفحہ ۴۰۰ پر مقالہ "تصوف میں ہندستانی علماء و مشائخ کی کچھ اہم غیر مطبوعہ تصانیف" میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کو خلط کر دیا گیا ہے اور نہایت درجہ ابہام پایا جاتا ہے کہ مقالہ نگار کس کتاب کو متعارف کرانا چاہتا ہے۔ مقالہ نگار نے جن تصانیف کو "اہم" کے طور پر پیش کیا ہے ان میں سے بیشتر مجہول الاسم، غیر اہم مختصر رسائل ہیں اور مصنف کی طرف ان کا انتساب بھی محل نظر ہے۔ مثلاً معین الدین چشتی کا رسالہ عرفانی؛ ضیاء الدین نخشبی کی تصنیف "سلک السلوک" تہران سے باہتمام غلام علی آریا چھپ گئی ہے چراغ دہلی کا رسالۂ تصوف؛ شرف الدین احمد منیری کا رسالۂ عرفانی، گیسو دراز کا رسالۂ عرفانی؛ راجو قتال کا تحفۃ النصائح متعدد بار چھپ چکا ہے؛ ابو العلا اکبر آبادی کا رسالۂ تصوف۔ ان مجہول رسائل کی کیا اہمیت ہے؟

مختلف مقالات میں جن مخطوطات کا تعارف ہوا ہے ان میں سے حسب ذیل طبع ہو چکے ہیں۔ الجانب الغربی طبع تہران (ص ۲۸)، فصل الخطاب (ص ۱۶۸)، مرصاد العباد (ص ۱۷۸)، چہل مجلس سمنانی (ص ۳۷۸)، رسالۂ یعقوب بن عثمان غزنوی در سیرت بہاء الدین النقشبندی (کذا) (درست نقشبند) (ص ۳۷۸) یہ غالباً رسالۂ ابدالیہ یا انسیہ ہے اور یہ دونوں چھپ چکے ہیں۔ ان کا مقام وفات حرف (کذا) ایران بتایا گیا ہے یہ غلط ہے۔ غایۃ الامکان (ص ۳۷۹) یا غایۃ البیان (ص ۳۸۰) یہ کراچی، تہران، انکاسے طبع ہو چکا ہے۔ صفحہ ۴۳۵ پر سطحیات (کذا) (درست شطحیات) دارا شکوہ کا ذکر ہے۔ یہ دراصل ان کی کتاب حسنات العارفین ہے جو تہران سے طبع ہو چکی ہے۔

مخطوطات تصوف پاکستان کا ایک ماخذ فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان جلد پنجم بتایا گیا ہے۔ یہ جلد سوم ہے۔ اس کی ضخامت ۲۱۳۲ صفحات نہیں بلکہ از صفحہ ۱۲۰۹ تا ۲۱۳۲ ہے۔

اس خردہ گیری کے باوصف راقم السطور آپ کے اس اہتمام کے لیے رطب اللسان ہے جو آپ مخطوطات شناسی میں کر رہے ہیں۔ اس کی تقلید ہمارے پاکستانی علمی اداروں کو بھی کرنا چاہیے۔

امید ہے مستقبل قریب کی کوششیں بہتر انداز میں پیش کی جائیں گی۔ ہم سب طالب علم آپکے مرہون منت ہیں۔

●●

تاریخ ہند: عہد وسطیٰ

◉ شہنشاہ اکبر کا دار الترجمہ

ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی (آسٹریلیا)

ترجمہ:۔ جناب سید حسن عباس (تہران)

ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی (آسٹریلیا)
ترجمہ: جناب سید حسن عباس (تہران)

شہنشاہ اکبر کا دار الترجمہ *

مسلمانوں کی ابتدائی علمی اور فکری سرگرمیوں کی تاریخ کی توسیع تین واضح مرحلوں میں ہوئی ہے۔ پہلے مرحلے میں مسلمانوں نے یونانی اور سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ دوسرے مرحلے میں مختلف ہندستانی اور یونانی نظاموں میں ہم آہنگی پیدا کی اور تیسرے مرحلے میں انھوں نے خود علمی اور فکری تخلیقات کا کام شروع کیا۔ سنسکرت کی جن کتابوں نے سب سے زیادہ مسلمانوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کی وہ ہیئت و نجوم، ریاضیات اور مواعظ و نصائح کی کتابیں تھیں۔ نجوم میں "سیدانتا" اور مواعظ میں "کلیلہ و دمنہ" جن کا پہلے ہی ترجمہ کیا جا چکا تھا ان کا دوبارہ ترجمہ ہوا۔ یونانیوں کی فکری میراث جو صدر اسلام کی عقلی فلسفے کی تحریکوں سے بیشتر ہم آہنگ تھی سنسکرت کے وسیع فلسفیانہ اور مذہبی کاموں سے چشم پوشی کا باعث بنی۔ ہندوازم کے دلچسپ نکات اور اس کے آداب و رسوم، جن کا ذکر ابوسعید عبدالحی گردیزی کی کتاب "زین الاخبار" میں آیا ہے، دراصل اس کی اساس ابن خردابہ (۹۱۱-۸۲۵ھ/۱۵۰۵-۱۴۲۲ء) کی ناپید کتاب "المسالک والممالک" ہے۔

ابوریحان البیرونی (۴۴۲-۳۶۲ھ/۱۰۵۰-۹۷۳ء) نے سنسکرت کی کئی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا اور اپنی تحقیقات زندۂ جاوید کتاب "تاریخ الہند" میں پیش کیں۔ شہرستانی نے اپنی معروف کتاب "الملل والنحل" میں ہندستان میں مختلف مذاہب اور فرقوں کے بارے میں جو مقالہ تحریر کیا ہے، اس میں ہندوازم کا مختصر تحلیل و تجزیہ پیش کیا ہے البتہ ان کاموں کا ہندستان کی بعد کی مسلمان نسلوں پر کوئی خاص مثبت اثر نہیں ہوا۔ ان سیاحوں اور ماہرین جغرافیا کی تحریروں کو بھی ہم تحقیق و تجزیے سے خالی پاتے ہیں جنھوں نے پانچویں ساتویں صدی ہجری کے وقفے میں ہندستان کا سفر کیا۔ انھوں نے صرف مجموعی اور عام اطلاعات فراہم کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ہندوازم کی تفصیل جو بناکتی (متوفی: ۷۳۰ ہجری) اور

---

* یہ مقالہ ذیل کی کتاب کے ایک حصے کا ترجمہ ہے:۔
Rizvi, S.A.A.: Religious and Intellectual History of Muslims in Akbar Reign (Delhi, 1975)
اس مقالے کا فارسی ترجمہ "رسالہ مشکوۃ مشہد" (ایران) کے شمارہ: ۱۴ سال ۱۳۶۶ ہجری شمسی میں شائع ہو چکا ہے۔ فارسی میں ترجمہ سید حسین السادات نے کیا ہے۔

حافظ ابرو[۲] کی تخلیقات میں پیش کی گئی ہے، آٹھویں سے دسویں صدی ہجری کے درمیان ہندستان اور ایران کے منتخب مسلمانوں کے ذریعے ایک ایسا تحلیل و تجزیہ ہے جو خلط ملط اور غلط ہے۔

بعض صوفیوں نے زاہدانہ ہندستانی افکار کے سلسلے میں اپنی خاص دلچسپی کا اظہار کیا تھا[۳]۔ سید محمد بن سید یوسف حسینی گیسو دراز مثال ہیں کہ انھوں نے ہندوؤں کے مذہبی آثار کا اس خاص مقصد کے تحت مطالعہ کیا ہے کہ برہمنوں سے مذہبی مباحثے (مناظرے) کئے جا سکیں[۴]۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کو ۷۶۳ھ/۱۳۶۲ء میں فتح نگر کوٹ کے دوران جوالامکھی مندر سے تقریباً ایک ہزار تین سو سنسکرت کے قلمی نسخے ہاتھ لگے۔ اس نے ان میں سے بعض کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے سنسکرت میں نجوم اور ریاضیات کے موضوع پر ہونے والے کاموں سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ عزالدین خالد خانی نے سلطان فیروز شاہ کی زندگی میں ہی "دلائل فیروز شاہی" کے نام سے نجوم اور طب کے موضوع پر ایک کتاب کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ اب نہیں ملتا لیکن اکبر کے عہد میں موجود تھا اور نظام الدین احمد نے اس پر نظر ثانی کی تھی[۵]۔

سنسکرت سے فارسی میں ہونے والا ایک زندۂ جاوید ترجمہ جو فیروز شاہ کے عہد میں ہوا، مشہور ہندستانی منجم VARAHAMIHIRA فرزند ADIT YADASA کی کتاب "بریہات۔ سمہتا" ہے۔ اس کا ترجمہ عبدالعزیز شمس بہالوری نے کیا[۶]۔ اگرچہ بیرونی نے پہلے ہی اس کا ترجمہ کر ڈالا تھا[۷]۔ لیکن عبدالعزیز کو بیرونی کے ترجمے کی خبر نہیں تھی۔ سلطان زین العابدین کشمیری (۸۲۶-۸۷۷ھ/۱۴۲۰-۱۴۷۰ء) سلطان سکندر لودھی اور دیگر مسلم حکمرانوں نے سنسکرت سے ترجمے کے سلسلے میں اپنی خاص دلچسپی دکھائی ہے، لیکن اکبر نے مختلف زبانوں کی گرانقدر تالیفات کے فارسی ترجمے کرا کے ایک نیا سلسلہ شروع کیا۔ اکبر کے نزدیک اس کی دو وجوہات تھیں۔

۱۔ اپنی متجسس حس کی تسکین۔ ۲۔ دانشور طبقے کے درمیان معلومات کا تبادلہ۔

فارسی ترجمہ اس لحاظ سے قابل توجہ تھا کہ بہرحال فارسی ہندوؤں اور مسلمانوں میں رائج زبان تھی[۸]۔

اکبر بچپن میں لکھنے پڑھنے کی نعمت سے محروم رہا تھا لہٰذا مولوی اور حافظ کے دلکش اور دلپذیر اشعار سن کر لطف اندوز ہوتا تھا اور جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو معمولاً اس کے لئے کتابیں پڑھی جاتی تھیں جن میں تاریخ اور داستان کی کتابیں اُسے بہت پسند تھیں۔ ان کتابوں میں اسے "حمزہ نامہ" سے عشق تھا۔ "حمزہ نامہ" دو تاریخی شخصیت کی شجاعت کی داستان ہے۔ پیغمبرؐ کے چچا حمزہ جو جنگ بدر میں کام آئے (سال دوم ہجرت) اور امیر حمزہ (متوفی: اوائل تیسری صدی ہجری) جنھوں نے عباسی خلیفہ کے خلاف ایک تحریک کی قیادت کی اور جن

کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان سندھ حتیٰ کہ سیلان پر لشکر کشی کی ہے۔

تقریباً ۷۶-۹۷۵ھ/۱۵۶۸ء میں اکبر نے درباری مصوروں کے ایک گروہ کو ایک بڑے پردے پر امیر حمزہ کی داستان کی تصویر کشی کا حکم دیا۔ سو افراد پر مشتمل ایک گروہ اس کام میں مشغول ہوگیا۔ ابتدا میں یہ کام معروف ایرانی مصور "میر مصور"[۹] کے بیٹے میر سید علی جدائی کی زیر نگرانی شروع ہوا۔ اس کے بعد اسے پورا کرنے کی ذمہ داری خواجہ عبدالصمد شیرازی[۱۰] کو سونپ دی گئی۔ عطاء اللہ قزوینی نے تصویری واقعات کی وضاحت کے لئے "داستان امیر حمزہ" کے موضوعات کو نظم کا جامہ پہنایا[۱۱]۔ اسی طرح ابو مسلم خراسانی (مقتول: ۱۳۷ھ/جنوری فروری ۷۵۵ء) کے افسانوی واقعات بھی اکبر کے لئے دلچسپ تھے۔ ابو مسلم خراسانی نے عباسیوں کے مفاد میں امویوں کی مخالفت کا علم بلند کیا تھا۔ اسکے علاوہ اکبر "شاہنامہ فردوسی" اور "جوامع الحکایات" سے بھی لطف اندوز ہوتا تھا۔

۸۳-۹۸۲ھ/۷۵-۱۵۷۴ء کے برسوں میں اکبر کی مذہبی اور فکری آرزوؤں نے علمی کاموں میں اس کی دلچسپی میں اضافہ کردیا تھا۔ جمادی الثانی ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں جب وہ مغربی ہندستان کے سفر سے واپس آرہا تھا تو قنوج میں اس نے مولانا عبدالقادر بدایونی کو "سنگھاسن بتیسی" کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ سنگھاسن بتیسی، بکرماجیت، اور بتیس مجسموں کی داستان ہے۔ ایک باخبر برہمن کو بھی متون کی تشریح و تفسیر کے لئے بدایونی کے ساتھ کردیا۔ اکبر کے حکم کو عملی جامہ پہنانے کیلئے بدایونی نے اسی دن کتاب کے دو صفحات کا ترجمہ کرکے اکبر کو پیش کیا جسے اس نے پسند کیا۔ "نامۂ خرد افزا" ایکسال میں مکمل ہوا[۱۲]۔

دوسرے سال اکبر نے عربی کتاب "حیات الحیوان" کا فارسی ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ کتاب حیوان شناسی میں ایک اہم تالیف ہے۔ اس کا مؤلف کمال الدین محمد بن موسیٰ دمیری (متوفی: ۸۰۸ھ/۰۶-۱۴۰۵ء) ہے۔ بدایونی کہتے ہیں کہ "پہلے اس کا ترجمہ ابوالفضل کے والد شیخ مبارک نے کیا تھا"[۱۴]۔

ان ہی ایام میں بدایونی کو شیخ بھاون کی تفسیروں کی اساس پر "اتھروید" کا ترجمہ کرنے کا حکم ملا۔ لیکن مفر کو مطالب کی تفسیر و توضیح میں کافی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب بدایونی نے مشکلات کا ذکر اکبر سے کیا تو اکبر نے پہلے فیضیؔ پھر حاجی ابراہیم سرہندی کو اس کے ترجمے کی ذمہ داری سونپی، لیکن ان میں سے کسی کو کامیابی نہیں ملی[۱۵]۔

جب "عبادت خانے" کی فعالیت کا میدان وسیع ہوگیا اور تمام مذاہب کے ماننے والوں کو بحث و مباحثہ کی اجازت مل گئی تو پھر مختلف مذاہب کی کتابوں کے صحیح فارسی ترجمے کی ضرورت درپیش ہوئی۔ ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء میں ابوالفضل کو فارسی میں انجیل کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ MACLAGAN کہتا ہے کہ "ہمارے لئے یہ مشخص نہیں ہے کہ آیا یہ حکم عموماً چاروں مقدس انجیل سے متعلق ہے یا براہ راست پادریوں کی طرف سے صادر ہوا ہے[۱۶]۔" ایسا معلوم دیتا ہے کہ

ربیع الاول ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں جب اکبر نے پرتگال کے بادشاہ کو انجیل، زبور اور توریت کے صحیح عربی یا فارسی ترجمے کے بارے میں خط لکھا تھا تو یہ کتابیں دربار میں موجود نہیں تھیں لہٰذا اکبر نے پرتگال کے بادشاہ سے مذکورہ تینوں کتابوں کے ہمراہ عربی فارسی کی دیگر جو کتابیں ان کے پاس ہیں، بھیجدینے کے لئے کہا۔[17] ابوالفضل کا ترجمہ کردہ کتاب مقدس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے لیکن یوں معلوم دیتا ہے کہ اس نے ایک عیسائی مبلّغ کے تعاون سے (اس کا) ترجمہ کیا تھا، اور بسم اللہ کے بجائے جس کا مسلمان ہر کام سے پہلا استعمال کرتا ہے، ابوالفضل نے یہ ٹکڑا لکھا تھا " اے وہ جس کا نام عیسیٰ اور مسیح ہے" اور شیخ فیضی نے " سبحانک لاسواک یاھُو " کا اس پر اضافہ کیا۔[18] یوں لگتا ہے کہ ان تراجم نے اکبر کو سنسکرت کے مذہبی کاموں کے وسیع پیمانے پر ترجمے کے لئے اکسایا اور نتیجے میں فتح پور سیکری میں ایک منظم دارالترجمہ قائم کیا گیا۔[19] بدایونی کہتے ہیں:

" شاہنامہ اور داستان امیر حمزہ کے استنساخ اور مصور ہونے اور ابومسلم نیز "جوامع الحکایات" کی داستانیں مکرّر سننے کے بعد اکبر نے قدیم ہندی کے کاموں کا فارسی ترجمہ کرانے کا فیصلہ کیا۔"

اور بقول بدایونی، شہنشاہ کا خیال تھا کہ:

" اکثر اینہا شاعری و ساختگی است، اما چون در ساعت خود گفتہ شدہ و اختر در گذر بودہ شہرت تمام گرفتہ اکنون کتابہای ہندی را کہ دانایان مرتاض عابد نوشتہ اند و ہمہ صحیح و نص قاطع است و مدار دین و اعتقادیات و عبادات این طایفہ برآن است ترجمہ از ہندی بہ زبان فارسی فرمودہ، چرا بہ نام خود نسازیم کہ غیر مکرّر و تازہ است و ہمہ مثمر سعادات دنیوی و دینی و منتج حشمت و شوکت بی زوال و مستوجب کثرت اولاد و اموال چنانچہ در خطبۂ آن کتب نوشتہ اند۔"[20]

ابوالفضل نے مہابھارت کے فارسی ترجمے کے مقدمہ میں تفصیل سے لکھا ہے کہ کن چیزوں نے اکبر کو سنسکرت کتابوں کے فارسی ترجمے کرانے پر مجبور کیا جو خود اس کی زیر سرپرستی انجام پائے تھے۔ یہ دلچسپیاں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ رعایا کے مختلف عقائد و ادیان کی شناخت کے لئے منظم منصوبہ بنایا گیا تھا۔ اکبر کے مقاصد اور محرکات کے جائزے سے قبل ابوالفضل اظہار افسوس کرتا ہے کہ ماضی کے حکمراں، رعایا کی مذہبی ضرورتیں پورا کرنے کے فریضے سے پوری طرح غافل تھے، حتیٰ کہ اُس وقت بھی جب رعایا کے مذہبی مسائل ان کے کانوں تک پہونچتے تو وہ ان مسائل پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ انہیں یادہ گویوں کی جنگ و جدال کے خوف نے مذہبی مسائل پر ذاتی طور پر توجہ دینے سے باز رکھا تھا۔ انھوں نے (بادشاہوں نے) یہ مسائل ان لوگوں کے حوالے کر رکھے تھے جو فتوی کے علاوہ کچھ نہیں جانتے تھے یا پھر وہ اہل کلام کے حوالے کر دیئے گئے تھے جنھیں خود اپنے مذہب کی حقیقی روح کا علم نہیں تھا۔

لیکن ابوالفضل کہتا ہے کہ اکبر نے اس سلسلے میں بھی اپنی جرأتمند پالیسی سے کام لیا۔ اس سیاست کی بدولت جس نے اس کی پوری زندگی میں تمام کوردل ارکان کو مایوس کر دیا تھا، مذہبی موضوعات کی تحقیق و تحلیل کی ایک نئی فضا قائم ہوئی[۲۱]۔ اکبر کی جانب سے کئے جانے والے نئے انتظامات کے سلسلے میں ابوالفضل مزید کہتا ہے:

"مخترعی کہ در انتظام امور سلطنت و ارتسام نقوش خلافت چندان اختراع قوانین و ابداع قواعد نمودہ کہ دانایان کار آگاہ چون بہ قدر فہم خود وامی رسند متفکر و متحیر می مانند کہ بی این ضوابط سلاطین ماضی چہ نوع جہانبانی و ملک رانی می کردہ باشند"[۲۲]

(اب پھر مہابھارت کے فارسی ترجمے کے بارے میں اکبر کے محرکات کی جانب واپس آتے ہیں۔ اکبر اپنی قوم (رعایا) کے تمام فرقوں کے درمیان دوست و دشمن میں امتیاز ختم کرنے کے لئے اصلاحات کئے جانے کی طرف مائل تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان گہرے اختلافات تھے اور اس مسئلے کو سمجھنے کے بعد کہ اس پیچیدہ جنگ و جدال کا کوئی انجام متصور نہیں ہے۔ اس نے دونوں مذاہب کے اہم متون کے ترجمے کرانے کا فیصلہ کیا تاکہ اس طرح دشمنیاں ختم ہوں اور ہر مذہب کا ماننے والا حقیقت کے حصول کی کوشش کرے۔ اس کام کے ذریعے وہ اپنی خامیوں کی شناخت اور اصلاح کر سکیں گے۔ مستزاد یہ کہ اکبر نے سمجھ لیا تھا کہ ہر مذہب میں ایسے لوگ کم ہیں جو خود کو کامل اور بے عیب جانتے ہوں۔ وہ لوگ بھی جو حتیٰ کہ اپنے مذہب کو صحیح طور سے نہیں پہچانتے اور کم سے کم ایسی کتابیں پیش کرنے سے بھی عاجز ہیں جو لوگوں کے سمجھنے میں معاون بن سکیں اور ایسی اعتقادی روح پردۂ ابہام میں باقی رہتی ہے۔ اکبر نے سمجھ لیا تھا کہ یہ طریقہ ضرور تاً عوام فریبی کی روک تھام کرے گا جو دین کے ٹھیکہ داروں کی مذموم چالوں کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔ اس نے نتیجہ نکالا کہ اگر مختلف مذاہب کے بنیادی متون آسان اور سادہ زبان میں ترجمہ ہوئے ہوتے تو وہ حقیقت پانے میں کامیاب ہو جاتے۔ یہ طریقہ ان لوگوں کی انحصار طلبی کا خاتمہ بن سکتا ہے جو اپنے مذہب کی حقیقی روح سے لیے مومن اور عزیز پیروکاروں کو واقف کرانے کی کوشش نہیں کرتے[۲۳]۔

ابوالفضل اپنے معاصرین کے محدود کائناتی مشاہدے (جہان بینی) اور بے خبری پر دوبارہ تنقید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ہندو علما نے اپنے مذاہب کے تعصب آمیز نظریات اختیار کر لئے ہیں جو جہل اور بالادستی کے عقیدے کا نتیجہ ہے حتیٰ کہ انھوں نے اس بدترین اعتقادی روش سے چشم پوشی نہیں کی ہے جو توہین، سرزنش اور اندھی تقلید ہے[۲۴]۔ اور عجیب و غریب چیزوں سے سادہ لوح لوگوں کے اذہان پر کر کے انھیں مذہب کی تحقیق سے منحرف کر دیا تھا لہٰذا دین محمدی کے پیروکار جو ہندوازم کے حقائق سے بے خبر تھے، ہندو مذہب کو مسترد کر دیتے تھے اس لئے کہ ہندوؤں اور جینیوں کے درمیان رائج مختلف مذاہب کے اصلی متون کی معتبر اطلاعات تک ان کی دسترس نہیں تھی اور طرہ یہ کہ

اپنے مذاہب کی امام جعفر صادق[25] (۸۰-۱۴۸ھ/ ۶۹۹-۷۶۵ء) اور ابن عربی[26] جیسی اہم شخصیتوں کی تالیفات کا مطالعہ نہیں تھا اور عقیدہ تھا کہ انسان تقریباً سات ہزار سال قبل موجود تھا اور انسان کی تمام ثقافتی میراثیں ان ہی ایام میں تشکیل ہوئی ہیں۔[27]

سب سے پہلے "مہابھارت" کا ترجمہ کرانے کی کئی وجوہات تھیں۔ اوّل یہ کہ یہ کتاب ہندوازم کا ایک بنیادی متن ہے اور "ہندستان کے برہمنوں کے عقیدے کے اکثر اصول و فروع اس میں موجود ہیں اور اس قوم میں اس کتاب سے زیادہ معتبر، مفصّل اور بڑی کوئی اور کتاب نہیں ہے۔"

دوسرے یہ کہ (اس میں) ماضی کی بیکراں دنیا کو اس کے تمام فعل و انفعالات اور رفتار و کردار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ خاص کر مطالعۂ تاریخ کے نقطۂ نظر سے:

" ایضاً خواطر جمہور انام علی الخصوص سلاطین عظام را با استماع تواریخ میل تمام است، چہ حکمت شاملۂ الٰہی علم تاریخ را کہ موجب عبرت اہل خبرت است، بر دلہا محبوب گردانید تا از گزشتہ ہا پندی گرفتہ زمان حال را غنیمت شمردہ، اوقات گرامی را در مرضیات الٰہی صرف نمایند و لھذا ملوک با استماع احوال گذشتگان از ہمہ محتاج تر باشند۔"[28]

ابوالفضل مزید لکھتا ہے:

" بناءً علیٰ ہذا جمعی از دانشوران زباندان کہ بہ وفور دانائی و کثرت تدوین اتّصاف داشتہ و از تعصب و عناد دور و بہ انصاف و اعتدال نزدیک بودہ اند، جمع شدہ کتاب مذکور را از روی تامّل و تعمق بہ عبارات واضح و کلمات مانوس ترجمہ کردند و طوایف انام بمیل، تمام نسخہ ہا گرفتہ باطراف و اکناف عالم بردند۔"[29]

مہابھارت کے قلمی نسخے کے آخری صفحے کے مطابق DEBI MISRA ، CHATURBHUJ MISRA ، MADHUSUDAN (MISRA) ، SATUWANI اور SAHIKH BHWAN جیسے لوگوں نے اس کے ترجمے میں علمائے اسلام کا ساتھ دیا۔ ترجمے کے کام کی جسے ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کے اواخر میں نقیب خان نے شروع کیا تھا۔ چند راتوں تک خود اکبر نے نظارت کی تھی اور تیسری رات میں مولانا عبدالقادر بدایونی کو نقیب خان کے ساتھ تعاون کرنے کا حکم دیا۔ بدایونی کہتے ہیں:

"... و چند شب بہ نفس نفیس معانی آن را بہ نقیب خان خاطر نشان ساختند تا ماحصل را بفارسی

املاری کردو شب سوم فقیر را طلب فرمودہ حکم کردند تا باتفاق نقیب خان ترجمہ کردہ باشم و در مدت سہ چار ماہ از ہژدہ فن آن مزخرفات لاطایل کہ ہژدہ ہزار عالم در آن متحیر است، دو فن نوشتہ شد۔"

اس کے بعد ملا شیری اور نقیب خان نے ترجمہ کا ایک حصہ اور دوسرا حصہ حاجی سلطان تھانیسری نے مکمل کیا اس سلسلے میں شیخ فیضی کو بھی ترجمے کو فارسی میں نظم کرنے کا حکم ملا لیکن وہ دو حصے سے زیادہ نہ کرسکے۔ حاجی سلطان نے مذکورہ دونوں حصوں کو پھر سے لکھا اور پہلے ترجمے کی غلطیوں کی اصلاح کی۔ بہرحال کتاب سو اجزاء میں پوری ہوئی (ایک جز آٹھ اوراق پر مشتمل ہے) اور بقول بدایونی "اصلی متن کا کوئی نکتہ فروگذاشت یا قلم زد نہیں ہوا۔"[۳۰]

یقیناً ایسا معلوم دیتا ہے کہ "حصہ اول" کے دو "پروان" کو جنھیں فیضی نے منظوم کیا تھا، ۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء میں دوبارہ لکھا گیا۔[۳۱] اور بقیہ ترجمہ نقیب خان، بدایونی، ملا شیری اور حاجی سلطان تھانیسری نے کیا۔ بدایونی کی یادداشتیں ہر ایک کے دقیق تعاون کی تشخیص میں غیر معمولی مشکل پیدا کرتی ہیں۔ بہرحال مجموعی طور پر اس کا ترجمہ ایک ہم آہنگی سے کیا گیا اور ایسا لگتا ہے کہ آخرکار نقیب خان نے از سر نو لکھا اور ترجمہ کا کام پورا کیا ہو۔ اور اسے ایک مجموعہ کی صورت دی۔ اس ترجمہ کا نام "رزم نامہ" رکھا گیا۔ بدایونی کہتے ہیں کہ :

"شیخ ابوالفضل علی رغم آنچہ کہ در تفسیر آیۃ الکرسی[۳۲] آوردہ بود خطبہ ای نیز بہ مقدار دو جزو بر آن نوشت۔"[۳۳]

"مہابھارت" کے اکثر قلمی نسخوں میں ابوالفضل کا مقدمہ ملتا ہے۔ یہ مقدمہ مطبوعہ نسخے میں بھی ہے جو نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ نول کشور پریس نے اس مقدمے کو ۳۶ صفحات اور دو حصوں میں شائع کیا ہے :۔

الف : وہ حصہ جس میں کتاب کے ترجمہ میں اکبر کے محرکات کا ذکر شامل ہے۔

ب : کتاب کے موضوعات کا تحلیل و تجزیہ۔

ابوالفضل نے کہیں بھی "آیۃ الکرسی" کی اپنی تفسیر کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ اس کو مسترد بھی نہیں کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح بدایونی نے بلاخطِ تاریخ کی تحریف کی کوشش کی ہے۔

اکبر مہابھارت کے ترجمے میں تحریف پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسے اکثر یوں ہی شک تھا کہ بدایونی ترجمے میں مداخلت کی کوشش کر رہے ہیں اور حتی کہ کبھی کبھی ادھر ادھر ہو جاتے تو وہ انھیں ٹوک دیتا اور انھیں حرام خوار اور شلغم خوار کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ خود بدایونی نے اکبر کی اس تنقید کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جو اس نے رجب ۱۰۰۳ھ (مطابق مارچ اپریل ۱۵۹۵ء) میں کی تھی۔ وہ کہتے ہیں :

"به شیخ ابوالفضل فرمودند (اکبر)، که ما فلانی را که عبارت از فقیر باشد جوانی فانی صوفی مشرب خیال می کردیم اما او خود چنان فقیه متعصب ظاهر شد که هیچ شمشیری رگ گردن تعصب او را نتواند برید، شیخ پرسید که صاحب در کدام کتاب نوشته که حضرت این چنین می فرمایند، فرمودند که در همین رزم نامه که عبارت از مهابهارت باشد و دوش برین معنا نقیب خان را گواه گرفته ام، شیخ به عرض رسانید که تقصیر کرده است، بالضرورت پیش رفته معروض داشتم که بنده مترجمی بیش نیستم، هرچه دانایان هندی تعبیر کرده اند بی تفاوت ترجمه نموده ام و اگر از خود نوشته باشم تقصیر من خواهد بود و بد کرده باشم شیخ همین مدعا عرض کرد تا خاموش ماند و باعث برین اعتراض آن بود که نقل حکایتی در رزم نامه کرده بودم به این مضمون که استادی از اهل هند در وقت نزع به نصیحت با حاضران می گفت که آدمی را لازم است که قدم از حد جهل و غفلت بیرون نهاده، اول از همه صانع بی چون را بشناسد و راه دانش بپیماید و تنها بر علم بی عمل اکتفا نماید که نتیجه نمی دهد و طریقهٔ حسنه را اختیار نموده، از سیئات حسب الامکان دست کشیده دارد و به یقین داند که هر فعلی را بازپرسی خواهد بود و در آن جا این مصرع نوشته بودم:

مصرع "هر عمل اجری و هر کرده جزایی دارد"

این معنا را حمل بر سؤال منکر و نکیر[۳۴] و حشر و نشر و حساب و میزان و غیر آن نموده مخالف قرار داد خویش که بر غیر تناسخ به هیچ چیز قایل نیستند نموده مرا متهم به فقاهت و تعصب داشتند:

تا کی ملامت مژهٔ اشکبار من　　　یک بار هم نصیحت چشم سیاه خویش

آخر خاطرنشان مقربان نمودم که همهٔ اهل هند قایل به جزا و سزای حسنات و سیئات اند و اعتقاد ایشان این است که چون شخصی می میرد محرری که نامهٔ اعمال بندگان را از مدت عمر می نویسد پیش فرشته که قابض ارواح است و پادشاه عدل نام داردی برد او بعد از ملاحظهٔ نیکی و بدی و غلبهٔ یکی بر دیگری حکم می کند که این شخص مخیر است، از او می پرسند که اول ترا به عوض نیکیها در بهشت بریم تا آن جا استیفای لذت بر قدر حسنات خویش بکنی. بعد از آن، در دوزخ فرستیم تا تلافی آن گناهان شود یا برعکس، و چون آن مدت را به سر می برد آن گاه حکم می کند که باز در دنیا رفته و به قالبی مناسب افعال خویش در آمده چند دوره می گردد و هم چنین الی ما نهایه تا زمانی که نجات مطلق یابد و از آمدن و رفتن در دنیا خلاص گردد." [۳۵]

ابوالفضل کا مقدمہ :۔

"رزم نامہ" پر ابوالفضل کا مقدمہ جو ۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء میں لکھا گیا ہے، اہم اور قابل قدر ہے۔ یہ مقدمہ خدا اور رسول کی تعریف وستایش کے بجائے "شرح گنیش نامہ" سے شروع ہوتا ہے، لیکن اکبر کا نام فراموش نہیں کرتا۔ وہ ترجمے کو قارئین خاص کر مسلمانوں کے لئے بڑے استادانہ اور محققانہ طریقے سے متعارف کراتا ہے۔ ہندیوں کے اقوال کو اس نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، علمائے ماورالطبیعہ، زہّاد اور وکلا :۔

"بر مخبران آثار و مستبران اخبار کہ ناقدان سخن و راصدان نو و کہن اند مخفی نماند کہ در ممالک ہند چہ از خانوادۂ حکمت و چہ از زمرۂ ریاضت و چہ از اصحاب فقاہت در کیفیت آفرینش عالم اختلاف بسیار منقول است۔"[۳۶]

ابوالفضل کو ہند و جہان بینی کے نظریات سے معلوم ہوا کہ تیرہ نظریے موجود ہیں اور ان میں سے کسی نے بھی اسے پوری طرح قانع نہیں کیا۔ اس کی نظر میں ان میں سے بعض میں عقلی تناقض نہیں پایا جاتا جبکہ ان پر کچھ غور و خوض کے بعد کچھ کو مسترد کیا جا سکتا ہے اور بقیہ پر توجہ دی جا سکتی ہے مثلاً مقدمہ لکھنے کے وقت تک بے شمار دیوتا یا برھما[۳۷] آئے اور گئے[۳۸] اور اسے معلوم ہوا کہ یہ نظریہ امام جعفر صادق کے قول سے قابل موازنہ ہے جنھوں نے فرمایا ہے کہ اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ انسان کی پیدائش سے قبل ہزاروں دیگر انسان پیدا ہوئے ہیں جیسا کہ ابن عربی کہتا ہے اس سے پہلے کہ انسانی نسل نابودی کی طرف گامزن ہو، دیگر انسان پیدا ہو گئے تھے۔"[۳۹]

مزید یہ کہ ابوالفضل اپنے قارئین کو داستانوں کے اندر موجود تضادات سے باخبر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اصرار کرتا ہے کہ ان کی توجہ داستانوں کی تصویری روح کی جانب مبذول ہو۔[۴۰] وہ کہتا ہے :

"اگر بگویم کہ این قصہ ھا بہ طولہا راست است، از دائرۂ امکان قدیم بیرون نہادہ باشم واگر بافسانہ حمزہ نسبت دہم، چہ دور گفتہ باشم۔"[۴۱]

"آئین اکبری" میں وہ اسی نقطۂ نظر کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ :

"اگر چہ این اثر شامل داستانہا و اساطیر متعدد و غلو آمیزی می باشد کہ بر تخیلات اساس یافتہ است اما این کتاب دیدگاھھای آموزشی اخلاقی بہ دست می دھد کہ سندی پر از تجربیات با ارزش می باشد۔"[۴۲]

اس کی نظر میں کتاب کا اہم ترین حصہ جس میں دو تہائی کام شامل ہے، اخلاقی، سیاسی اور فلسفیانہ تعلیم و تربیت پر

مشتمل ہے۔ بہر حال وہ قارئین سے کتاب کے اس اہم حصے پر توجہ دینے کی سفارش کرتا ہے نہ کہ داستان پردازیوں پر۔ بھیشم (حصہ) کے پروان میں بھیشم (BHISHMA) کی فلسفیانہ، سیاسی، روحانی اور معنوی تعلیم، ابوالفضل کے لئے بڑی دلچسپ تھی۔ البتہ اس نے محسوس کیا کہ مترجمین اس حصے میں یکساں انصاف کرنے پر قادر نہیں تھے اور اس کی خواہش تھی کہ عرب و یونان کے روشن فکر مفکرین کے نظریات کے تحت کام کا جائزہ لیا جائے لیکن اس بات کے ذکر کے لئے اس نے "دور و دراز" اور راکتا دینے والا مقدمہ لکھا ہے۔[۴۳]

یہ صحیح طور پر واضح نہیں ہے کہ "مہابھارت" کے اتنے متون میں جو مختلف جگہوں سے حاصل ہوئے ہیں، مترجمین نے کس متن سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح یوں معلوم دیتا ہے کہ انھوں نے آگرہ میں متداول متن سے استفادہ کیا ہوگا بہر حال جب پونہ کے بھنڈارکر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ماہرین نے "مہابھارت" کے قلمی نسخوں کی جمع آوری اور مقابلے کا کام شروع کیا تو انھیں سولہویں صدی سے انیسویں صدی تک کے ایسے نسخے ملے جن کی تاریخ تحریر کی تعداد سولہ (مختلف تاریخ) تھی۔

قدیم ترین نسخہ وہ نیپالی نسخہ تھا جو ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء سے متعلق تھا۔ ۱۵۱۹ء اور ۱۵۲۸ء میں دو دیگر نسخوں کی نسخہ برداری ہوئی تھی۔[۴۴] چوتھا نسخہ ۱۵۹۸ء سے متعلق تھا جو فارسی ترجمے کے بعد مرتب و مکمل ہوا تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "مہابھارت" کا فارسی ترجمہ متن کی شناخت کے اعتبار سے ایک بڑی مدد ہے اس لئے کہ اس متن کے بارے میں جس سے اس میں کام لیا گیا ہے۔ ایک نظریہ ہاتھ آتا ہے۔

رامائن :۔

۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء میں اکبر کے حکم پر عبدالقادر بدایونی کو رامائن کے ترجمے کی ذمے داری سونپی گئی اور وہ ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں اختتام پذیر ہوا۔ برہمنی تعبیرات کے سلسلے میں دیگر اشخاص سے مدد حاصل کرنے کے سوا ایسا لگتا ہے کہ خود بدایونی نے اس مہم کو سر کیا ہے۔ یہاں بھی عبدالقادر بدایونی محسوس کرتے ہیں کہ ایک عالمی مقابلے (مجاہدے) کی بہت پرانی داستانیں ان کے عقیدہ و احساس کے مدمقابل ہیں :

"وزعم این طایفہ (ہندوان) آن است کہ عالم قدیم است و ہیچ گاہ از نوع بشر خالی نیست واز واقعہ (دورۂ رامایانا) صد ہزاران ہزار سال گذشتہ و بہ وجود این آدم ابوالبشر کہ از خلقت او ہفت ہزار سال گذشتہ قائل نیستند و ظاہر این است کہ این واقعات یا راست نیست و افسانہ مجرّد است و خیال محض چون شاہنامہ و قصۂ امیر حمزہ یا در زمان تسلط بہائم و جنیان بودہ۔"[۴۵]

جبکہ ابوالفضل کی نظر میں رامائن کی فلسفیانہ تعلیم بہت زیادہ ثقافتی اہمیت کی حامل ہے۔ ترجمہ کا مسودہ، ستر جزو سے

زائد تھا، لیکن مکمل متن ایک سو بیس جزو پر مشتمل تھا۔ بدایونی کو حکم ملا کہ جیسا کہ "مصنفین کی رسم" ہے ایک مقدمہ لکھیں۔ اسی طرح جیسا کہ ابوالفضل نے "مہابھارت" کا مقدمہ لکھا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ یہ مقدمہ نعت حضرت محمدؐ کے بغیر لکھا جانا چاہیئے اور یہ ان کے لیے مشکل تھا جس سے انھوں نے صرف نظر کر لیا۔[۴۶]

"ہری وامسا پوران" مہابھارت کا تکملہ یا انیسواں پران کا ترجمہ فارسی گو شاعر فرزانہ ملّا شیریؔ[۴۷] نے کیا۔ بال میکی (وال میکی) کی سنسکرت کتاب "یوگ وشسٹ" کے ترجمہ کی نسبت معمولاً فیضی سے دیدی گئی ہے۔ لیکن ابوالفضل اسے اکبر کی زیر نگرانی ہونے والے تراجم کے ذیل میں نہیں سمجھتا ہے۔ اس کا مصوّر نسخہ جس کا سال ۱۶۰۲ء ہے کتب خانہ چسٹر بتی ڈبلن میں محفوظ ہے۔ اس کی تصویروں پر اکبر کے عہد کے مصوروں کے دستخط ہیں۔[۴۸] اگرچہ ہم یقین کے ساتھ ترجمے کو فیضی سے منسوب نہیں کر سکتے لیکن سنسکرت کتابوں کے مترجم کی حیثیت سے اس کی شہرت نے ناشناس دانشوروں کو سنسکرت کے قدیم متون کے ترجمے اور فروخت پر اکسایا ہے۔ ایسی تالیف و تصنیف' یوگ وشسٹ[۴۹]، بگ وتا پوران اور سنسکرت کے دیگر کام' فلسفہ' ویدانتا کی شرح کی اساس بن گئے' اور اس کا نام "شارق العارفات" رکھا گیا جسے فیضی سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ پوری طرح واضح ہے کہ شاہجہاں کے دور میں انجام پایا۔

سنسکرت کتابوں کے فارسی تراجم کرانے پر مبنی اکبر کا کامیاب منصوبہ قابل توجہ ہے کسی بھی مترجم کا سنسکرت کا مطالعہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ فیضی کو سنسکرت بہت سطحی آتی تھی۔ اس طرح سنسکرت کے علماء فارسی زبان کے علمائے کے لیے اصلی متن کی وضاحت کرتے اور وہ انھیں ادبی زبان میں لکھتے تھے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ سنسکرت کے کچھ دانشور جو اصلی متن کے مشکلات کی تفصیلات فارسی میں بیان کر سکتے تھے۔ مترجمین کی انجمن میں شامل تھے۔ مزید یہ کہ فارسی کی صوفیانہ اصطلاحات نے اپنے تراجم کو بامفہوم بنانے میں بہت حد تک مترجمین کی مدد کی ہے۔ فیضی، ابوالفضل' نقیب خان اور فتح اللہ شیرازی کے سوا، کوئی مسلمان مترجم اصلی متون کی جمع آوری میں شریک و سہیم نہیں تھا بلاشک بدایونی ایک بہترین مترجم تھے مگر انھوں نے اس کام سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اس لئے انھوں نے دیکھا تھا کہ سنسکرت کے قدیم متون کے ترجمہ کا کام، واضح طور پر اسلام کے سلسلے میں خیانت کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا جب بھی انھیں کسی کام کی تجویز پیش کی جاتی وہ بڑی تلخی سے جو ان کی پریشانی کی مظہر تھی، مسترد کر دیتے تھے۔ اور ہر وقت خداوند عالم سے اس کی مغفرت طلب کرتے تھے کہ خود کو پست ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے ترجمے میں شریک کیا ہے۔ وہ "مہابھارت" کے ترجمے کے بارے میں اپنے مجموعی خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

"ہمہ آن دانشورانی کہ شارحین و مترجمین این اثر بودند بہ خاطر اعمالشان در پی مرگ بازخواست می شوند، مانند یاری دہندگان "کروھا" و "پندوھا"۔"

"لیکن جو ابھی زندہ ہیں خدا انھیں نجات دے، انھیں بخش دے اور ان کی توبہ قبول کرلے۔ جو خدا پر یقین رکھتے تھے اور بعد میں مشرک ہو گئے اگرچہ انھیں شرک پر مجبور کیا گیا تھا اور ان کے دل ایمان پر برقرار تھے۔ درحقیقت وہ قصور وار نہیں اور بلاشک پروردگار بخشندہ و مہربان ہے۔"[۵۰]

رامائن کے ترجمے کی تکمیل کے بارے میں اظہار خیال کرنے کے بعد پھر یوں گویا ہوتے ہیں:

"وازآن نامۂ سیاہ (رامائن)، کہ چون نامۂ عمر من تباہ است پناہ بہ خدا می برم، نقل کفر کفر نیست و کلمۂ رد کفر می خوانم چہ می ترسم کہ مبادا این نسخہ کہ ہمہ بہ کرہ و حسب الامر نوشتہ شدہ نفرین بار آرد۔"[۵۱]

ایک بار ایک شخص نے حاجی سلطان تھانیسری سے "مہابھارت" کے ترجمہ کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ جو چیز دس ہزار سال پہلے شناخت کی گئی اور اس وقت قابل فہم تھی، میں نے موجودہ زبان میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔[۵۲] لاشیری نے محسوس کیا کہ مہابھارت کی دور از کار اور خوارق العادات داستانیں خوف و دحشت میں مبتلا شخص کی خیال بافیوں سے مشابہ ہیں۔[۵۳] بالفاظ دیگر، درواقع فیضی اور ابوالفضل اس پروگرام کے اصلی حامیوں میں ہیں۔ چنانچہ فیضی نے مہابھارت کے دو پروان کا آزاد منظوم ترجمہ کیا اور پھر اسے منثور پیرایہ عطا کیا۔ اس نے اسی طرح چار ہزار اشعار کی ایک رزمیہ مثنوی "نل دمن" کہی۔ اس میں نیشارا یا مالوا کے بادشاہ نالا اور بادشاہ ویدابا کی بیٹی دمیانتی کی عشقیہ داستان پیش کی گئی ہے۔

درحقیقت "نل دمن" کی تصنیف "خمسۂ نظامی گنجوی" (۵۳۵-۶۰۵ھ/۱۱۴۱-۱۲۰۹ء) کی تقلید میں ایک خمسہ لکھنے کے پروگرام کا حصہ تھی۔ اس نے ایک ساتھ پانچ مثنویاں لکھنا شروع کیا اور ہر ایک کے کچھ حصے مکمل کرلیے۔ "نل دمن" چار ماہ میں پوری ہوئی اور اوّل دی ماہ سال ۳۹ الٰہی مطابق ۱۱ دسمبر ۱۵۹۴ء کو اکبر کی خدمت میں پیش کر دیا۔[۵۴] بلاشک یہ مثنویاں جو کچھ تین سو سال قبل امیر خسرو دہلوی نے کہا تھا اس سے مشابہ ہے۔ یہ ایک ایسی تخلیق ہے کہ ہندستان کے کم ہی شاعر اس کی تصنیف میں کامیاب ہوئے ہیں۔[۵۵] یہ کام غیر ترجمہ شدہ کاموں کا حصہ ہے لیکن داستان کے پیش نظر اس کی تکمیل "مہابھارت" کے ترجمے کے بغیر ناممکن تھی۔ فیضی کی نل دمن کا ایک اہم نکتہ حضرت پیغمبر اکرم کی نعت اور حد درجہ ستایش اور روایتی طور پر واقعۂ معراج کی بحث ہے۔ بدایونی کہتے ہیں کہ:

"ونزدیک بہ موت، بہ مبالغہ والحاح بعضی از آشنایان بیتی چند در نعت ومعراج حضرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نوشتہ درج کرد (در خاتمہ کتاب نلدمن)۔"[56]

فیضی کا رسول اکرمؐ کی ستایش کرنا بعد میں اضافہ شدہ کاموں کا جز نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان مطالب کے لکھنے کی کوشش اس کے ابتدا اور خاتمے کی حیثیت رکھتی ہے اور بہر حال یہ تصنیف ہندو اور مسلمان علماء کے ذریعے ہندو موضوعات ومطالب پر بعد کے شعری آثار کی تدوین کے لیے ایک نمونہ تھی۔

اکبر کے دور حکومت میں سنسکرت کے جتنے ترجمے ہوئے درباری مصوروں نے ان کے نقش ونگار بنائے اور راجپوت اور مغل سرداروں نے بھی اپنے ذاتی کتب خانوں کے لیے مصور نسخے تیار کرائے تھے۔ مہابھارت کا ایک نسخہ جو شاہی کتب خانے کے لیے تیار کیا گیا تھا، اس وقت مہاراجہ جے پور کے پاس ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اس نسخے کی تصویریں ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۸ء کے برسوں کے دوران تیار کی گئی ہیں۔[57] چنانچہ راماین کا ایک مصور نسخہ جو اکبر کے اصل نسخے کی اساس پر ۱۰۰۷ھ/ ۹۹-۱۵۹۸ء میں عبدالرحیم خانخانان کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اب بھی واشنگٹن کی فریر گیلری میں محفوظ ہے۔[58] بلاشک تصویریں موضوعات کو جذب کرنے میں کامیاب ہیں۔

اکبر کے دور کے سنسکرت تراجم نے سترہویں اور اٹھارہویں صدی (گیارہویں اور بارہویں ہجری) میں بعد کے فارسی زبان کے دانشوروں کی حوصلہ افزائی اور تقویت کے لیے ثقافتی میدان فراہم کیا۔ جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے دور میں سنسکرت کی کئی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ ان کاموں کے علاوہ ہے جو دارا شکوہ نے فارسی میں کئے ہیں۔ عبدالرحمٰن چشتی (متوفی: ۱۶۳۲ء/ ۱۰۴۲ھ) نے ہندی فلسفے میں خلقت اور عالم وجود کی تخلیق کو اپنی کتاب "مرأۃ المخلوقات"[59] میں بیان کیا اور "مرأۃ الحقائق"[60] میں بھگوت گیتا سے اسلامی تفسیر کی۔ مثنوی "رام اور سیتا" بھی بعض آزاد تراجم کی جمع بندی سے تیار کی گئی تھی اور GIDHAR KAYATH اور شیخ سعد اللہ مسیحا[61] کے اہم مطالب در واقع عہد جہانگیری کی رونق اور جلوہ افروزی کا باعث تھے۔ سترہویں صدی کے وسط دوم میں تلسی داس نے ترجموں کی طرف خصوصی توجہ کی اور خود بھی راماین کا ایک تازہ ترجمہ کیا۔

کچھ کام ہندو علوم و فلسفے اور فائن آرٹس کے موضوع پر بھی کئے گئے جن میں سب سے اہم "تحفۃ الہند" ہے جسے اورنگ زیب کے دور میں میرزا محمد بن فخرالدین محمد نے مدون کیا۔ یہ کتاب بادشاہ کے بیٹے شہزادہ محمد معزالدین کیلئے KUKUL TASH KHAN کی خواہش پر لکھی گئی۔ شہزادہ محمد معزالدین نے جہاندار شاہ کے نام سے گیارہ مہینوں تک حکمرانی کی۔[62]

فارسی نسخوں کے ابتدا اور انتہا میں موجود یادداشتیں نشاندہی کرتی ہیں کہ ہندو اور مسلمان ـــــ دونوں ہی نسخہ برداری، مصوری اور نسخوں کی خریداری میں شریک تھے۔ ہندوؤں نے خاص کر ان ہندوؤں نے جو دفاتر میں امور کی دیکھ بھال کر رہے تھے، مثلاً کایستھوں اور برہمنوں نے اس کام کے سلسلے میں اپنی حد درجہ دلچسپی دکھائی ہے۔ ان ترجموں نے انھیں اپنے مذہب کی روح کو سمجھنے میں مدد کی۔ مسلمانوں کے مہذب طبقہ میں جن کو علما کے پاس ہندوؤں کی مذہبی کتابیں موجود تھیں بہت بعد میں یعنی بیسویں صدی کے اوائل میں اصوبۂ اتر پردیش کے کائستھ گھرانوں سے ہمیشہ ہی ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے ایک دو فارسی ترجمہ مل جاتے تھے۔

راج ترنگنی:۔ (RAJATARANGINI)

اکبر صرف مذہبی کتابوں کی طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ تاریخی کاموں پر بھی اس کی گہری نظر تھی۔ راج ترنگنی، کشمیر کی تاریخ ہے جسے کلہن نے ۱۱۴۸ اور ۱۱۴۹ھ کے برسوں میں تالیف کیا۔ اس کتاب کے موضوعات نے اکبر کو کشمیر کی قدیم تاریخ و ثقافت کی طرف مائل کیا۔ کشمیر ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء میں شاہی حکومت کا جز بن گیا تھا۔ شاہ محمد شاہ آبادی کو جو ایک عرصے تک پنجاب کے صدر رہ چکے تھے، اس کتاب کے فارسی ترجمہ کرنے کیلئے منتخب کیا گیا۔[۶۲] جیسا کہ ابوالفضل کہتا ہے کہ کشمیری زبان سے ترجمہ ہوا ہے۔[۶۳] اور یوں معلوم دیتا ہے کہ سنسکرت سے کشمیری میں اس کا ترجمہ بظاہر سلطان زین العابدین کے عہد میں ہوا ہے۔ اس کے بعد بدایونی کو اسے ادبی زبان میں لکھنے کا حکم دیا گیا اور انھوں نے اسے ۹۹۹ھ/۹۱-۱۵۹۰ء میں دو ماہ میں مکمل کیا۔[۶۴] (تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیں مقدمہ راج ترنگنی از محمد صابر آفاقی شائع کردہ پاکستان)

کتھاسرت ساگر:۔ (KATHASARIT SAGAR)..

بدایونی نے ۱۰۰۳ھ/۹۵-۱۵۹۴ء میں سنسکرت داستانوں کے ایک مجموعے کا فارسی میں ترجمہ کیا یہ وہ حصہ تھا جو تقریباً سلطان زین العابدین کے عہد میں "بحر الاسمار" کے نام سے فارسی میں ترجمہ ہو چکا تھا، اس کے آخری حصے کے فارسی ترجمے کا کام، جو رہ گیا تھا، سب سے پہلے بدایونی کو سونپا گیا۔ انھوں نے اسے پانچ مہینے میں مکمل کیا۔ ایک رات جب بدایونی ترجمے میں مشغول تھے، اکبر نے انھیں اپنی آرام گاہ میں طلب کیا اور صبح تک ان سے کتاب کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔ آخر میں پہلی جلد کو قدیم فارسی سے موجودہ فارسی میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ بدایونی کو امید تھی کہ دو تین مہینے میں وہ اس کام کو کر ڈالیں گے، لیکن "منتخب التواریخ" میں انھوں نے اس کام کی تکمیل کے سلسلے میں کوئی واضح بات نہیں لکھی ہے۔ اصلی متن کا عنوان بھی انھوں نے نہیں رکھا ہے۔[۶۵]

"منتخب التواریخ" جلد دوم کا مترجم لاؤ (LOWE) کہتا ہے کہ یہ کتاب راج ترنگنی ہے۔[۶۶] لیکن

اس کا ترجمہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا اور اس کے دوبارہ ترجمے کی بات کچھ عجیب سی ہے۔ بہر حال احتمال ہے کہ وہ کتاب "کتھا سرت ساگر" ہی ہو۔

کلیلہ و دمنہ :۔

سنسکرت کی یہ کتاب ہندستانی شہزادوں کے لیے ایک آئینہ (یا نصب العین) کے طور پر لکھی گئی تھی جو مملکت کے امور میں ان کی رہنمائی کرے۔ یہ کتاب فسانوی طرز میں حیوانات کے بارے میں ہے جس کا عہد اکبر سے برسوں قبل عربی زبان میں کئی بار ترجمہ ہو چکا ہے۔ فارسی میں اس کا پہلا مکمل ترجمہ (البتہ عربی سے) نظام الدین المعالی نصر اللہ بن محمد نے ۵۴۰-۵۳۸ھ میں کیا تھا اور حسین واعظ کاشفی نے اسے دوبارہ لکھا لیکن سادگی کی جگہ انھوں نے طوالت اور لفاظی سے کام لیا۔ اکبر نے بھی ابو الفضل کو سادہ فارسی زبان میں اسے دوبارہ لکھنے کا حکم دیا اور ابو الفضل نے اسے سولہ فصلوں اور ایک خاتمہ کے ساتھ ۱۵ شعبان ۹۹۶ھ مطابق ۱۰ جولائی ۱۵۸۸ء کو "عیار دانش" کے نام سے مکمل کیا۔[۶۷] "اکبر نامہ" کے سیاسی مکتوبات کے پیچیدہ اور طویل جملوں کے باوجود اس کتاب میں اس کے مختصر جملے اور سادہ نثر نویسی قابل تعریف ہے۔

نجوم و ریاضیات :۔

تاریخی اور مذہبی موضوعات کے علاوہ اکبر کو ریاضیات اور نجوم سے بھی دلچسپی تھی۔ امیر فتح اللہ شیرازی اور شیخ ابو الفضل نے نجوم سے متعلق تین کتابوں کا ترجمہ کیا۔ کشن جوشی (KISHN JOSHI)، گنگا دھر (GANGA DHAR)، اور مہیش مہانند (MAHESH MAHAMAND) جن کا ذکر "آئین اکبری" میں آیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ یہ نجوم کی کتابوں کے مصنفین ہیں۔[۶۸] باسکرا چاریہ (BASKARACHARYA) کی تخلیق "لیلاوتی" کا ترجمہ فیضی نے کیا جس کا موضوع حساب و ہندسہ ہے۔ فیضی نے اس کا ترجمہ ۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء میں مکمل کیا۔[۶۹]

عربی تالیفات :۔

اگرچہ سنسکرت کے کاموں نے کافی حد تک اکبر کی توجہ اپنی جانب مبذول کر رکھی تھی لیکن اکبر نے عربی تالیفات کو فراموش نہیں کیا۔ حکیم ہمام نے کتاب "معجم البلدان" کا ذکر اکبر سے کیا۔ یہ ایک قسم کا انسائیکلوپیڈیا ہے اور اس کا موضوع جغرافیا اور اس میں دنیا کے عجائبات سے متعلق کہانیاں ہیں۔ اکبر نے جس کی توجہ اس کتاب کی طرف مبذول ہو چکی تھی، تقریباً بارہ افراد کو اس کے ترجمے پر مامور کیا۔ ان میں ملا احمد ٹھٹھ، قاسم بیگ، شیخ منوّر اور مولانا عبد القادر بدایونی کا نام قابل ذکر ہے۔[۷۰]

ربیع الاول ۱۰۰۱ھ مطابق دسمبر ۱۵۹۲ء میں بدایونی نے شیخ ابوالفضل کے مشورے پر ترجمۂ جامع رشیدی" کا ایک خلاصہ تیار کیا۔ یہ کتاب کافی ضخیم ہے اور اس میں پیغمبر، بنی امیہ اور خلفائے عباسی کا ذکر ہے۔[۴۱] غرضیکہ تالیفات میں جن کتابوں کو ترجمے کے لئے منتخب کیا گیا تھا صرف وہ کتابیں اکبر کی دلچسپی کا مرکز بنی تھیں جو تاریخ اور علوم کے بارے میں تھیں۔

ترکی :-

" بابرنامہ" جو ترکی چغتائی میں تحریر کیا گیا تھا اور جس میں مرکزی ایشیا، کابل اور ہندستان کے بارے میں اہم معلومات موجود ہیں، دراصل بابر کی سوانح حیات ہے جس کا مؤلف وہ خود ہے۔ ضیاءالدین خوافی نے ۹۹۴ھ مطابق ۱۵۸۶ء میں اس کتاب کا فارسی ترجمہ کیا۔[۴۲] میرزا پاینده حسن غزنوی نے بہروز خان کے ایما پر اس کتاب کا ایک اور ترجمہ شروع کیا۔ یہ بہروز خان وہی ہیں جنھیں بعد میں اکبر نے " نورنگ خان " کا خطاب عطا کیا تھا وہ جوناگڑھ کی حکمرانی کے دوران ۱۰۰۲ھ مطابق ۱۵۹۳ء میں فوت ہوئے۔ لیکن میرزا پاینده نے چھ سال بلکہ ساتویں سال کے اوائل تک ترجمے کا کام مکمل نہیں کیا۔ اس کے بعد محمد قلی مغل حصاری نے اس کام کو سنبھالا اور ۹۳۵ھ مطابق ۱۵۲۸-۲۹ء تک کا ترجمہ کیا۔[۴۳] بہرحال اکبر نے آخر میں عبدالرحیم خانخانان کو اس کے ترجمے کا کام مکمل کرنے کا حکم دیا اور خانخانان نے ۹۹۸ھ/۱۵۸۹ء میں اس کام کو مکمل کیا۔ عبدالرحیم خانخانان نے ۲۴ نومبر ۱۵۸۹ء کو اس وقت یہ ترجمہ اس کی خدمت میں پیش کیا جب سلطان کابل سے واپس آرہا تھا۔[۴۴] اس طرح خانخاناں کو پہلے کے تمام مترجمین پر فوقیت حاصل ہو گئی۔

عیسائیت :-

اکبر کے دارالترجمہ میں عیسائیت سے متعلق کوئی کام نہیں کیا گیا تھا، جبکہ اکبر کو اس موضوع سے خاص دلچسپی تھی۔ " فادر جرُم خاویر " نے جو پانچ مئی ۱۵۹۵ء میں لاہور کے تیسرے عیسائی مبلغ کی حیثیت سے دربار میں پہنچے اور آخر وقت تک اکبر کے ساتھ رہے، تقریباً سات سال تک فارسی زبان سیکھی اور احتمالاً مسیحیت سے متعلق کتابوں کے فارسی ترجمے کئے۔ انھوں نے پرتگالی زبان میں انجیلوں کی اساس پر ایک کتاب لکھی، پھر اکبر کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے مولانا عبدالستار بن قاسم لاہوری کے تعاون سے اس کا ترجمہ کیا اور اس کا نام " مرآت القدس " یا " داستان مسیح " رکھا۔ یہ کام ۱۶۰۲ء میں مکمل ہوا۔[۴۵] اس کام نے حواریوں کی زندگی کے بارے میں اکبر کی دلچسپی بڑھادی اور اس نے فادر خاویر کو ان کی سوانح لکھنے کا کام سونپا۔ فادر خاویر نے پہلے تو پرتگالی زبان میں لکھا، پھر مولانا عبدالستار کے تعاون سے فارسی میں منتقل کیا، جس کا نام " داستان احوال حواریوں " رکھا گیا۔[۴۶] اس میں پطرس، شائول (پولس)، آندرو، یعقوب، یوحنا، تھامس، فلپ، بارتولمی، متی، شمعون، یہودا اور برنابا کے

حالات ہیں۔ اول الذکر چار افراد کے حالات اکبر کی وفات سے پہلے ہی لکھ کر اس کی خدمت میں پیش کئے جا چکے تھے۔ اور بقیہ ۱۰۱۶ھ مطابق ۱۶۰۷ء میں لاہور میں اور اس کے بعد ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء میں آگرے میں جہانگیر کی خدمت میں پیش کئے گئے۔

مناظرے کی ایک بڑی کتاب "آئینۂ حق نما" ہے جسے فادر خاویر نے ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں (عہد اکبر میں) شروع کیا اور جہانگیر کے عہد میں مکمل کیا اور اس کی خدمت میں پیش کیا۔ ملا لگان کے بقول "یہ رسالہ اس گفتگو کا ماحصل ہے جو ایک پادری اور ایک آزاد منش مفکر یا فلسفی کے درمیان بقول مؤلف، دربار میں ہوئی تھی"۔ کتاب کی نسبتاً زیادہ ضخامت نے فادر خاویر کو "منتخب آئینۂ حق نما" کے نام سے اس کا خلاصہ کرنے پر مجبور کیا۔[۷۹] ایسا لگتا ہے کہ اس کا ماخذ کتاب "دبستان المذاہب" ہے۔ اس لئے کہ اس میں مؤلف نے مختلف فرقوں کے پیرو کاروں کی زبانی ایک بحث پیش کی ہے اُسی طرح جیسا کہ اکبر کے دربار میں ان مسائل پر بحث کی روایت تھی۔[۸۰]

ثمرۃ الفلاسفہ :-

ادیان و مذاہب، فلسفہ اور تاریخ سے اکبر کی گہری دلچسپی نے اسے سرزمین مغرب کے فلسفے کی جانب متوجہ کیا۔ وہ بادشاہ پرتگال کے نام ایک خط میں دانشوروں کے اُس وفد کو بھیجنے کی درخواست کرتا ہے جو دربار پرتگال میں مذہب اور تاریخی موضوعات پر ہونے والی بحثوں میں غیر جانبداری سے شرکت کرتے تھے۔ اس نے ان پادریوں کی بتدریج حوصلہ افزائی کی جن کے بارے میں توقع کی جاتی تھی کہ مورد تہمت و افترا قرار پائیں گے اور عبدالستار نے پرتگالی زبان سیکھ کر اس زبان سے اس کے لئے کتابوں کے ترجمے کئے۔ بعد میں اس محرک کے نتیجے میں پرتگالی زبان سے ترجمے کا کام شروع ہوا جن میں یونان، روم، اور یونانی فلسفیوں کی زندگی کے بارے میں معلومات جمع کی گئی ہیں اور اسے "ثمرۃ الفاسفہ"[۸۱] کا نام دیا گیا ہے۔

بہرحال اکبر کی زیر نگرانی ہونے والے تراجم نے ہندستان میں فارسی زبان میں ایک نئی روح پھونکی۔ یہ وہ زبان ہے جس نے تقریباً اپنے لئے ایک خصوصیت حاصل کر لی تھی اور اکثر تعلیم یافتہ لوگ اس کی اثر پذیری کا احساس کرتے تھے۔ چنانچہ اس زبان کے فلسفیانہ اور رواداری مفاہیم نے مقامی زبانوں پر برتری حاصل کر لی۔ اور انہیں غنی بنایا۔ مختصر یہ کہ اگر یہ لوگ (علماء و ادبا و مترجمین) نہ ہوتے تو ہندستان کی مغلیہ ثقافت بہت ناچیز ہوتی۔

••

حواشی

۱۔ "روضۃ اولی الالباب فی تواریخ الاکابر والانساب"۔ جو تاریخ بناکتی سے مشہور ہے۔ آدم سے لیکر سلطان ابو سعید تک کی ایک عام تاریخ ہے اور اس کے ساتویں حصے میں سلطان علاء الدین خلجی کے قلم سے ہندوؤں کے بارے میں تفصیلات رقم کی گئی ہیں۔

۲۔ شہاب الدین عبداللہ معروف بہ حافظ ابرو کا مجموعہ حافظ ابرو کے ترجمہ تاریخ طبری، رشید الدین کی "جامع التواریخ" اور نظامی شامی کے "ظفر نامہ" پر مشتمل ہے۔

۳۔ ماخذ فوق

۴۔ "جوامع الکلام" (مخطوطہ برٹش میوزیم)

۵۔ خواجہ نظام الدین احمد: "طبقات اکبری" (کلکتہ ۱۹۱۳ء) جلد اول ص ۲۳۳، ۲۳۴۔

۶۔ I.O.London. Ms.1262

۷۔ SACHAU, Alberuni's India, Preface P.20

۸۔ ابوالفضل علامی: آئین اکبری جلد اوّل ص ۶،

۹۔ شاہ طہماسپ صفوی (۹۸۴-۹۳۰ھ/۱۵۷۶-۱۵۲۴ء) کے دربار کا معروف مصور۔ ایران میں اپنی اقامت کے دوران ہمایوں نے میر مصور کو اپنے ساتھ کرنے کی کوشش کی۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ وہ کابل میں ہمایوں سے ملا ہو۔ اس کا بیٹا میر سید علی اکبر کے دربار کا اہم مصور تھا اور خود کو ایک ماہر مصور کی حیثیت سے پیش کیا۔

۱۰۔ عبدالصمد کو بھی ہمایوں نے دعوت دی تھی اور وہ کابل میں اس سے جا ملا۔ اس کو مصوری کے لیے اکبر کا مربی بنایا گیا۔ ایک مصوری کا نمونہ جس میں اکبر ہمایوں کو اپنی مصوری دکھلا رہا ہے، تہران کے "کاخ گلستان" میں محفوظ ہے۔ جس کے بارے میں احتمال ہے کہ ہمایوں کی موت سے (۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء) کچھ ہی عرصہ قبل بنایا گیا ہو۔

Barret, Douglas and Basil Grey: Indian Painting, p.78

۱۱۔ محمد عارف قندھاری: "تاریخ اکبری"، رامپور (ہندستان) ۱۹۶۲ء، ص ۴۶-۴۵

۱۲۔ عبدالقادر بدایونی: "منتخب التواریخ" (کلکتہ ۱۸۶۵ء) جلد دوم، ص ۲۲۰۔ اصل متن یوں ہے: "و کفرہ ہند خواندن و نوشتن آن را (جہا بجارت) عبادت عظیم می دانند و از مسلمانان پنہان می دارند و باعث آن این بود کہ شاہنامہ و قصۂ امیر حمزہ را بہ ہفدہ جلد در مدت پانزدہ سال نویسانیدند و زر بسیار در تصویر آن خرچ شد، ہمچنین قصہ ابو مسلم و جامع الحکایات و غیر آن را مکرر شنیدند۔۔۔"

۱۳۔ بدایونی: "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۲۵۷۔

۱۴۔ وہی ماخذ: ص ۴۰۰ "۔۔۔ و در این ایام ترجمۂ کتاب حیوۃ الحیوان را کہ نقیب خان اکثر اوقات در ملازمت می خواندند و معانی آن خاطر نشان می ساخت بہ شیخ ابوالفضل فرمودند و شیخ مبارک آن را مترجم بہ فارسی ساخت۔"

۱۵۔ بدایونی: "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۲۱۲ "۔۔۔ و فرمودند تا "بیدا تھربن" (اتروا) را کہ کتاب چہارم است

از چهار کتب مشهور اہل ہند کہ بعضی احکام آن موافق ملت اسلام است، تغییر کنند و فقرآن را از زبان ہندی بفارسی ترجمہ سازند"

۱۶ـ Maclagan, E : The Jesuits and the Great Mogul, London, 1932, p.213

۱۷ـ ابوالفضل علامی : مکاتبات علامی (دہلی ۱۸۴۶ء) ص ۳۷-۳۸۔

۱۸ـ بدایونی : "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۲۶۰۔ "... وشیخ ابوالفضل بہ ترجمۂ آن مأمور گشت بہ جای "بسم اللہ" این فقرہ بود کہ "ای نام دی ژژو کریستو" یعنی ای آن کہ نام تو مہربان و بسیار بخش است و شیخ فیضی مصرع دوم راچنین گفت "سبحانک لاسواک یاہو"

۱۹ـ بدایونی : "منتخب التواریخ" جلد دوم ص ۳۴۴ - مکتب خانہ کے موضوع پر جدید محققین نے توجہ نہیں دی ہے۔ "... وخان خانان را در وقت رسیدن بہ مکتب خانہ کہ در دیوان خانۂ فتح پور برای ترجمہ گری معین بود یک باری دیدہ واو بزودی بہ جانب گجرات مرخص شد۔ م

۲۰ـ بدایونی : "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۳۲۰۔

۲۱ـ میرغیاث الدین علی قزوینی مشہور بہ نقیب خان (مترجم) : مہابھارت بہ تصحیح جلالی نائینی و ڈاکٹر شکلا (تہران : انتشارات طہوری ۱۳۵۸ھ)، مقدمۂ ابوالفضل علامی، ص ۴

۲۲ـ وہی مآخذ

۲۳ـ "مہابھارت" مقدمۂ ابوالفضل ص ۱۹۔ "ایضاً متعصبان بی دین و پیشوایان اہل تقلید ہند را بر دین خود عقیدۂ بالاتر از اندازہ است و مزخرفات معتقدات خود را چہ از روی بی تمیزی و چہ از سر بی انصافی منزہ از نقص دانستہ راہ تقلید بہ سر می برند و بر سادہ لوحان مقدم بر چند خاطر نشان کردہ از تحقیق مطالب باز داشتہ، در اعتقادات باطلہ راسخ می سازند و منشبان دین احمدی را کہ بر شرایف مطالب و نفایس علوم آنہا اطلاعی نیست، این طایفہ را صاحب ترہات محض داشتہ بہ مجرد قیاس انکار این طایفہ می نمایند. بناءً علی ہذا، عقل خردہ دان خواہست کہ کتاب مہابھارت کہ بر غث و سمین اکثر مطالب این طایفہ اشتمال دارد، بہ عبارت روشن ترجمہ کردہ آید تا منکران عنان انکار خود گرفتہ از بی اعتدالی باز آیند و معتقدان سادہ لوح از اعتقادات خود بہ قدر شرمگین شدہ طالب حق شوند. ایضاً، عوام الناس مسلمانان کہ اوراق کتب سماوی و دینی را نیک مطالعہ نکردہ و دیدۂ عبرت بین خود را بر تواریخ مختلفہ روزگار از خطائیان و ہندیان و غیر ذلک نگشودہ اند..." (م)

۲۴ـ بقول بدایونی : "ہندوہا مطالب مدوّن مذہبی خود را از مسلمانان پنہان می داشتند" "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۳۲۰۔

۲۵ـ جعفر بن محمد معروف بہ صادق، متولد ۸۰ یا ۸۳ ہجری ششمین امام شیعیان۔

۲۶ـ کیہان شناسی اور فلسفۂ انتظام گیتی کے نظریات کے لیے "رسائل اخوان الصفا" بیرونی، ابن سینا اور ابن عربی کی تالیفات سے رجوع کریں، اور ڈاکٹر سید حسین نصر کے مقدمہ بر نگاہی بہ کیہان شناسی اسلامی کو دیکھیں۔

۲۷ـ مہابھارت : مقدمۂ ابوالفضل، ص ۱۹

۲۸ـ مہابھارت : مقدمۂ ابوالفضل ص ۱۹، ۲۰ (ضرورت کے تحت انگریزی مضمون سے کچھ زیادہ تفصیلات دیدی گئی ہیں)۔

۲۹ـ وہی مآخذ، ص ۲۰

۳۰ـ بدایونی : "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۳۰۰، ۳۰۱۔ یہاں بھی اصل انگریزی متن سے چند سطریں زیادہ لکھی گئی ہیں۔

۳۱ـ INDIA OFFICE MS. 761

۳۲ـ قرآن : بقرہ/۲۵۶

۳۳ـ بدایونی : "منتخب التواریخ" جلد دوم ص ۳۰۱

۳۴ـ دو فرشتے جو قبر میں مُردے سے سوال وجواب کرتے ہیں

۳۵ـ بدایونی : "منتخب التواریخ" ص ۲۹۹

۳۶ مہابھارت: مقدمۂ ابوالفضل، ص ۲۰

۳۷ خدائے ماقبل ودا، جو خالق اور ہندوؤں کے تین خداؤں یعنی برہما، شیوا اور وشنو میں سے پہلا خدا ہے۔
WALKER, BENJAMIN : HINDU WORLD (LONDON) I.P.P.164-66.

۳۸ مہابھارت: مقدمۂ ابوالفضل، ص ۲۲۔

۳۹ ابوالفضل علامی: "اکبر نامہ" جلد اول (کلکتہ ۱۸۷۳-۸۰ء) ص ۷۵۔

۴۰ مہابھارت: مقدمۂ ابوالفضل، ص ۳۴۔

۴۱ وہ تاکید کرتا ہے کہ انسانی حالات کے اختلاف کو لوگوں کے ذہن میں غلط فہمی اور شکوک و شبہات کا باعث نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے ماضی کے تاریخی حوادث کا عقلی تحلیل و تجزیہ کرنا چاہیے۔

۴۲ ابوالفضل علامی: "آئین اکبری" جلد دوم، ص ۱۰۷۔

۴۳ مہابھارت: "مقدمۂ ابوالفضل" ص ۱۷-۱۸

۴۴ Sukthankar, Vishnu S. : The Mahabharatha, I (Poona, 1933) P.VI

۴۵ بدایونی: "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۳۲۰۔

۴۶ ایضاً "ایضاً ایضاً" ص ۳۶۶۔ "بسیار متحسن افتاد کہ چند جزو شدہ، بہ عرض رسانیدم کہ بار اول مجملاً قریب ہفتاد جزو و مفصلاً در مرتبہ ثانی صد و بیست جزو نوشتہ شدہ، حکم فرمودند کہ دیباچہ چنانچہ رسم مصنفین می باشد نیز بنویسی و چون اتفاقاً چندان نداشت و نیز خطبہ بی نعت بایست نوشت اغماض نمودم۔" مترجم

۴۷ ابوالفضل علامی: "آئین اکبری" جلد اول، ص ۷۷

۴۸ Barret, Douglas and Basil Grey : Indian Painting

۴۹ اس کا ترجمہ ناظم پانی پتی نے شہزادہ سلیم کے لیے عہد اکبر کے اواخر میں کیا تھا۔ اس کا دوسرا ترجمہ جہانگیر کے حکم پر صوفی شریف نے کیا۔ جہانگیر اور سترہویں صدی کے دیگر دانشور اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کتابوں کے مطالعے سے ویدانت کے ذریعے تصوف کو بہتر طریقے سے پرکھا جا سکتا ہے۔

۵۰ بدایونی: "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۳۱۲

۵۱ وہی ماخذ: ص ۳۶۷

۵۲ وہی ماخذ: جلد سوم، ص ۱۱۹

۵۳ CATALOGUE OF PERSIAN MANUSCRIPTS IN INDIA OFFICE, 2 Vols.

۵۴ ابوالفضل علامی: "اکبر نامہ" جلد سوم، ص ۶۶۱

۵۵ بدایونی: "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۳۹۶

۵۶ ایضاً ایضاً جلد سوم، ص ۲۰۹

۵۷ Indian Painting, pp.83-84

۵۸ وہی ماخذ: ص ۹۶

۵۹ ۱۶۳۱-۳۲ء میں لکھی گئی، اس میں ہندو جہان شناسی کے موضوع پر "مہادیو" اور "پاربتی" کی گفتگو ہے۔ (فہرست ریو، جلد سوم، مخطوطہ نمبر 1034a

۶۰ فہرست ریو، جلد سوم، مخطوطہ نمبر 1044a

۶۱ برٹش میوزیم مخطوطہ نمبر 1383 - یا فہرست ریو، جلد سوم مخطوطہ نمبر 1033

۶۲ بدایونی: "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۳۰۴

۶۳ ابوالفضل علامی: "آئین اکبری" جلد اول، ص ۷۷

۶۴ بدایونی : "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۳۷۴

۶۵ ایضاً : ایضاً ایضاً، ص ۴۰۱

۶۶ Lowe, p.415, n.2

۶۷ ابوالفضل علامی: "آئینِ اکبری" جلد اوّل ص ۷۷

۶۸ ایضاً ایضاً، ص ۷۶

۶۹ CATALOGUE OF PERSIAN MANUSCRIPTS IN THE INDIA OFFICE, 1968

۷۰ بدایونی: "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۳۷۵

۷۱ ایضاً ایضاً

۷۲ STOREY, PP.532-33

۷۳ وہی ماخذ، ص ۵۳۲

۷۴ ابوالفضل علامی: "اکبرنامہ" جلد سوم، ص ۵۷۰

۷۵ SACHAU AND ETHE; CATALOGUE OF PERSIAN MANUSCRIPTS IN THE BODLEIAN LIBRARY No.364

۷۶ وہی ماخذ نمبر ۳۶۵ (No.365)

۷۷ BRITISH MUSEUM Ms Harl.5478, Rieu,I,4.

۷۸ The Jesuits and the Great Mogul, p.207

۷۹ British Museum Ms. Add-23,58

۸۰ دبستان المذاہب ص ص ۳۱۶، ۳۱۷

۸۱ The Jesuits and the Great Mogul, p.204

خدابخش لائبریری کی چند اہم مطبوعات

مطبوعات اردو

● **من موہن کی باتیں** (قرآن مجید کا ترجمہ): مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی۔ ۵۰ روپے ● **غزل مستقیم**: معلا زادہ مرتبہ پروفیسر قمر اساں خاں۔ ۴۰ روپے ● مولانا ابوالکلام آزاد کا نادر اخبار **پیغام** (مکمل فائل)۔ ۱۰۰ روپے ● **تصوف برصغیر میں**: ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں موجود مخطوطات نادر اور اہم غیر مطبوعہ مخطوطات پر تحقیقی مقالات کا مجموعہ۔ ۵۰ روپے ● **طب اسلامی**: ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں موجود مخطوطات طب پر تحقیقی مقالات کا مجموعہ۔ ۵۰ روپے ● **قطعات دلدارہ** (عہد میر و سودا کے صوفی شاعر شاہ دلدار کا کلام)۔ ۱۵ روپے ● **یادگار روزگار** (تذکرہ کولا ٹمس) از سید بدرالحسن (دو حصے ایک جلد میں)۔ ۲۰۰ روپے ● **قومی یکجہتی کی روایات**: بشمبر ناتھ پانڈے۔ ۵۰ روپے ● **ہندستانی مسلمانوں کے مسائل** از سید حامد۔ ۳۰ روپے ● **اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر**: از ادم پرکاش پرشاد (اورنگ زیب عالمگیر کی شخصیت پر لگائے گئے الزامات کا مدلل اور مفصل جواب)۔ ۱۵ روپے ● **مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا انفاذ علیگڑھ میں**: رشید احمد صدیقی۔ ۲۰ روپے ● **ایک نادر روزنامچہ**: از مولوی مظہر علی سندیلوی (انیسویں صدی کے نصف آخر سے بیسویں صدی کے ربع اول تک) تحقیق ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ ۳۰ روپے ● **داستان میری**: از ڈاکٹر اقبال حسین: بہار کے مسلمانوں کی پچھلے سو برسوں کی ادبی، تہذیبی، سماجی تاریخ۔ ۳۰ روپے ● **ہندستانی مسلمان عصری دستاویزات کی روشنی میں**: (پہلی جلد) آزادی کے بعد علی گڑھ کی فضا۔ ۱۰۰ روپے ● **فارسی اور ہندستان**: از پروفیسر نذیر احمد۔ ۱۰ روپے ● **العصر لکھنؤ**: ۱۷-۱۹۱۳ء (انتخاب و تعارف)۔ ۵۰ روپے ● **ادیب الہ آباد**: ۱۳-۱۹۱۰ء (انتخاب و تعارف)۔ ۵۰ روپے ● **صبح امید لکھنؤ**: ۲۱-۱۹۱۸ء (انتخاب و تعارف)۔ ۵۰ روپے ● **معیار** قاضی عبدالودود کا رسالہ: (مکمل فائل) ۱۹۳۶ء۔ ۵۰ روپے ● **نگار** کا جدید غزل نمبر: ۱۹۴۰ء۔ ۳۵ روپے ● **زبان گجرات**: ۲۸-۱۹۲۶ء (مکمل فائل)۔ ۵۰ روپے ● پنڈت موتی لال نہرو کا ۱۹۰۷ء کا **خطبہ صدارت**: ۱۰ روپے ● **رقعات رشید صدیقی**: مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں۔ ۳۰ روپے ● **مقدمہ طلسم ہوشربا**: ۲۰ روپے ● **طلسم ہوشربا مع مقدمہ** (آٹھ جلدیں)۔ ۸۰۰ روپے ● **ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت**: منشی رام پرشاد ماتھر (علیگ)۔ ۳۰ روپے ● **جنید احمد کی آٹوگراف بک**: ۱۰ روپے ● **دیوان مصحفی**: منتخبہ امیر مینائی و اسیر۔ ۵۰ روپے ● **شخصیات و واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا**: جنید احمد۔ ۴۵ روپے ● **گیتا اور قرآن**: پنڈت سندر لال۔ ۱۵ روپے ● **تحفۃ السعداء**: جواہر کمال (ام عہد ۱۰۹۶ھ) پیشکش حکیم حسین خاں شفا۔ ۲۰ روپے ● **بہار اردو لغت**: یوسف الدین احمد بلخی۔ ۱۵ روپے ● **تواریخ نادر العصر**: منشی نولکشور۔ تقدیم ڈاکٹر انوار الحسن۔ ۲۵ روپے۔

مطبوعات فارسی

● **قطعات حسرت**: ۱۰ روپے ● **کنز تواریخ**، شاہ غلام کبریٰ عظیم آبادی کے تاریخی قطعات۔ ۱۰ روپے ● **مجمع النفائس**: سراج الدین علی خاں آرزو۔ ۱۰ روپے ● **باغ معانی**: تذکرہ شعرائے فارسی (نقش علی)۔ ۱۰ روپے ● **صحف ابراہیم**: تذکرہ شعرائے فارسی، علی ابراہیم خاں خلیل۔ ۱۰ روپے ● **فرہنگ زفان گویا**: مرتبہ پروفیسر نذیر احمد۔ ۵۰ روپے ● **دیوان حافظ**: شاہان مغلیہ کے ذاتی نسخہ کی عکسی اشاعت۔ ۲۰۰ روپے۔

مطبوعات ہندی

● **من موہن کی باتیں**: مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا ترجمہ قرآن۔ ۱۰ روپے ● **دلدار کے دوہے**: ۱۲ویں صدی ہجری کے مشہور صوفی کا کلام۔ ۱۰ روپے ● **اورنگ زیب: ایک نئی درشٹی**: ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد۔ ۱۵ روپے ● **بھارت میں قومی ایکتا کی پرمپرائیں**: بی۔ان۔ پانڈے۔ ۵ روپے ● **مولانا آزاد کی یاد میں**: ۱۵ روپے ● **اقبال ہندستان اور پاکستان**: پروفیسر سید حسن احمد۔ ۱۵ روپے ● **بھارتیہ راشٹریہ اندولن اور مولانا ابوالکلام آزاد**: ڈاکٹر اے۔ الویم۔ ۴۰ روپے ● **سامپردایکتا اور دیش کی ایکتا**: ہندو مسلم فسادات کو کیسے روکا جائے (قومی یکجہتی پر سیاسی سماجی دانشوروں کے مقالات کا مجموعہ)۔ ۱۵ روپے ● **خدابخش لائبریری ایک پریچے**: لائبریری پر پہلی کتاب ہے جسے ایک انگریز ڈی سی اسکاٹ او کونر نے اب سے ساٹھ سال قبل لکھی جسے تازہ ترین زمانہ تک لے آیا گیا ہے۔ ۱۵ روپے

مطبوعات انگریزی

● **ایک مشرقی کتب خانہ**: ۵ روپے ● **اسلام اور ہندستانی تہذیب**: بی۔ان۔ پانڈے۔ ۱۵ روپے ● **عہد سلطنت کے صوفی ادب کا جائزہ**: بروس لارنس۔ ۱۰ روپے ● **صوفیا کے مکتوبات اور ملفوظات**: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۱۰ روپے ● **ملفوظ لٹریچر**: ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی۔ ۱۰ روپے ● **افکار اسلامی بدلتی دنیا میں**: پروفیسر سید وحید الدین۔ ۱۰ روپے ● **مجموعۂ مقالات**: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۱۰ روپے ● **بہار میں اسلام اور مسلمان عہد وسطیٰ میں**: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۲۵ روپے ● **بہار عہد سلطنت اور مغل دور میں**: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۵ روپے ● **اسلامی تقویم کی تشکیل نو**: ڈاکٹر ہاشم امیر علی۔ ۱۰ روپے ● **مشرق وسطیٰ**: پروفیسر آصف علی اصغر فیضی۔ ۱۰ روپے ● **خدابخش**: ۱۰ روپے ● **مغل آرٹ**: ۱۵ روپے ● **حضرت امیر خسرو**: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۲۵ روپے ● **فارسی ادب میں ہندستان کا حصہ**: پروفیسر امیر حسن عابدی۔ ۱۰ روپے ● **وہابی تحریک اور دوسرے مقالات**: از علی اشرف۔ ۱۵ روپے ● **ٹیپو سلطان**: حیدر علی ● **کشمیر**: ڈاکٹر محب الحسن۔ ۱۵ روپے ● **خدابخش لائبریری میں محفوظ عربی فارسی اردو مخطوطات کے توضیحی کیٹلاگ**: ۳۴ جلدیں، قیمت ہر جلد ۵۰ روپے۔

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

جناح صاحب

محمد علی جناح ملتان کے ایک نومسلم خواجہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو نقلِ وطن کرکے کاٹھیاواڑ چلا گیا تھا۔ ان کے والد کاٹھیاواڑ سے کراچی منتقل ہو گئے تھے اور وہاں چمڑے کی تجارت کرتے تھے۔ یہیں محمد علی ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ بچپن سے تنہائی پسند سنجیدہ مزاج اور حوصلہ مند تھے اور یکسوئی کے ساتھ مطالعے میں معروف رہتے تھے۔ ہائی اسکول کی تعلیم ختم کرکے وہ سولہ برس کی عمر میں قانون کی تعلیم پانے کے لیے انگلستان چلے گئے۔ روانگی سے پہلے ان کے والدین نے ہندوستانی خاندانوں کے دستور کے مطابق انکی مرضی کا لحاظ کیے بغیر ان کی شادی کر دی تھی۔ مگر کم سن بیوی تھوڑے ہی دن میں دنیا سے رخصت ہو گئی۔

لندن میں جناح صاحب نے بیرسٹری کا امتحان دو ہی سال میں پاس کر لیا۔ مگر عمر کم ہونے کی وجہ سے ڈپلوما حاصل کرنے کے لیے دو برس اور رہنا پڑا۔ انگلستان کے قیام کے زمانے میں انھیں سیاسیات سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ آگے چل کر سیاسی زندگی اختیار کریں گے۔ اور اس کے لیے تیاری بھی شروع کر دی تھی۔ ڈاکٹر محمد اشرف نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے اپنے قیام کے آخری دو سال میں سیاسی زندگی کے لیے جو ان کے پیشِ نظر تھی تیاری کے سلسلے میں اپنے طور پر مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ جناح صاحب نے فرمایا "قسمت نے یاوری کی اور مجھے کئی اہم انگریز لبرل سیاست والوں سے ملنے کا موقع مل گیا۔ ان کی مدد سے میں لبرلزم کے نظریے کو سمجھنے لگا۔ ان دنوں لارڈ مارلے کی لبرلزم کا دور دورہ تھا۔ میں نے اس لبرلزم کو اچھی طرح جذب کر لیا۔ وہ میری زندگی کا جزو بن گئی اور اس نے میرے اندر بڑا جوش اور سرور پیدا کر دیا۔"

۱۸۹۶ء میں محمد علی جناح کراچی واپس آئے اور اگلے سال انھوں نے بمبئی میں وکالت شروع کی۔ پہلے تین سال کسمپرسی اور تنگدستی میں گزرے، مگر ۱۹۰۰ء میں ان کو پریسیڈنسی مجسٹریٹ کی حیثیت سے عارضی ملازمت مل گئی جس سے وہ قانونی حلقوں میں معروف

ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو دل و جان سے وکالت کے پیشے کے لیے وقف کر دیا اور اس میں کامیابی اور ترقی حاصل کرنے لگے۔ کچھ اپنی انتہائی مصروفیت اور کچھ کھرے پن اور خود پسندی کی وجہ سے وہ سماجی زندگی سے الگ تھلگ رہتے تھے اور تنہائی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر ان کی قابلیت، محنت اور دیانت داری کی بدولت لوگ انھیں قدر و عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

۱۹۰۶ء میں جب جناح صاحب اپنی مالی حالت کی طرف سے مطمئن ہو گئے تو انھوں نے سیاسی زندگی جس کی انھیں دس سال سے آرزو تھی شروع کر دی اور دادا بھائی نوروجی کی رہنمائی میں انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہو گئے۔ ۱۹۱۰ء میں وہ بمبئی کے مسلمانوں کی طرف سے وائسرائے کی آئین ساز کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ یہاں وہ گوکھلے کے دوش بدوش آئین سازی کے مسائل میں کانگریس کے نقطۂ نظر کی حمایت کرتے رہے۔ ۱۹۱۳ء میں انھوں نے وقف علی الاولاد کے قانون کے پاس کرانے میں نمایاں حصہ لیا اور اس طرح مسلمان زمینداروں کی بڑی گراں قدر خدمت انجام دی۔ ان دنوں عمر میں پہلی اور شاید آخری بار جناح صاحب کے کسی شخص سے اتنے قریبی تعلقات ہو گئے تھے جسے دوستی کہا جا سکے۔ یہ گوپال کرشن گوکھلے تھے جن کی دلکش شخصیت کی موہنی نے ان کو رام کر کے چھوڑا۔ اپریل ۱۹۱۳ء میں وہ اور گوکھلے کچھ دن آرام کرنے کے لیے انگلستان کے سفر پر روانہ ہوئے اور موسم بہار اور گرمیوں کے مہینے وہاں گزار کر واپس آئے۔ وہاں ان کی ملاقات مولانا محمد علی اور سید وزیر حسن سے ہوئی اور ان دونوں لیڈروں کے اصرار پر جناح صاحب مسلم لیگ میں شریک ہونے پر راضی ہو گئے تاکہ "لیگ کی پالیسی کو کانگریس کے ترقی پسندانہ اور قوم پرورانہ مقاصد کے مطابق بنایا جائے۔"

اب ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ وہ کانگریس اور لیگ دونوں کے ایک معتمد لیڈر تھے۔ ۱۹۱۴ء میں وہ ہندوستانی قوم کے سفیر کی حیثیت سے انگلستان بھیجے گئے کہ ہندوستان کو سیاسی اصلاحات دینے کے لیے جو بل زیر غور تھا اس کے سلسلے میں ہندوستانیوں کے خیالات کی نمائندگی کریں مگر ان دنوں آئرلینڈ کی شورش

اور برِّ اعظم یورپ میں سیاسی کشیدگی کی وجہ سے فضا سیاسی اصلاحات کے لیے سازگار نہ تھی۔ چنانچہ بل پھر ملتوی ہو گیا اور وہ ناکام واپس آ گئے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔

جناح صاحب مسلم لیگ میں اس لیے شریک ہوئے تھے کہ اسے کانگریس سے قریب لائیں۔ ان کی تحریک سے دسمبر ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کانگریس کے اجلاس کے ساتھ بمبئی میں ہوا جس میں گاندھی جی، مسز بیسنٹ اور سروجنی نائیڈو نے بھی شرکت کی۔ رجعت پسند مسلمانوں نے لیگ کے عام جلسے میں گڑبڑ مچائی جس کی وجہ سے اسے برخاست کر کے تاج محل میں دوسرا جلسہ کرنا پڑا۔ اگلے سال لکھنؤ میں پھر مسلم لیگ اور کانگریس کا اجلاس ساتھ ساتھ ہوا۔ اس سے پہلے برطانوی پارلیمنٹ ہندوستان کو سیاسی اصلاحات دینے کا ملتوی شدہ بل گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۵ء کے نام سے پاس کر چکی تھی اور کانگریس اور لیگ دونوں نے اسے ناقابل قبول قرار دیا تھا اور دونوں کی ایک مشترک کمیٹی اس پر غور کر رہی تھی کہ ہندوستانیوں کی طرف سے حکومت کی نئی تشکیل کے بارے میں کیا مطالبہ کیا جائے اور اس میں مسلمانوں کے مخصوص حقوق کیا ہوں۔ اس کمیٹی کی متفقہ سفارش، جس کی کانگریس اور لیگ دونوں نے اپنے اجلاس لکھنؤ میں تصدیق کی، یہ تھی کہ ہندوستان کو برطانوی سلطنت کے اندر ایک خود مختار ڈومینین کا درجہ دیا جائے اور مسلمانوں کے لیے کچھ تحفظات، جن کی تصریح کر دی گئی تھی، رکھے جائیں۔ اس کے مطابق مسلمانوں کے لیے پنجاب اور بنگال میں جہاں ان کی اکثریت تھی ان کی آبادی کے تناسب سے کچھ کم اور دوسرے صوبوں میں اس تناسب سے کچھ زیادہ نشستیں رکھی گئی تھیں اور ایک اہم شرط یہ تھی کہ اگر مرکزی یا صوبائی کونسلوں میں کوئی غیر سرکاری تجویز پیش ہو جس کا اثر متعلقہ کونسل کے ہندو یا مسلمان ممبروں کے نزدیک ان کے فرقے کے مفاد پر پڑتا ہو اور ان میں سے تین چوتھائی اس تجویز کے مخالف ہوں، تو اس تجویز کو نظر انداز کر دیا جائے۔

قومی تحریک کی تاریخ میں معاہدہ لکھنؤ کی یہ اہمیت ہے کہ پہلی بار نیشنل کانگریس

نے فرقہ وارانہ سیاست کو باضابطہ منظوری دی اور اس کے ساتھ سمجھوتا کیا۔ جناح صاحب کی زندگی میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی۔ انھوں نے تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کر دیا تھا اور دونوں کے محترم اور معتمد لیڈر بن گئے تھے۔

ادھر اعتدال پسند کانگریس اور لیگ آئینی طریقے سے خود اختیاری حکومت کا مطالبہ کر رہی تھیں اُدھر انتہا پسند ہوم رول لیگ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پبلک ایجی ٹیشن سے کام لے رہی تھی اور کچھ خفیہ جماعتیں تخریف پسندی کا ہتھیار استعمال کر رہی تھیں۔ ان سب واقعات کے دباؤ سے مجبور ہو کر ۱۹۱۷ء میں وزیر ہند مسٹر مانٹیگو نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستانیوں کو بہ تدریج ملک کے انتظام میں شریک کرنا اور آگے چل کر اسے سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری دینا چاہتی ہے۔ اگلے سال مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔ جن میں کونسلوں میں منتخب شدہ ممبروں کی تعداد بڑھانے اور ان کے اختیارات میں کچھ اضافہ کرنے کی تجویز تھی۔ کانگریس اور لیگ دونوں میں اعتدال پسند عناصر نے ان تجویزوں کا خیر مقدم کیا لیکن انتہا پسند اکثریت نے ان کو رد کر دیا اور ذمہ دار حکومت کے مطالبے پر اصرار کیا۔

اب تک جناح صاحب مسلم لیگ کو کانگریس کے ساتھ ساتھ آئینی سیاست کی راہ پر چلا رہے تھے۔ لیکن ۱۹۱۹ء میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ کانگریس عوامی تحریک کے طوفان میں جو ایک دم سے بڑے زور شور کے ساتھ اٹھا تھا بہہ گئی۔ وہ ایک آئینی جماعت کے بجائے ایک انقلابی جماعت بن گئی اور اس نے ایک حد تک لیگ کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔ جناح صاحب کے لیے جنھوں نے لارڈ مارلے کی لبرلزم اور انگریزوں کے آئینی طریقوں کو اس طرح جذب کیا تھا کہ وہ ان کی "زندگی کا جز" بن گئے تھے، اس طوفانی سیاست کا ساتھ دینا دشوار ہو گیا۔

——— اس کی وجہ مقاصد

کا یا جذبات کا اختلاف نہیں بلکہ صرف طریقِ کار کا اختلاف تھا۔ جناح صاحب خود برطانوی حکومت کی جابرانہ پالسی سے سخت بیزار تھے۔ وہ ۱۹۱۹ء کے اصلاحات کے ایکٹ سے

بالکل غیر مطمئن تھے، رولٹ ایکٹ کے پاس ہوتے ہی احتجاج کے طور پر امپیریل لیجسلیٹو کونسل سے استعفا دے چکے تھے۔ خلافت کے "غارت کرنے" اور پنجاب میں وحشیانہ مظالم کے خلاف بھی وہ غم و غصے کا اظہار کر چکے تھے۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں انھوں نے کہا تھا۔ "ایک کے بعد ایک ذلت آمیز اقدام، مایوسی پر مایوسی، چرکے پر چرکا۔ ان باتوں کا صرف ایک ہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ روس میں ان سے بالشویک تحریک اٹھی تھی، آئرلینڈ میں سن فین تحریک، خدا کرے ہندوستان میں ان کا نتیجہ آزادی ہو۔"[لہ]

یہاں تک وہ کانگریس اور مسلمانوں کی نیم سیاسی، نیم مذہبی جماعتوں کے ساتھ تھے۔ لیکن عدم تعاون کی "رہ قلندر" جو خود ان کی "رہ و رسم پارسائی" کے یکسر خلاف تھی ان کو سخت ناپسند تھی۔ انھیں اندازہ تھا کہ خود مسلم لیگ کے بہت سے ممبر زمانے کی ہوا سے متاثر ہو چکے ہیں، اس لیے مصلحت اندیشی سے کام لے کر انھوں نے اپنے ساتھیوں سے اپنی رائے منوانے کی کوشش نہیں کی بلکہ انھیں یہ ہدایت کی کہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر خود فیصلہ کریں۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں جب کانگریس نے اپنے اجلاس ناگپور میں عدم تعاون کی پالسی کو سرکاری طور پر منظور کیا تو جناح صاحب تنہا شخص تھے جنھوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے بعد وہ کانگریس سے الگ ہو گئے۔ ہوم رول لیگ سے پہلے ہی الگ ہو چکے تھے۔ مسلم لیگ کے معمولی ممبر رہے مگر اس سے بھی ان کا جی اچاٹ ہو گیا۔

اگلے چند سال کا زمانہ ان کی ذاتی اور عمومی زندگی میں سخت کلفت اور افسردگی کا زمانہ تھا۔ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے ایک رومانی کیفیت میں جوان پر عمر میں پہلی اور آخری بار گزری تھی۔ دوسری شادی سر ڈنشا پٹت کی ۱۸ برس کی لڑکی سے کر لی تھی۔ مگر میاں بیوی کے درمیان نہ صرف عمر میں بلکہ مزاج اور مذاق میں اس قدر فرق تھا کہ شروع سے ہم آہنگی نہ ہونے کا احساس پیدا ہو گیا۔ جناح صاحب اپنے گہرے احساس فرض کی وجہ سے اپنی کمسن دولہن سے نبھانے کی انتہائی کوشش کرتے تھے مگر ان کی زندگی کا سکون برباد ہو گیا تھا! انھیں اپنی طبیعت اور عادت کے خلاف اپنی بیوی کی خاطر بمبئی میں سوسائٹی کی عیش و نشاط کی زندگی میں حصہ لینا پڑتا تھا اور سیر و تفریح کے لیے یورپ کے سفر کرنے پڑتے تھے۔ لاابالی نوجوانی اور متین و پر وقار کہولت کا

لہ Jinnah, by Bolitho p 82

ساتھ زیادہ دن نہ نبھ سکا اور ۱۹۲۸ء میں میاں بیوی میں علٰحدگی ہو گئی۔ مصالحت کی ساری کوششیں ناکام رہیں یہاں تک کہ بیگم جناح مہینوں کی شدید علالت کے بعد ۱۹۲۹ء میں دنیا سے رحلت کر گئیں۔ اور جناح صاحب دس سال کی اپنی زندگی کی شیریں اور تلخ یادوں کے ساتھ پھر تجرد کی سنسان زندگی بسر کرنے لگے۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۹ء تک جناح صاحب کے لیے گھر کی پرشور فضا کی طرح ملکی سیاست کی پرآشوب فضا بھی سخت ناخوشگوار اور تکلیف دہ تھی۔ کانگریس کے چھوڑنے کے بعد تین سال تک تو وہ سیاسی زندگی سے بالکل الگ تھلگ رہے مگر ۱۹۲۳ء میں جب اس مرکزی اسمبلی کے جو ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے تحت قائم ہوئی تھی، دوسری مرتبہ انتخابات ہوئے تو وہ بمبئی کے مسلم حلقے سے اس کے ممبر چنے گئے۔ اسمبلی میں آئندہ چھ سات سال تک کبھی چند رفیقوں کے ساتھ اور کبھی تن تنہا وہ اپنی جداگانہ آزاد پالیسی پر چلتے رہے جس کے دو بنیادی مقاصد تھے ایک یہ کہ آئینی طریقوں سے کام لے کر ہندوستان کے لیے خود اختیاری حکومت حاصل کی جائے، دوسرا یہ کہ قانون ساز مجالس میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی دے کر ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد قائم کی جائے۔ جہاں تک پہلے مقصد کا تعلق ہے اس کے حصول کے لیے کانگریس اور مسلمانوں کی انتہا پسند جماعتیں اب جناح صاحب کی محفوظ مگر دور دراز آئینی راہ پر چلنے کو تیار نہ تھیں بلکہ گاندھی جی کا دکھایا ہوا عملی جدوجہد یعنی عدم تعاون اور سول نافرمانی کا راستہ اختیار کر چکی تھیں جسے جناح صاحب نامناسب اور تباہ کن سمجھتے تھے۔ دوسرے مقصد کے بارے میں اصولی حیثیت سے قریب قریب سب جماعتیں جناح صاحب سے متفق تھیں مگر اس کو عملی شکل دینے میں سخت دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ ۱۹۱۶ء میں جو معاہدہ لکھنؤ میں جناح صاحب کی کوششوں سے کانگریس اور مسلم لیگ میں ہوا تھا اس سے اب کوئی بھی مطمئن نہ تھا۔ بنگال اور پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی انھیں یہ شکایت تھی کہ اس معاہدے کی رو سے انھیں آبادی کے تناسب سے کم نمائندگی دی گئی ہے۔ دوسرے صوبوں میں ہندوؤں کو اعتراض تھا کہ مسلمانوں کو آبادی کے لحاظ سے جتنی نشستیں ملنی چاہیئے تھیں اس سے دو گنی تگنی ملی ہیں۔ قوم پرور ہندو مسلمان جداگانہ انتخابی حلقوں کے اصول کو جو معاہدہ لکھنؤ میں تسلیم کر لیا گیا تھا فساد کی جڑ سمجھ کر

منسوخ کرانا اور مشترک انتخابی حلقے قائم کرانا چاہتے تھے۔ اس عام بے اطمینانی سے فائدہ اٹھاکر رجعت پسند فرقہ وارانہ جماعتیں عوام کو بھڑکا کر فرقہ وارانہ فسادات کرا رہی تھیں جنھوں نے ملک کی ساری فضا کو مسموم کر دیا تھا۔ جناح صاحب کئی سال سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ اب فرقہ وارانہ مسئلے کو نئے سرے سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے اصول نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ شعور کو بہت تیز اور شدید کر دیا ہے اور قومی اتحاد کی راہ میں بڑی زبردست رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو مخلوط انتخابی حلقوں کے اصول پر راضی کریں اور اس کیلئے ضروری سمجھتے تھے کہ انھیں ان تحفظات سے بہتر اور زیادہ قابل عمل تحفظات دیئے جائیں جو معاہدۂ لکھنؤ کے مطابق دیئے گئے تھے۔

گو قومی سیاست کے نئے دور میں جو ۱۹۲۰ء سے شروع ہوا تھا جناح صاحب کا اثر عام طور پر ملک میں اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں بہت کم ہو گیا تھا پھر بھی قریب قریب ہر پارٹی کے لوگوں کو ان کے حب وطن اور ان کی سیاسی سوجھ بوجھ پر پورا اعتماد تھا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۲۷ء میں جب ۳۰ مسلمان لیڈروں نے جن میں مختلف سیاسی خیالات کے لوگ شامل تھے دہلی میں جمع ہو کر فرقہ وارانہ مسئلہ پر غور کیا تو جناح صاحب جلسے کے صدر بنائے گئے اور جو تجویزیں منظور ہوئیں وہ مجموعی طور پر ان کے نقطۂ نظر کے مطابق تھیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کے آئندہ دستور میں :-

(۱) آئین ساز مجلسوں کے لیے مخلوط حلقہ ہائے انتخاب ہوں مگر ہندو مسلمانوں کے لیے ایک مقررہ تناسب سے نشستیں محفوظ رکھی جائیں۔

(۲) سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے مسلم اکثریت کا ایک نیا صوبہ بنایا جائے۔

(۳) دو اور صوبوں کو جن میں مسلم اکثریت ہے یعنی شمالی مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان کو سیاسی اصلاحات دی جائیں۔

(۴) مرکزی قانون ساز مجلس میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دی جائیں۔

(۵) مسلم اکثریت کے سب سے بڑے صوبوں پنجاب اور بنگال میں ہندوؤں اور مسلمانوں

کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے ہو۔ جہاں تک اور صوبوں کا تعلق ہے مسلم اکثریت کے صوبوں میں کونسلوں میں نمائندگی اور نشستوں کو محفوظ کرنے کے سلسلے میں ہندوؤں کو وہی رعایتیں دی جائیں جو مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے صوبوں میں حاصل ہوں۔

انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے اجلاس مدراس (دسمبر ۱۹۲۷ء) میں ان تجویزوں کو منظور کرلیا۔ اور اس رزدلیوشن نے جو اس سلسلے میں پاس ہوا اس بات کی بھی ضمانت دی کہ ہر فرقے کو مذہبی عقیدہ و عمل کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور کوئی مسودہ قانون جس کا اثر ایک خاص فرقے کے مفاد پر پڑتا ہو مجلس قانون ساز میں اس وقت تک پیش نہیں ہوسکے گا جب تک اس فرقے کے منتخب شدہ ممبروں میں سے تین چوتھائی اس کے پیش ہونے پر راضی نہ ہوجائیں۔

بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ۱۹۱۶ء کی طرح ایک بار پھر کانگریس اور مسلمانوں کے نمائندوں کے اتفاق رائے سے فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہوگیا ہے۔ لیکن یہ محض دھوکا تھا۔ ۱۹۲۷ء کی دہلی کی تجویزوں پر مسلمان تو سبھی متفق ہوگئے تھے لیکن ہندوؤں کا ایک بڑا حصہ خصوصاً پنجاب اور بنگال میں جو کانگریس کے ساتھ نہیں بلکہ ہندو مہاسبھا اور دوسری فرقہ پرور جماعتوں کے ساتھ تھا، ان تجویزوں کا سخت مخالف تھا خصوصاً اس بات کو سراسر خلاف انصاف سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کے لیے پنجاب اور بنگال میں بھی جہاں ان کی اکثریت ہے نشستیں محفوظ کی جائیں۔ ممکن ہے کہ عام حالات میں کانگریس ان حلقوں کی مخالفت کی پروا نہ کرتی۔ لیکن اتفاق سے ان دنوں ایسی غیر معمولی صورت حال پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے کانگریس کو ملک کے لیے نیا آئین مرتب کرنے میں ہر خیال کے لوگوں کو ساتھ لے کر کام کرنا پڑا اور اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ اتفاق کے لیے حاصل کرنے کی خاطر دہلی کی تجاویز میں ترمیم کردی گئی۔

کچھ دن پہلے دہلی میں مرکزی اسمبلی نے یہ رزدلیوشن پاس کیا تھا کہ ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے جس میں برطانوی حکومت اور ہندوستانی قوم کے نمائندے مل

کہ ہندوستان کے آئینی مسئلہ پر غور کریں۔ حکومت برطانیہ نے اس رزولیوشن کو قطعاً نظرانداز کر کے نومبر ۱۹۲۷ء میں ہندوستان کے مسئلے کی تحقیقات کے لیے اپنی طرف سے ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا۔ اس کے صدر سر جان سائمن اور چھ ممبر تھے جن میں ایک بھی ہندوستانی نہ تھا۔ ہندوستان کی سبھی پارٹیوں نے، جن میں جناح صاحب کی مسلم لیگ بھی شامل تھی، کمیشن کے تقرر کو قوم کی توہین سمجھا، اور اس کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے اجلاس مدراس میں جس میں فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کیلیے دہلی کی تجویزیں منظور کی تھیں، سائمن کمیشن کے توڑ پر یہ رزولیوشن پاس کیا کہ مرکزی اور صوبائی قانون ساز مجالس کے ارکان اور ملک کی کل سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس بلائی جائے جو ملک کے لیے ایک نئے آئین کا مسودہ تیار کرے۔ اس کانفرنس نے اپنے پہلے اجلاس میں پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی کہ آئین کے بارے میں اپنی رپورٹ پیش کرے۔ چونکہ کانفرنس نے دہلی کی تجویز کو نظرانداز کر کے فرقہ وارانہ مسئلے پر بھی نئے سرے سے غور کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس لیے مسلم لیگ نے احتجاج کے طور پر نہرو کمیٹی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ کمیٹی کی رپورٹ میں جو اگست ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی، فرقہ وارانہ مسئلے کا ایسا حل تجویز کیا گیا جو دہلی کی تجاویز سے بہت مختلف تھا۔ رپورٹ پر آخری مرتبہ غور کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتے میں آل پارٹیز کنونشن کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس نے مسلمانوں میں قوم پروری کی تحریک کو ایسی کاری ضرب لگائی جس سے وہ کبھی پوری طرح سنبھل نہ سکی۔ اجلاس کے دوران میں سب سے بڑے کانگریسی مسلمان لیڈر مولانا محمد علی کو اس طرح دق کیا گیا کہ وہ نہ صرف کنونشن کے جلسے کو چھوڑ کر چلے گئے بلکہ کانگریس سے بھی بددل ہو گئے[1]۔ سب سے بڑے غیر کانگریسی مسلمان لیڈر محمد علی جناح صاحب کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک ہوا۔ نہ صرف ان کی پیش کی ہوئی ترمیموں کو جو جناح کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہیں، ایک ایک کر کے رد کر دیا گیا بلکہ یہ طعن بھی کیا گیا کہ ان کو مسلمانوں کی نمائندگی کا کوئی حق نہیں۔ جناح صاحب کا دل ٹوٹ گیا اور انھیں ہندو مسلم اتحاد کی طرف سے، جو ان کی زندگی کا مشن تھا، مایوسی ہو گئی۔ ان کے

---

[1] Indian Muslims, by Ram Gopal   pp 205-206

ایک پارسی دوست کہتے ہیں کہ اس موقع پر انھوں نے خود پسند، خود دار جناح کو عمر میں پہلی بار روتے ہوئے دیکھا۔[ئے]

جناح صاحب کی خاندانی زندگی کی بربادی کا جو کچھ دن پہلے رتن بائی جناح کی وفات کے ساتھ انتہا کو پہنچ چکی تھی ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اب انھیں اپنی عمومی زندگی بھی ویران اور سنسان نظر آنے لگی۔ چنانچہ وہ جون ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کی سکونت ترک کر کے لندن میں مقیم ہو گئے۔ اس سال اور آئندہ سال جو گول میز کانفرنس ہندوستان کے آئینی مسئلے پر غور کرنے کے لیے لندن میں منعقد ہوئی اس میں جناح صاحب بھی ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ پہلے اجلاس کے بعد انھیں کچھ امید بندھی کہ شاید اس کانفرنس کا کچھ مفید نتیجہ نکلے لیکن دوسرے اجلاس کی ناکامی دیکھنے کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو سیاست سے بالکل الگ کر کے اپنے قانونی پیشے میں کھو دیا۔

مسلم لیگ کے ایک قابل اور مخلص جوان العمر لیڈر لیاقت علی خاں نے جو اپنی دولہن کے ساتھ ۱۹۳۳ء میں لندن گئے تھے جناح صاحب کو یہ یقین دلایا کہ مسلم لیگی خیال کے مسلمانوں کو ان کی رہنمائی کی سخت ضرورت ہے اور وہ اس ضرورت کو شدت سے محسوس بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ اگلے دو سال میں جناح صاحب کئی بار ہندوستان آئے گئے اور مسلم لیگ کے جلسوں میں شریک ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں بمبئی کے مسلمانوں نے ان کی غیر موجودگی میں انھیں ایک بار پھر مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کا ممبر منتخب کیا اور اکتوبر ۱۹۳۵ء میں وہ مستقل طور پر ہندوستان واپس آکر بمبئی میں رہنے لگے۔

(ماخذ: ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں)

ئے- Jinnah, by Bolitho p 95

جہانِ سرسید

مؤید الاسلام

جان ڈیون پورٹ

جان ڈیون پورٹ کی کتاب کا چھپوانا

لندن ہی میں سرسید نے جان ڈیون پورٹ کی کتاب "اپالوجی فور محمد اینڈ قرآن" کو جو انھوں نے عیسائیوں کے برخلاف اسلام کی حمایت میں لکھی تھی، خود اپنے روپے سے چھپوایا۔ سرسید کے خطوں سے جو سید مہدی علی خاں کے نام ہیں معلوم ہوتا ہے کہ لندن کا کوئی پبلشر اس کتاب کے چھاپنے کی ہامی نہیں بھرتا تھا اور خود مصنف کو اس قدر استطاعت نہ تھی کہ اپنے روپے سے اُس کو چھپوا کر شائع کردے۔ سرسید نے وہاں پہنچ کر جب اس کتاب کے مضامین سُنے تو انھوں نے فوراً اپنے پاس سے روپے کی تدبیر کر کے وہ کتاب جھٹ پٹ چھپوادی اور اُس کی کئی سو جلدیں ہندوستان بھجوادیں۔ یہاں اس کا ایک اردو ترجمہ مولوی عنایت الرحمٰن خاں صاحب دہلوی نے اور دوسرا مولوی ابوالحسن نے کیا اور دونوں ترجمے چھپ کر شائع ہوگئے۔

ماخذ ــــــــ حالی: حیات جاوید ص ۲۰۲

کچھ جان ڈیون پورٹ کے بارے میں

لندن سے سرسید کے دو خط محسن الملک کے نام

ایک انگریز نے جس کا نام مسٹر جان ڈیون پورٹ ہے، حمایتِ اسلام میں ایک عجیب و غریب کتاب لکھی ہے۔ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا حال لکھا ہے اور جس قدر اتہام اور الزام انگریزوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر اور قرآن پر اور مذہب اسلام پر لگائے ہیں، اُن کا جواب دیا ہے۔ چونکہ یہ کتاب بالکل انگریزوں کے مخالف تھی (اس لیے) اس کا چھاپا ہونا اور فروخت ہونا مشکل تھا۔ میں نے کل لاگت چھاپے کی دینی قبول کی اور احباب سے پچاس پچاس روپے اس کی لاگت ادا کرنے کو طلب کیے، اور بعوض اس کے بارہ بارہ کتابیں دی جاویں گی۔ اسی (کی) بابت پچاس روپے آپ سے بھی طلب کیے تھے۔ پس اگر وہ خط نہ پہنچا ہو تو اب فی الفور پچاس روپے بھیج دو۔ وہ کتاب تیار ہو گئی، چھپ چکی۔ آئندہ میل میں روانہ کروں گا۔ تصویر مسٹر ڈیون پورٹ کی بھیجتا ہوں۔ نہایت تنظیم و ادب اور محبت رکھنے کے لائق آدمی ہے۔

(لندن، روز جمعہ ۶ اگست ۱۸۶۹ء)

جس کتاب کے چھاپے ہونے کا اشتہار میں نے بھیجا تھا وہ تمام ہو گئی۔ ہفتہ یا دو ہفتے کے بعد اس کے نسخے آپ کے پاس روانہ کروں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے کیسا انصاف اور کیسا سچ اختیار کیا ہے۔ گو بعض خیالات اس کے ہمارے خیالات کے موافق نہ ہوں۔ وہ مسلمان نہیں ہے، انگریز ہے۔ جب آپ اس کی کتاب دیکھیں گے تو جانیں گے کہ وہ انگریز ہزاروں مسلمانوں سے بہتر ہے۔

ایک عجیب بات سنیے کہ جو کتاب چھپ چکی ہے اس میں مصنف نے لکھا ہے کہ جو الزام جلا دینے کتب خانۂ مصر کا نسبت حضرت عمرؓ کے لگایا جاتا ہے، غلط ہے۔ اور یونانی اور رومی تاریخوں سے ثابت کیا ہے کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر کے وقت میں جلا (بے وقوف شیخی پسند بعض ناواقف مسلمان مورخوں نے اسی واقعے کو، مسلمانوں نے جب مصر فتح کی، اُس کے ساتھ لگا دیا)۔ اس امر کا ایسا مستحکم ثبوت دیا ہے کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر نے جلایا۔

(لندن، ۳۰ جولائی ۱۸۶۹ء)

مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ

ہزار شکر بدرگاہ کریم کارساز کہ نسخۂ غریب و رسالۂ عجیب موسوم بہ

مؤیّد الاسلام

واقع دہلی کوچہ نوان گذر چیا مدرسے چوک متصل محاسب خانہ

در مطبع بدر الدجی باہتمام خواجہ قمر الدین خان طبع شد

مؤلف

مولف اف جون ڈیون پورٹ صاحب مصنف کتب مفصلۂ ذیل

وقائع عمری علی پاشا دالی جنانہ —— رسالہ ابرای اہل اودہ ——

رسالہ دربیان ملک گورک وراجہائی گورک موید سوانح تاریخ مفسد ——

مجموعہ تواریخ و تصانیف مختلفہ مفید طلبا ——

فہرست مضامین کتاب ہذا ——

مین اقرار کرتا ہون کہ اس زمانہ کی عیب اون لوگونکی بات ہرگز میری سمجھہ مین نہین آتی جو کہتی ہین کہ انحضرت معاذاللہ جعلساز تہی اور اونہون نی حقند ا قریب بنایا تہا اور قرآن ایسا لکھا جیسی کوئی جعلساز لکھی میری رای مین جو مصنف آدمی قرآن کو پڑہیگا اوس کا یقین اس قول سی بالکل مختلف ہوگا — از کتاب کارل صاحب جلد ۲ صفحہ ۱۳۴ مطبوعہ لنڈن **مولف** وجی ڈلوی وغیرہ تجار کی فایدہ کیلئے طبع ہوی مقام ۱۳۷ لونگ ایکر

دیباچہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سزاوار پرستش اوس وحدہ لاشریک کی ذات ہی جسکی ایک لفظ کن کی ہیہ
ساری کائنات ہی اوس کی دریائی کمال مین آسمان سی ہزارون حباب
اوس کی پرتو نور اجلا سی مہر و ماہ سی لاکھون کواکب ضیایاب قطرۂ آب اوسکی
فیض عمیم سی دُرنایاب بن جاتا ہی پتھر اوس کی عنایت صمیم سی یاقوت ناب
ہوجاتا ہی وہ دانہ خشک سی سبزۂ تر نکالتا ہی اوس کے حکم سی خاک سی آب پاک
جاری ہوجاتا ہی کبھی شام ہی کبھی صبح ہی کبھی دن ہی کبھی شب ہی غرض اوس
صانع مطلق کا جو کار ہی وہ عجیب ہی جب اوس کا دریائی غضب جوش مین
آتا ہی فرعون سا اَنَا رَبُّکُمُ الاَعلیٰ کہنی والا غرقۂ طوفان فنا ہوجاتا ہی جب وہ
اپنا زور جبروت دکہاتا ہی تب پشہ سی نمرود کا مغز نکلواتا ہی اوس کی بزرگی
کی ایوان کی سائی مین مرغ خیال شکستہ بال ہی اور اوس کی قصر عظمت
تک کمند اوہام پہنچنے کی کیا مجال اوس کی افزایش رحمت کا ہرگز

نہ بہین ہو اگرچہ ہر سوی تن زبان ہو اوسنی آدمیکو اشرف المخلوقات بنایا جوہر
قابلیت عطا فرمایا دیدہ بینا دیا تا اوس کی صنایع و بدایع کو نظر تامل سے
دیکہین اور عبرت پذیر ہون اور گوش شنوا عنایت کیا تا اوس کا کلام
ہدایت فرجام سنین اور صراط مستقیم پر رہگیر ہون اوس نی پیغمبر و
رسول بہجوائی اوہین معجزات باہرہ عنایت فرمای تا رہروان وادی ضلالت
کو راہ پر لائین اور گم گشتگان طریق گمراہی کو رستہ بتائین ہر چند اون
خاصان خدای ابلاغ رسالت مین سعی تمام فرمائی ہر ایک کو راہ رستگاری
دکہائی مگر شیطان نی انسانون کو ایسا بہکایا تہا کہ طریق نجات کی طرف کو
پانون نہ بڑہاتا تہا حضرت نوح علیہ السلام کی ہزار برس کی پند و نصایح نی یہہ
نتیجہ دکہایا تہا کہ ایک گروہ قلیل ساٹ ستر آدمیون کا ایمان لایا تہا پہر
حضرت خلیل اللہ علی نبینا و علیہ السلام نی شیوع ملت حنفی مین سعی بی پایان اور
کوشش فراوان کی مگر ضلالت و گمراہی بالکل نہ گئی بعد اوسکی حضرت موسی
علیہ السلام نی زبان تیغ و تیغ زبان سی کام لیا مگر مشرکین نی نمانا اور اوس
برگزیدہ خدا کا سمجہانا افسانا جانا باوجود تمام عمر اعلان کلمہ حق مین بسر کی مگر
بت پرستی کی ہمہ تونی کی کوئی صورت نہ بنی اون کی بعد حضرت عیسی علیہ السلام
خدا کی دستور اور ہدایت خلق کیلئے مامور ہوئی اون حضرت نی بکمال رفق و
مدارا کی ہر ایک کو سمجہایا خدای یکتا کی بندگی کا شیوہ بتایا مگر سوای چند

اشخاص کی کسینی اوس واحد مطلق کی یکتائی نمانا اور طریق راستی کو بجھانا بہن
جبکہ کار تبلیغ رسالت ہر نبی مرسل کے وقت مین ناتمام رہا اس واسطے غیرت
ایزدی مقتضی اس امر کے ہوئی کہ اب جہان کو اوس کی وجود باوجود سی رونق
بخشی کہ وہ سالکان مسالک گمرہی کو شاہراہ ہدایت پر لائے اور واپسان قافلہ
تیہ جہالت کو منزل مقصود دکہائی اور بموجب آیۃ داقی ھذہ آیۃ الیوم اکملت
لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی اتمام نعمت واکمال دین کا باعث ہو
نعت وہ وہ جس کے سبب جہان کی نمایش و آدم کی پیدایش ہوئی
لراقمہ ہو ثابت یہہ پیدایش سی اوس کی خداوند نیہ اپنی مہربان سی
وہ جس کی نعلین تاج سر عرش برین وہ جس کی ادنا خدمتگارون مین روح الامین
وہ جسکی خاک آستان پر سر عجز آسمان وہ جسکا محکوم زمین و زمان وہ کہ اگر اوسکا
قدم مبارک زمین پر نہ آتا کار رسالت یونہین ناتمام رہجاتا وہ اوج رسالت کا
ماہ دو ہفتہ وہ سپہر کرامت کا مہر رخشندہ وہ جسکا زمین سی بالای عرش
ایکدم مین گذار ہوا وہ جسکا براق برق رفتار راہوار ہوا وہ خدا جس کا خود
طالب دیدار ہی وہ باعث نازش پروردگار ہی وہ جسکی تحت لوا پیغمبران
مرسلین وہ کون یعنی حضرت ابوالقاسم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
خاتم النبیین **میر ممنون** س محمد عربی بادشاہ عرش حریم ٭ کری ہی روح
قدس جسکی در کی دربانی ٭ اوسی خدا تو نہین کہہ سکون پہ کہتا ہون ٭ کہ اوس کے

مرتبہ عالی مین ہی خدادانی بندہ لباس بشر مین نور خدا تہا واللہ اعلم کیا ماجرا تہا
بندہ ہوکر خدا کا حبیب ہو یہ رتبہ کس کو نصیب ہو غالب تمنای دیرینہ
کردگار بوی ایزد از خویش امیدوار زراز نہان پردہ برزدہ ز ذات خدا
معجزی مہر زدہ دخاتم نگین رسالت وہ گوہر دریای جلالت قصر اسلام کو اوسکی
معمار شرع نی قوی اساس بنایا ظلمت جہل کو اوسکی نور جمال نی مٹایا اوس ذات
مقدس کا اگر دنیا مین ظہور نہوتا تو قیامت تک جنس اصنام بیت الحرام سی نہ
دور ہوتا وہ نور پاک نہا دا اگر اس جہان ظلمت بنیاد کی رونق نہ بڑہاتا اور جو وہ
قدم مسعود زمین کو آسمان نہ بناتا تو گم کردہ راہون کو راہ نجات کون دکہاتا
باغ نعیم یوہین خالی رہجاتا بہشت اوس کی محبونکی فرش راہ ہی چشمۂ کوثر کو اوسکی
خادمونکی چاہ ہی جب وہ اپنا رتبہ شفاعت دکہائیگا طاعت کو گناہ پر رشک
آئیگا خسروے پردہ کش امت شوریدہ کار ضامن امرزش پروردگار
عذر زعاصی بود اندر گناہ طرفہ کہ من عاصی او عذر خواہ اگر موسیٰ کے ید بیضا ہاتھ
آیا مگر ویسا دست قمر شگاف کسیکو نہ ملا رسالت نی اوسکی نسبت ذاتسی زینت
پائی نبوت نی اوسکی سبب سی یہہ صفت دکہائی مہر انور کو اسی بات کی جلن ہی کہ
اوسکی روضۂ اقدس مین مین نہین اور شمع روشن تہا آسمان کو زمین سی اسیکا
غبار ہی کہ اسمین کیون حضرت کا مزار ہی اوسکی حکم سی رجعت آفتاب کا کیا تعجب ہی
اگر وہ اپنی اسپ معجز نما سی فرمائی تو زمین آسمان و آسمان زمین ہوجای شجر و حجر

والنسان وحیوان اوس کی اثبات رسالت کی گواہی مین ہمہ تن زبان ہو ہر ایک
عہد مین اوس خاصہ کردگار کی دین کی بڑھنی کی سامان ہوی ہیں یہی حجت حق اسی
کہتی ہین اور اثبات دعوی راستی کی یہی معنی ہین حضرت کی علویت مرتبہ کو منکران
نبوت بھی مانجاتی ہین اور اہل استخفاف کی زبانسی بھی کلمات حق نکلجاتی ہین چنانچہ
فی زماننا دار السلطنت لندن مین صاحبان انگلشیہ مین سی ایک صاحب کہ جنکا نام
نامی جون ڈیون پورٹ صاحب ہی اور نہایت اپنی علم مین ذی استعداد و مورخ بی
بدل و انصاف دوست و راستی آشنا ہین اونہون نی کچھہ ہماری حضرت رسالت
پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وقایع عمری تحریر کیا ہی اور بعض بعض الزامات کا
جو غیر مذہبون نی بسبب تعصب مذہبی کی آنحضرت کی نسبت لگائی ہین اون کا
جواب لکھکر اونکو دفع کیا ہی جب وہ کتاب چھپکر ہندوستان مین آئی تو اوسکی پڑھنی کی
ہر ایک دوستدار نبوی کی طبیعت لہرائی جو کہ زبان انگریزی مطلق نہین جانتا اسواسطی
مشفقی خواجہ قمر الدین خان صاحب عرف خواجہ مرزا صاحب خلف الصدق خواجہ بدر الدین خان صاحب
عرف خواجہ امان صاحب مترجم بوستان خیال کہ جوان سنجیدہ و فہمیدہ ہین اونہون نی چاہا
کہ یہہ کتاب زبان انگریزیسی اردو زبان مین ترجمہ ہوجائی تا ہر ایک مشتاق اوسکی پڑھنی سی حظ
اوٹھاوی اور اس کار خیر کی انصرام مین تو اب عاید حال ہوجائی یہہ خیال کرکی خواجہ صاحب
موصوف نی اسکی درستی کی کمر ہمت چست باندہی اور محمد عنایت الرحمن خان صاحب کہ دہ فن
ترجمہ دیگر مین دستگاہ تام رکہتی ہین کتاب مذکور کا ترجمہ کروایا جب ترجمہ ہو چکا تو مؤید الاسلام نام

کہا اور مقصد الطباع کیا اور اس خاکسار ہیچمدان مہدی مجروح سے دیباچہ لکھنے کو فرمایا
بندہ خواجہ صاحب کا حکم بسر وچشم بجا لایا کسواسطے کہ رضاجوئی احباب وکار ثواب ہے
اب آگے اصل مطلب کتاب ہے فقط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس کتاب کے تصنیف سے میری غرض یہہ ہے کہ آنحضرت کی وقائع عمری پر جو جھوٹی
الزامات اور بے انصافانہ بہتان ہوئی ہین اون کو رفع کرون اور یہہ ثابت کرون
کہ آپ فی الحقیقت خلق اللہ کے بڑی مربی اور نفع رسان تھی وہ صنف جنہون نے
تعصب مذہبی کی سبب سے اس محی عبادت واحد مطلق کی شہرہ پر داغ لگایا ہے اونہون نے
یہی نہین ظاہر کیا کہ ہم نامنصف اور اوس عقل سے خالی ہین جسکی اتباع کیواسطے
حضرت عیسی نے اسقدر شد و مد سے تاکید فرمائی ہے بلکہ اونھون نے اپنی رائین کے بنایا
ہے کیونکہ ادنی فکر مین اونکو یقین ہوجاتا کہ یہہ عیسائیون اور اس زمانہ کی عقلا کا
طریقہ نہین ہے کہ اپنی اور اوسکی معقولون پر نکتہ چینی کرین بلکہ مشرقی لوگونکا طریقہ ہے
——— یا بہ تبدیل الفاظ ہم اس مطلبکو اسطرح بیان کرسکتے ہین کہ آنحضرت کو ایک
شارع مذہب اور مستقل ملت خیال کرنا چاہیئے ———

جہانِ ودود

◉ یادداشتہاے ودود



قاضی صاحب ہمارے عہد کے سب سے بڑے اردو دانشور تھے۔ اپنے پیچھے انھوں نے اچھا خاصا تحریری سرمایہ چھوڑا ہے۔

آخری زمانے میں عالم یہ تھا کہ لکھتے تھے اور ادھر اُدھر ڈال دیتے تھے۔ کبھی کبھی اسی نوشت کے سامنے نہ رہنے کے سبب دوبارہ، سہ بارہ لکھتے تھے۔ انگنت موضوعات پر ان کی یہ یادداشتیں ہزاروں چھوٹے بڑے پرزوں کی شکل میں موجود ہیں۔ انھیں وقتاً فوقتاً پیش کیا جاتا رہے گا شاید کوئی چیز کسی کے کام آجائے۔ ان یادداشتوں میں کئی ایسی ہیں جو کسی نہ کسی مضمون کی شکل میں آچکی ہیں، کچھ بالکل نئی چیز ملیں گی

———• ادارہ

آسفتہ، آرنگ، آوازگشتن کی تحقیق

— آلغنہ (ع ھ) لوغیت مستور، نہ در عبارات ، ونہ بر زبانہا مشہور،
) اگر واقعی ایسا ہوتا، تو اردو میں الغنا اس سے نہ پیدا ہوتا۔ اسناد: معیار
"ز احداث فلک آلغنہ باشد شائی" "لمن آلغنہ را تماشا کن (مصطلحات، گم
شدہ کے نطلبا دیوان شائی میں نہیں ملا۔ محو قی کی ایک سند بہار عجم ا ھ میں ہے، در
یہ ہیں: لوای آلغنگان را یاور مولس ، آلغنگی " کلیات یغما میں یہ فقرہ نظر
وقتی آلغنہ سامان دلوی خدایی کرد، قاآنی
چہ شود گر شود ز رحمت تو مستفیض این روان آلغنہ
فرہنگ معین میں آلغنش و آلغنہ دونوں ہیں، آلغنہ = آشفتہ پریشان

— آرنگ (ع ھ) برہان میں ایک معنی پنداری۔ قاطع میں غالب سنہ کی مطالب بمعنی
میں شہر دو کی دیکھا، تو قاطع ۲ میں لکھا کہ آرنگ = ہرگز نہ = پنداری

— آوازگشتن (ع [illegible]) = مشہور گردیدن (برہان) " بلند آوازگشتن بمعنی
شہرت متم، تنہا آواز یا آوازہ گشتن بمعنی شہرت شہرت ندارد۔ نلین شنیدہ ام، ونہ
کسی شنیدہ باشد (قاطع ا محرق میں شعر فخر گانی بوجہ انگیزی میں بھی نہ دیکھا
تو قاطع ۲ میں یہ اضافہ کیا: اگر گفتہ آید کہ فخر گرگانی ہمیں فرمایند:
اگر نومید زین در باز گردم بہ زشتی در جہان آواز گردم
گویم گو ہیم این نادرا کت دیرنا در حکم نتوان کرد ، کلامیکہ ہمین در قلم مذکور باشد ز ان نیز
خلاف عقیدۂ جمہور باشد، پذیرفتن آن کدام شعور باشد؟ نہ در گفتار معاصرین فخر ازین
ترکیب نشان ، ونہ آنا نکہ بعد ازوی در فن سخن گوئی آنا دلاویزی بلند آوازہ ساختہ اند
این کلمۂ غریب بر زبان"
فخر کی دلیس و رامین میں " آواز گردم" بی ایک شعر آیا ہے، یہ = آواز شوم ہے
ہمی گفتی ہم اکنون باز گردم ھ بہل تا در جہان آواز گردم

لفظ بابو اور بیبی کے بارے میں

— بابو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں بنگال و بہار میں زیادہ رائج ہے۔
اردو کے ۲ شعروں میں مجھے ملا ہے اور دونوں کلیات جرأت ۲ (مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن)
میں ہیں ایک مثنوی راجہ ونجری میں ہے اور ایک سلیمان شکوہ کی ایک غزل میں آیا ہے اور
جس کی تخمیس جرأت نے کی ہے:

کہا درویش نے آ بیٹھ بابو ۶۳ بتا مجھ کو کہاں سے آیا تو
کریں ہیں خلق سے رسم شگفتہ آ ہو ۲ کہے ہے عرض جب کرتے ہیں اہیر
امیری داتا بڑا ہے ان کا بابو نہ سمجھو یہ کہ شاں تم اس کو بابو
فقیروں کا بڑا ہے مرگ چھالا
بچھا دو

بابو ایرانی فارسی میں ملتا ہے۔ پر نہ سمجھا کہ ایران میں ہندوستان سے گیا ہے۔ وہاں باب = پدر
پر اضافہ "و" سے قبل ہم دعمکو بنا ہے۔ اسرار التوحید
میں جو
صدی ہجری میں تصنیف ہوئی ہے ابو سعید کے والد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بابو ابوالخیر کہلاتے
بابو فرہنگ معین میں بھی ہے۔

— بیبی۔ مدت ہوئی میں نے ایک انگریزی مجلے میں شرقی ترکی کے الفاظ دیکھے تھے، ان میں سے ایک
بیبی بھی تھا، مگر بیبی زوجہ نہیں۔ دوسرے معانی کے ساتھ (ترکی) بیبی اسی کی مشتق ہے اور اس
میں بھی بیبی زوجہ نہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں یہ فارسی ہے۔ یہی مذکور ہے معانی دیگر بحر سند قدیم ترین
کتاب میں اسی معنی میں آیا ہے۔ فضلی کی کربل کتھا ہے۔ امام حسن نے اپنی زوجہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

لفظ 'امرود' کے بارے میں

اس دلیل میں اپنی [illegible] امرود ناشپاتی ہے (مخزن
الادویہ ص [illegible]) قدیم ترین کتاب [illegible] بابری ہے جس کا ترجمہ
عبدالرحیم خانخاناں نے کیا ہے۔ میری نظر سے گزرا ہے۔ اس کے چوتھے یا پانچویں صفحے میں یہ لفظ ہے
میں پروفیسر نذیر احمد کا ممنون ہوں کہ انھوں نے ازراہ مہربانی اصل نسخے ([illegible]) کی فوٹو
کی نقل منگوا دی اور میرے خیال کی تصدیق ہو گئی کہ یہ اس میں ہے۔ ایرانی شاعر نوعی خبوشانی یہاں آیا تھا
اس کے دیوان میں یہ مصرع ہے "این امرود نہ ناشپاتی و سیب و انار و بہی است"، شعرای اردو میں سودا
نے کہا ہے کہ یہاں یہ آیا ہے۔ [illegible] کی والدہ صاحبہ پٹنہ آئی تھیں تو ان کو معلوم ہوا کہ یہ مغربی ایشیا کا
لفظ ہے۔ فرہنگ معین: "[illegible] گلابی" [illegible] میوہ ہای الوان فراوان
[illegible] ناشپاتی و بادام و فندق و گیلاس [illegible] تاریخ بخارا [illegible] میوہ ایست مشابہ امرود
در زردی فرہنگ آنندراج [illegible] میوہ [illegible] گلابی
وہ پھل ہے جو عربی میں کمثری ہے اور انگریزی میں Pear - فرہنگ آنندراج میں جس پھل کو [illegible]
بتایا ہے وہ کو ادا ہے جسے [illegible] امرود کہتے ہیں ([illegible]) [illegible]

ٹی-ایس ایلیٹ، مولوی عبدالحق

کرکسن کی بیطلقی موت کا باعث ہوئی کسی طرح ایک اچھا مادہ تاریخ نہیں کہا جا سکتا، زمانۂ وفات کے
متعلق اپنی رائے پر اب بھی قائم ہوں

ایلیٹ نے جو ایک سرآوردہ فنکار اور نقاد تھے پرانے متنوں کی ترتیب کو بڑا اہم
کام سمجھتے ہیں اور اس کے مقابلے میں ان کے نزدیک ایمپریسو ایسٹ کچھ نہیں۔ اہمیت سے انکار نہیں
کیا جا سکتا، لیکن یہ کام ان لوگوں کا ہے جو اپنی ذہنی تربیت لینا چاہتے ہیں اور جو اس کا اہل نہیں اس کی ہمت افزائی
خود کسی زمرے میں ہو، ایک اخلاقی جرم ہے۔ اردو کی بدقسمتی ہے ہندوستان و پاکستان میں (تری) اکثریت
اس کام کو اپنی ذمہ داری سمجھنے والوں کی ایسے لوگوں کی ہے جو نااہل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق کی مرتب کی ہوئی کتابوں پر میرے تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔ تذکرۂ گردیزی کے متعلق
اب تک میں نے کچھ نہیں لکھا۔ اس کا حال دیکھیے۔ پاکباز کے ترجمے کے بعد اپنی روش کے مطابق ان کے اشعار
پیش کیے ہیں جن میں سے ایک کے متعلق لکھا ہے کہ یہ خوشگاہ قزلباش خاں کا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے دیا
اور اس کو پاکباز کے چھنے شعر ہیں[۱] قزلباش خاں کی طرف منسوب کر چکے ہیں، اسی جگہ ~~انھی خوشگاہ~~
~~لکھوئیں بھی انھیں شامل کر لیا۔~~ حال تو یہ کہ ان کا ذکر اور فہرست شعرا میں بھی یہ داخل ہیں
حالانکہ اگر انھیں گردیزی کو یہ منظور ہوتا تو الف یا قاف میں ان کا ترجمہ یا اشعار
یا صرف اشعار مع نام و تخلص درج کرتے۔ نہ معلوم ڈاکٹر عبدالحق خوشگاہ کو کیا سمجھے
گردیزی نے اسے پسندیدہ کی جگہ استعمال کیا ہے۔

(۱) [illegible]

دیوان یقین مرتبہ فرحت اللہ بیگ

دیوان یقین

دیوان یقین مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے مرتب کیا تھا اور اس پر ایک طویل مقدمہ (   ) لکھا تھا جو بعض احباب کی رائے میں تحقیق و تدقیق کا ایک شاہکار ہے۔ مرزا صاحب کی انشا پردازی اور ظرافت مسلم ہے، لیکن اس مقدمے میں یا کہیں اور تحقیق و تدقیق کا حق ان سے ادا نہیں ہو سکا، اور نقاد کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بلند نہیں۔

لفظیات ناسخ: سراج نظم سے

ناسخ دبستانِ لکھنؤ کے بانی کی ایک مثنوی "سراج نظم" ہے جو ۱۲۵۴ھ میں تمام ہوئی، نام تاریخی ہے۔ اسی سال ناسخ کی وفات ہوئی۔ اس میں ایک عربی کتاب کے مطالب نظم ہوئے ہیں۔ اس میں بکثرت عربی الفاظ ہیں جنھیں اردو نے قبول نہیں کیا۔ بطور مثال کچھ یہیں اور یہیں تو کہیں سے نا —

— ہالک "ایک لفظ شعر میں آیا ہے" ہیں ازل و ابد کے یہ مالک ص۳۱ یہی باقی ہیں اور سب ہالک" یہ بات کہ سب ہالک ہیں بجز خدا قرآن میں ہے، ناسخ کا قول صریحاً قرآن کے خلاف ہے

— لائح "کب سرابی تخمیس (۵۵) ہیں واضح ہے آنکھ ار او واضح ولائح" — تلال "یہ جواہر جو ساری بہشتی ہیں ص۸ ہیں تلال جرال ہیں یکجا" — لبن "فایدہ مشہر تھا جو شرب لبن" ص۹ — طالح "منتقل ہو کے دو مصالح کا ص۱ شخص طالح کا شخص صالح" — ادوات "ہوئی آ دوات ہمہ تن ہیں پوشیدہ ص۱۳" — بلع "ہیں ممد وقت بلع آب و طعام" ص۱۷ — اوجاع "ناخن و مو جو ہوتے ہیں اکثر ص۱۸ رنج و اوجاع ہوتے ہیں باہر" — استیلاء "ہوا داخل میں بعد استیلاء" ص۱۹ — تانّی "وجہ تدریج کی تانّی کی" (تانّی میر کے یہاں آیا ہے) نامانوس عربی الفاظ سراج نظم میں اور بھی ہیں

دساتیر

دساتیر کہتی ہے کہ فردوس جہاں فرازیں جہاں کو حکم ہوا ہے۔ پہلا ایک ستارہ دو ہزار برس تک تنہا جہان
فردوس کا بادشاہ رہتا ہے۔ اسی کے بعد ہزار سال کے لیے ایک دوسرا ستارہ حکومت میں اسی کا شریک
ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نوبت بنوبت ہر ستارہ ہزار ہزار سال بادشاہ اول کا شریک رہتا ہے۔ سیارے
بھی اسی میں داخل ہیں۔ اور قمر کی شرکت پر بادشاہ اول کی حکمرانی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور قمر ہی کا پہلا
شریک ہزار سال تنہا اور اسی کے بعد نوبت بنوبت ستاروں اور سیاروں کی شرکت ہوتی ہے۔ بادشاہ
اول کی طرح حکومت کرتا ہے اسی طرح ہر ستارہ و سیارہ تنہا اور شرکت بادشاہی کرتا ہے۔ یہاں تک
کہ بادشاہی تمام ہو جاتی ہے اسی پر ایک "جیس چرخ" = دور قمر کا خاتمہ ہے اور دوسرے دور کا آغاز
ہوتا ہے۔ تفسیر دساتیر کہتی ہے [illegible] چرخ [illegible] آید
[illegible] ستارہ [illegible] باشد [illegible]
[illegible] از [illegible] الست [illegible]
[illegible] ایشان [illegible] ایک [illegible]
[illegible] دساتیر [illegible]
[illegible]

مدظلہ العالی رحمۃ اللہ علیہ

تھا۔ اور حضرت نے تحریر فرمایا۔ انہیں پرچے کا ٹائٹل بہت پسند آیا تھا۔ بلکہ تحسین فرمائی تھی۔ اور رباب کی جلد
میں بڑی طرح رنگ و گت بنایا کرتی تھی۔ ۱۹۶۳ء میں جب یہ بھی درویش صاحب سے کلکتہ چلے گئے تھے
ایک روز مجھ سے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میں اردو کی خدمت کرنا چاہتا ہوں میری کیا رائے ہے ارادہ
شروع کرو۔ اس کے بعد پھر شغل ہو رہا۔ ایک رسالہ [illegible] کا بھی [illegible] پہلا شمارہ تھا
اور اس کے سرورق پر لکھا ہوا تھا "یادگار حضرت استاذ شاہ رحمۃ اللہ علیہ مدظلہ العالی"
ہم نے تحریر بتایا کہ رحمۃ اللہ علیہ لوگوں کے مرنے کے بعد لکھتے ہیں اور مدظلہ العالی زندہ کے
زندہ فرمایا ہو [illegible] کہا جائے اب تو چھپ گیا۔ البتہ آئندہ چار پرچوں کے سرورق پر یہی
ہو گئے۔ اور جلد ہی مرحوم رسالے کا پہلا شمارہ اس کا آخر شمارہ ثابت ہوا۔ [illegible] اور خاص نمبر
۱۹۸۲ء میں نکلا جو ایک مختصر سا (کیا [illegible] بتایا کہ اس رسالے کا پہلا شمارہ تھا)
اور [illegible] چاہیے۔ سرورق پر جو تحریر تھا۔ "یادگار شیخ الاسلام والمسلمین حضرت
مولانا شاہ [illegible] حسن [illegible] رحمۃ اللہ علیہ (تحقیق [illegible] نمبر ہوا ہے)
دوسرے [illegible] گئے تو [illegible] کو بتایا کہ ان کا [illegible] ایک خاص [illegible] ہوا اور [illegible] حیات
ہیں [illegible] کہا کہ رحمۃ اللہ علیہ [illegible] ۱۹۲۱ کا [illegible] دیتے ہوئے
بولے صاحب اب تو یہ مستقل ٹیپ کا بلاک بن گیا ہے۔ اسے شائع کرنا پڑیگا۔ فی الحال اسی
طرح چلنے دیجئے۔ چنانچہ وہ اب تک اسی طرح چل رہا ہے اور وہ الحمد للہ اب تک
بقید حیات ہیں۔

آل احمد سرور، اردو ادب' آزاد نمبر

( ) [illegible] آزاد' [illegible] اور انگریز پرستی [illegible]
[illegible] آل احمد سرور آزاد [illegible] اردو ادب [illegible]
[illegible] کا کلکتہ میں دلچسپ شمارہ" کے عنوان سے
ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر [illegible] نقل کی ہے جس میں عبارات ذیل
موجود ہیں :

وہ آپ (یعنی برادر آزاد) کے [illegible] مقالہ "امن" کی صفحوں میں
[illegible] کی [illegible] ہوتی ہے اس قلم کی
وجہ سے [illegible] ہماری [illegible]
آزادی کی [illegible] سلطنت کرتا [illegible]
[illegible] اور [illegible]
[illegible] آزاد [illegible]
[illegible] آج بھی [illegible]
تمام [illegible] باوجود [illegible]
مذہب [illegible] (کلام) [illegible] آزادی کی
[illegible] آزادی اور اہل [illegible]
[illegible] ۱۹۱۸ء

آزاد نمبر میں ایک نظم بھی ہے جو ایڈورڈ ہشتم کی تاجپوشی کی تقریب پر لکھی گئی
تھی یہ "انگریز پرستی" نہیں تو اور کیا ہے؟ سرور صاحب کو [illegible] مدیر
ہونے کے باوجود اردو ادب کے مضامین کو پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔

کمزور دماغ صاحب [illegible] ضرورت کے بعد یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے
آزاد ہند کی زیر اشاعت [illegible] قبل [illegible] ہندوستان [illegible] میں کہا تھا
کہ لسان الصدق میں جو کچھ آزاد کا رسالہ تھا ان میں ایک تحریر
میں مولوی عبد الحق [illegible] پر مسئلہ کہ ان کے نزدیک اردو میں مستقل کا عنصر
ایک ہندوستانی ہوتا اور سید احمد خاں مسلمانوں کی سیاسی نجات دہندہ
میں نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ یہ تحریر [illegible] کی الناظر میں لسان الصدق
سے نقل کی جا رہی ہے۔ یہ کالم [illegible] سالنامہ مگر وہ ان کی نظر سے گزرا
یا نہیں۔ بہرحال یہ آزاد ہند کی قبل [illegible] ہوا تھا۔ میں نے اردو
ہند کی تحریر دیکھ کر مولوی عبد الحق کی [illegible] ادب [illegible] تحریر
تھی کہ وہ اپنی [illegible] کا اعتراف کریں۔ انھوں نے جواب میں لکھا
کہ لفظ "ہندوستانی" [illegible] باوجود اس کے ہماری زبان
[illegible] نکلتا ہے اور ایک [illegible] آزاد ہند کی [illegible]
[illegible] ان کی [illegible] کچھ لکھنے کی ضرورت [illegible]
[illegible] تحریر [illegible] تبدیل [illegible] کچھ برائی [illegible] اور اس میں کچھ
برائی [illegible] کہ [illegible] ایک [illegible] خیال [illegible]
[illegible] یا [illegible] کہا جاتا تھا کہ [illegible] کی [illegible] جو
[illegible] یہ [illegible] کہا کہ [illegible]
کے [illegible] یہ [illegible] میں
[illegible]

ابوالکلام آزاد پر کچھ یادداشتیں

۳۔ تذکرہ ص ۱۴ "۱۸۹۸ تا ۱۸۹۹ء میں یعنی دس گیارہ برس کی عمر میں انھیں شعر گوئی
کا شوق پیدا ہوا .. ایک علیمہ [illegible] کی رہنے والی تھی .. علیمہ کا بھائی عبدالواحد
خاں کبھی کبھی اس سے ملنے آیا کرتا تھا .. یہ .. شعر بھی کہتے اور ادیب تخلص کرتے
تھے۔ انھیں کی باتوں سے مولانا آزاد کو شعر گوئی کی ترغیب ہوئی۔ آزاد تخلص بھی عبدالواحد
خاں ہی نے تجویز کیا تھا (حاشیہ آزادی کی کہانی ۲۳۹) .. وجہ یہ بھی کہ .. گلدستوں
میں شعرا کا کلام ان کے تخلص کی املائی ترتیب سے چھپتا تھا' اس لیے ان کا نام بالکل
آغاز میں چھپا کرتا تھا مولانا .. کی پہلی غزل بمبئی کے ایک گلدستے ارمغان فرخ میں
چھپی تھی"

بیان المخصاص ۲ تا ۴ : سولہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگیا، اسی کے کچھ بعد
میں سرسید احمد خاں کی تحریروں سے پہلے پہل آشنا ہوا' اور جدید تعلیم کے متعلق ان کے خیالات
کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ میں نے انگریزی سیکھنی شروع کی' اور جلد ہی اس زبان سے اتنی واقفیت
حاصل کر لی کہ انگریزی کتابیں پڑھنے لگا' خاص طور پر فلسفہ و تاریخ کا مطالعہ
کرنے لگا۔ یہ میرے لیے بڑے ذہنی بحران کا زمانہ تھا' پرانے عقائد کے خلاف اپنے
اندر بغاوت کا احساس پیدا ہوا۔ پہلی بات جس نے مجھے پریشان کیا مسلمانوں
کے مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات تھے۔ سب کا منبع ایک ہے، تو اتنی نزاع کیوں
اور اس کی کیا وجہ کہ ہر فرقہ دوسرے فرقوں کو [illegible] قرار دیتا ہے۔ ان
پر غور کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مذہب کے متعلق شکوک پیدا ہونے لگے۔ ان اختلافات
دو تین سال بڑی بےچینی میں گزرے' اور بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ پرانے عقائد کچھ نہیں مجھے اپنی راہ
خود ڈھونڈنی چاہیے۔ یہ
کہ میں نے آزاد تخلص اختیار کیا
کا فیصلہ کیا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ میں موروثی عقائد کا پابند نہیں رہا۔

گذارش/گزارش، کاغذ، ماتم، ماتمی

— گذارش، گزارش

— گزارش، گذارش اول گزاردن کا حاصل مصدر، آخر گذاشتن کا، اور دونوں کے معنی مختلف ہیں (دیکھیے فرہنگ عین) اوّل اردو میں مستعمل تھا، اور ہے، آخر کا اردو سے کچھ علاقہ نہیں۔ گزارش پہلے سب لوگ زے سے لکھتے تھے، مگر ذال فارسی کے متعلق غالب کا بنایا ہوا طلسم ٹوٹ گیا، تو کچھ لوگ اسے ذ سے لکھنے لگے ہیں

— کاغذ کو عربی سمجھنے کے باوجود غالب ذ سے لکھا کرتے تھے کہ یہ کہ دال یا زے سے لکھنا تو لوگ مسخرہ بنا دیں گے، حالانکہ قبل اس کے کہ یہ بات ان کے قلم سے نکلے، وہ ماں کی گالی درج ہے اور پہلے تھے کاغذ کو اگر دہ دال سے لکھتے تو اس کی سند مثنوی رومی "این ہمہ" کی مصرع ہے "مثنوی مہا دیتا کاغد شود" دوسرے مصرع کا اچھی طرح یاد نہیں رہا ہے۔ کاغذ اصلاً چینی لفظ ہے، شکل مختلف زبانوں سے عربی آیا، اور عربی سے عرب

— ماتم (= ماتم) عربی لیکن، غالب اسے فارسی سمجھتے تھے، چنانچہ یہ دستنبو میں آیا ہے۔

— ماتمی عربی فارسی اور فرہنگ میں ہے (اور عرفی کے ایک قصیدہ کا یہ شعر ہے:
ہمہ را ماتمی دولت دنیا دیدم   چون بحر گلدہ گرد سمان زدیم
آصفیہ میں یہ اردو، مگر اس میں کوئی سند نہیں پیش ہوئی۔ کلیات میر میں یکے

بعد دیگرے یہ اشعار ہیں:

اڑتے پھرتے ملتا نہیں ہم سے تو کبھی خرمی کا ۱۱۲۶ پھیر آتے یا ہما کہ بدر میں جامہ ماتمی
ہی ابرار شاہی اپ آنکھوں پیرہا انداز سے گردوں طوفان پیوں میں یہ دردآں ماتمی ۱۱۱۰

گزارش، کاغذ، غنچہ پیشانی، قشعریرہ وغیرہ

[illegible]

۳۴ — گزارش حاصل مصدر "گزاردن" کا ہے اور اردو میں مستعمل تھا، اور "گذارش" "گذاشتن" کا حاصل مصدر اردو میں مستعمل تھا، لیکن دونوں کے معنی مختلف ہیں (فرہنگ آصفیہ)۔ لوگ گزارش کو زے ہی سے لکھا کرتے تھے لیکن ذال فارسی کی اصطلاح غالب کا بنایا ہوا طلسم ٹوٹ گیا، تو بہت سے لوگ گزارش کو بجائے زے ذال سے صحیح سمجھے گئے

۳۵ کاغذ کو فارسی سمجھنے کے باوجود غالب ذال سے لکھتے تھے... "نسخۂ" شائع ہوا... وہ فارسی سے لکھتے تو مثنوی رومی کا ایک شعر سند میں پیش کر سکتے تھے۔ ایک مصرع یہ ہے "مثنوی ہفتاد تا کاغذ شود" دوسرا مصرع یاد نہیں۔ ... فرہنگ میں کاغد و کاغذ دونوں۔ کاغذ دراصل ترکی لفظ ہے ترکی میں اس کی شکل بدلی

۳۶ — غنچہ پیشانی "چین بر ابرو" ... صائب:

دور کمان سبز دارد پای حسن نو بہار — "تا گلی در باغ داری غنچہ پیشانی مباش"

(چراغ ہدایت، مؤلفہ خان آرزو) — یہ معنی فرہنگ میں نہیں ہیں۔ کلیات میر جلد ا (شائع کردہ) کے ۳ شعروں میں آیا ہے۔ اس قابل ہے کہ شعرائے اردو اسی استعمال کو رہنے دیں

۳۷ قشعریرہ (...مفتوح، ش مضموم) (ق مضموم، ش مفتوح، ع ساکن، ر مکسور، ی معروف، ر مفتوح، عربی میں حرف آخر ۃ) کلیات میر میں دو جگہ آیا ہے، اور معنی نے اسے استعمال کیا ہے دونوں جگہ یہاں ش ساکن، ع متحرک۔ اردو میں استعمال ٹھیک یہی کیا ہے ... مولانا کی صحرائی ... ۳۵ ... شعروں کو اس جگہ پر ہوتا ہے قشعریرہ

— چودانی ایک زیور ہے۔ اس کی جمع چودانیاں ہے اور خاص صورتوں میں چودانیوں۔ کلیات ذوق، مرتبہ ... تنویر احمد علوی میں یہ مصرع ہے "دیکھو شب گو تری چودانیوں میں" ۴۴ ص

مکتوبات غالب سے لفظیات

مہاراج ۱، بھائی ۲، شفیق بالتحقیق ۵، بندہ پرور، کاشانۂ دل [illegible] ۔۔۔ صاحب ۱۹، منشی صاحب ۲۵، از عمر و دولت برخوردار باشند ۳۰، جان من و جانان من ۳۲، میرزا تفتہ ۳۵، جیتے رہو اور خوش رہو ۳۶، نور نظر و لخت جگر ۴۵، مشفق میرے، مکرم میرے، میرے کرم ۵۰، برخوردار ۵۸، اجی مرزا تفتہ ۶۴، میاں ۷۲، میری جان ۷۵، ۷۸، برخوردار سعادت آثار ۷۹، برخوردار میرزا تفتہ ۸۳، میاں مرزا تفتہ ۸۸، مرزا تفتہ صاحب ۸۸، صاحب ۹۶، حضرت ۹۹، بھائی صاحب ۱۰۴، نور چشم غالب از خود رفتہ مرزا تفتہ ۱۰۶، آؤ میرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ ۱۱۰، منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی ہرگوپال صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ ۱۱۱، میری جان میری جان میرزا تفتہ سخندان ۱۱۸، لو صاحب ۱۱۲، میرزا تفتہ صاحب

اصلاح کلام

دیوان تفتہ کی [illegible] جو غالب [illegible] کی اصلاح تفتہ [illegible] مطلع بھی [illegible] غالب نے لکھا کہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
زشت تھا [illegible] دیکھا [illegible] خوش تھا [illegible] کر دو [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] ۹۱ [illegible]
[illegible] ۹۴ [illegible] ۹۵ [illegible]
[illegible] ۱۰۰ [illegible]
[illegible]
۱۰۱ [illegible] ۱۰۲ [illegible] ۱۰۳ [illegible] ۱۰۴
[illegible] ۱۰۵ [illegible] ۱۰۶ [illegible]
[illegible] ۱۰۷ [illegible] ۱۰۸ [illegible] ۱۲۱ [illegible] ۱۲۲

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

جہانِ آزاد

◉ فتنہ ارتداد اور مسلمان

● ——— مولانا ابوالکلام آزاد



جب شدھی اور سنگھٹن کی تحریک ۱۹۲۳ء اور بعد کے سالوں میں سوامی شردھانند کی قیادت میں زور و شور سے چل رہی تھی، اس موضوع پر اسی زور شور سے پریم چند اور ان کے ہم خیال اہل قلم (اور کچھ اختلافی رائے رکھنے والوں) نے رسالہ "زمانہ" کے ذریعہ اپنے خیالات قوم کے سامنے رکھے۔ یقین ہے ان تحریروں کا اچھا ہی اثر ہوا ہوگا۔ خدا بخش لائبریری نے "زمانہ" کے ان تمام مضامین کو 'ہندو مت (ج ۳) میں جمع کر دیا ہے۔ پریم چند کے علاوہ جنھوں نے اس بحث کا آغاز کیا، سریرام، عبدالحق، سحر ہتگامی، چودھری، پربھو دیال مصر عاشق لکھنوی، سسرو نوید تا لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

ابوالکلام آزاد نے بھی اس سلسلے میں ایک مضمون لکھا تھا جو غلام رسول مہر کی مرتبہ تبرکات آزاد میں شامل ہے۔ اسے خدا بخش کی کتاب 'ہندو مت' (ج ۲) کے اس باب کے تکملہ کے طور سے جہانِ آزاد کے تحت پیش کر دینا مناسب لگا۔

—— ع ر ب

فتنہ ارتداد اور مسلمان

آگرہ کے آس پاس ایک گروہ راجپوتوں کا مقیم تھا جنھیں ملکانہ راجپوت کہتے تھے اور ان کی تعداد چار لاکھ کے قریب تھی۔ یہ لوگ خدا جانے کب مسلمان ہوئے ۱۹۲۳ء کے اوائل میں ہندوؤں نے انھیں از سر نو ہندو بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ آریہ سماج نے یہ سلسلہ جاری کیا اور سوامی شردھانند اصل تحریک کے لیڈر تھے۔ غالباً ابتدا میں اسے بہت مخفی رکھا گیا مگر اوائل مارچ میں راز منکشف ہوگیا۔ اس پر مسلمانوں میں بڑی سراسیمگی پیدا ہوئی اور بہت سی تبلیغی جماعتیں اطراف ملک سے آگرہ پہنچ گئیں۔ یہ واقعہ بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کا ایک بہت بڑا موجب بنا۔

تحریک ترک موالات پر پہلی ضرب اس وقت لگی جب گاندھی جی نے چوری چورا میں پولیس کی چوکی پر عوام کے حملے سے متاثر ہوکر اعلان کیا کہ ملک میں ابھی تک عدم تشدد کی فضا پیدا نہیں ہوئی۔ اس بنا پر مجوزہ سول نافرمانی غیر معین مدت کے لیے ملتوی کی جاتی ہے۔ اس سے مختلف حلقوں میں افسردگی و دل شکستگی پیدا ہوئی۔ حکومت نے گاندھی جی کو گرفتار کرکے چھ سال کی قید کی سزا دیدی۔ تحریک پر دوسری ضرب فسادات سے لگی۔ ملکانہ راجپوتوں کو ہندو بنانے کی تحریک نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ہندو کسی بھی حالت میں مل جل کر کام کرنے کے خواہاں نہیں۔ چنانچہ فضا اتنی بگڑی کہ پھر وہ ۱۹۲۱ء کے انداز پر نہ آسکی۔ جہاں تک نفس مسئلہ کا تعلق ہے، مسلمانوں کے لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس بات پر معترض ہوں۔ ان کیلئے صرف ایک ہی بات صحیح اور برمحل ہوسکتی ہے۔ وہ بھی اپنا مذہبی فرض انجام دیں اور ملکانہ راجپوتوں کو اسلام میں مضبوط اور مستقل بنانے کی کوشش کریں۔ اپنے کام سے غفلت کرنا اور غفلت کے جب قدرتی نتائج پیدا ہوں تو غیروں کا گلہ کرنا نہ تو عقل و دانائی کی بات ہے نہ عزت و شرف کی۔

ملکانہ راجپوتوں کا معاملہ:

لیکن موجودہ مسئلہ حق اور آزادیٔ انتخاب کا سوال نہیں ہے۔ معاملے کے جس پہلو نے عام جذبات پر اثر ڈالا ہے وہ دوسرا ہے ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یا کوئی جماعت اپنی پسند سے ایک مذہبی حلقہ چھوڑ کر دوسرا اختیار کر لے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس غرض سے ایک آرگنائزڈ (منظم) اور جماعتی کوشش بہ طور ایک مومنٹ (تحریک)

کے شروع کی جائے۔ آریہ سماج کی جانب سے جو کوشش شروع ہوئی ہے وہ دوسری قسم کی ہے۔ پہلی صورت نہیں ہے قدرتی طور پر اس کے اثرات پہلی صورت سے مختلف شکل میں نمایاں ہوں گے میں پورے وثوق کے ساتھ رائے رکھتا ہوں کہ جن لوگوں نے موجودہ وقت میں یہ تحریک شروع کی، انھوں نے ملک کا عام مفاد نظر انداز کر دیا۔ ان کا فرض تھا کہ اس بات سے غفلت نہ کرتے اور سمجھتے کہ اس وقت ان تمام باتوں سے احتراز کرنا چاہیے جو ملک کے جذبات اور توجہ کو ملکی اتفاق اور مشترک جدوجہد سے ہٹا کر کسی اشتعال انگیز مقصد کی طرف لے جائیں۔ یہ بات کہ سیاسی اور ملکی اتفاق ایک دوسری چیز ہے اور اپنی اپنی مذہبی تبلیغ کی سرگرمی دوسری چیز، ایک کا اثر دوسرے پر نہ پڑنا چاہیے، کتنی ہی معقول اور صاف ہو لیکن عملی طور پر قوموں اور جماعتوں کی سائیکلوجی (نفسیات) پر منطبق نہیں ہوسکتی۔ میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ جن لوگوں نے یہ تحریک شروع کی، انھوں نے ملک کی متفقہ فضا کو مکدر کرنے اور عام جذبات کو ہیجان میں لانے کی بہت بڑی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ سوامی شردھانند کہتے ہیں کہ ملکانہ راجپوت دراصل ہندو ہی ہیں۔ ہندوؤں نے اب تک چھوڑ رکھا تھا۔ اب شدھی کرنے سے یہ مقصد ہے کہ بہ طور ہندو رک آگنائز (تسلیم) کر لیا ہے۔ میں ان کی بات تھوڑی دیر کے لیے مان لوں گا اور کہوں گا کہ اگر یہ صحیح ہے تو ان کا پہلا کام یہ تھا کہ ان کروڑوں اچھوت جماعتوں کی خبر لیتے جن کی مظلومانہ حالت نہ صرف ہندستان بلکہ تمام نوع انسانی کے دامن پر وحشت وقساوت کا سب سے بڑا دھبّا ہے کیا وہ اس کام سے فارغ ہو گئے ہیں کہ اب ان کے لیے صرف ملکانہ راجپوتوں ہی کا ایک میدان عمل باقی رہ گیا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرائض :

بلاشبہ معاملہ کا یہ پہلو ایسا ہے جسے ہم افسوس کے ساتھ محسوس کرتے ہیں لیکن صرف محسوس ہی کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہ کچھ کر سکتے ہیں اور نہ بہتر ہے کہ کرنا چاہیں۔ یہ بات مسلمانوں کے سوچنے کی نہ تھی۔ ان لوگوں کے سمجھنے کی تھی جنھوں نے یہ کام شروع کیا ہے اب بھی صرف انہی کے سمجھنے کی ہے یا ملک کے ان ہندو لیڈروں کے غور کرنے کی ہے جن سے حقیقت حال پوشیدہ نہ ہونی چاہیے۔ مسلمانوں کو نہ چاہیے کہ شکوہ و شکایت کریں یا اپنے لیے کوئی ایسا پوزیشن (رویہ) اختیار کریں جس سے توقع اور خواہش نکلتی ہو۔ یہ کام شروع نہ کیا جاتا تو بہتر تھا لیکن جب شروع کر دیا گیا ہے تو مسلمانوں کے لیے صرف ایک ہی چارۂ کار رہ گیا ہے، یعنی وہ بھی اپنا فرض سکون اور خاموشی کے ساتھ انجام دیں۔ دوسروں کے لیے یہ نیا قدم ہے لیکن ان کے لیے ان کا اصلی اور دائمی فرض ہے اگر انھوں نے اپنا فرض ادا کیا ہوتا تو آج یہ نتائج پیش نہ آتے۔

حالات کا نقشہ :

دوسرا مسئلہ ان حالات کا ہے جو اس تحریک کے سلسلے میں وہاں پیش آ رہے ہیں عام مسلمانوں کے دلوں پر

جو چیز زیادہ اثر ڈال رہی ہے، وہ صورتحال یہ ہے کہ ملکانہ راجپوتوں کا ایک پہلا گروہ اس بات کے لیے تیار کر لیا گیا تھا کہ شدھی ہونا قبول کرے، وہ ہوگیا۔ اب باقی جماعتیں اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں۔ ایک طرف شدھی سبھا اور وہ لوگ ہیں جو شدھی ہوگئے ہیں اور دوسری طرف اپنی قدیم حالت پر قائم ملکانہ راجپوت ہیں۔ پہلی جماعت کوشش کر رہی ہے کہ سب کے سب شدھی ہونا قبول کرلیں، دوسری اس بات پر جمی ہوئی ہے کہ اپنی قدیم حالت پر باقی رہے تیسری جانب وہاں کی قدیم ہندو آبادی ہے اور قدرتی طور پر وہ پہلی جماعت کے ساتھ ہے یہ بالکل واضح ہے کہ جب کبھی ایسی صورتحال پیدا کی جائیگی تو ضرور کشمکش اور جبر واکراہ کی صورتیں پیدا ہوجائیں گی۔ مذہب اور قومیت کے معاملہ میں کبھی انسان حق وانصاف کے حدود کے اندر نہیں رہ سکتا۔ قدرتی بات ہے کہ جو لوگ شدھی کرنیکے خواہشمند ہیں، وہ ہر طرح کے وسائل کام میں لائیں گے جو ہوگئے ہیں وہ ضرور چاہیں گے کہ کسی نہ کسی طرح دوسروں کو بھی اسکے لیے مجبور کریں۔ اطراف کی ہم مذہب جماعتیں بھی پوری طرح اپنا زور لگائیں گی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ طرح طرح کی حق تلفیاں ہونگی، جبر واکراہ سے کام لیا جائیگا ناجائز دباؤ ڈالا جائیگا، ناجائز ترغیبیں دی جائیں گی اور اس طرح ایک پوری آبادی امن وسکون اور معاشرتی عافیت کی جگہ بدامنی وکشاکش میں مبتلا ہوجائیگی۔

کسی جگہ ننانوے آدمی شدھی ہوجائیں گے، ایک نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس پر کیا گزریگی؟ شوہر ہوجائیگا، بیوی نہ ہوگی۔ عجب نہیں اسے مجبور کرنے کے لیے طرح طرح کی سختیاں کی جائیں۔

شدھی سبھا سے سوال:

میں سوامی شردھانند اور شدھی سبھا کے ارکان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے ان خرابیوں کے روکنے کا کیا انتظام کیا ہے؟ اور کیا از روئے حق وانصاف اس کی ذمہ داری ان کے سر عائد نہیں ہوتی؟ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جب وہ ایک ایسے نازک اور مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر دینے والے کام کی دعوت لیکر اٹھے تو انھوں نے انسان کے حق وامن کے تحفظ کے لیے بھی اپنا کوئی فرض محسوس کیا یا نہیں؟ اگر از خود نہیں کیا تو جب کبھی کوئی ایسا واقعہ ان کے علم میں آیا۔ انھوں نے اس کے انسداد کیلئے کوئی کوشش کی۔

یہ معاملہ اس قدر واضح اور قدرتی ہے کہ واقعات کے ظہور سے پہلے ہی ہر ذی عقل اور انصاف پسند دماغ اس کی ضرورت تسلیم کرے گا، لیکن اب میں بتلانا چاہتا ہوں کہ یہ محض قیاس ہی نہیں ہے، واقعات کی شکل میں ہمارے سامنے آگیا ہے۔ اخبارات میں متعدد اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے جن کے ساتھ جبر واکراہ اور ناجائز دباؤ و ترغیب کی صورتیں پیش آئی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تمام واقعات صحیح ہیں یا نہیں؟ لیکن ان میں سے چند آدمی میرے سامنے بھی آگرہ میں آئے۔ انھوں نے اپنی اپنی سرگزشتیں سنائیں۔

دو جماعتوں کی زیادتی :

ان لوگوں نے دو جماعتوں کی طرف سے زیادتی کی شکایت کی۔ ان کی طرف سے جو شدھی ہو گئے ہیں اور ان ہندوؤں کی جانب سے جو وہاں پیشتر سے آباد ہیں۔ ایک مسلمان درزی کو میں نے دیکھا جو اپنی دکان اور مشین چھوڑ کر آگرہ بھاگ آیا ہے۔ اس کے گاؤں میں تمام آدمی شدھی ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اور پرانے ہندوؤں نے مل کر اسے مجبور کیا کہ وہ بھی ہو جائے۔ جب اس نے انکار کیا تو اس کا بیان ہے کہ مارنے پیٹنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ایک اور ملکانہ راجپوت ہے جو اپنی زمین اور مکان چھوڑ کر چلے آنے پر مجبور ہو گیا۔ اسکے گاؤں میں اکثر خاندان شدھی ہو گئے ہیں یہ نہیں ہوا اس لیے اسکے خلاف سب نے جتھا بندی کر لی۔ آخر مجبور ہو کر بھاگ آیا۔ اب اسکی زمین پر دوسروں نے قبضہ کر لیا ہے۔ ایک عورت پیش کی گئی جس کا تمام گاؤں شدھی ہو گیا ہے چونکہ وہ اور اس کا لڑکا شدھی نہیں ہوئے اس لیے وہاں کے آدمیوں نے ایکا کر لیا ہے کہ اسکی زمین پر کوئی آدمی کام نہ کرے۔ ایک دوسری جگہ کی نسبت بیان کیا گیا کہ شوہر شدھی ہو گیا، بیوی نہیں ہوئی۔ وہ دوسرے گاؤں کی ہے۔ شوہر نے اسے مکان میں بند کر دیا ہے اور مجبور کر رہا ہے کہ شدھی ہونا منظور کرے۔

کنور عبدالوہاب کا بیان :

آخری واقعہ کنور عبدالوہاب[1] نے شردھانند اور بعض دیگر ارکان شدھی سبھا کے سامنے بیان کیا۔ میں نے جب ان سے پوچھا تو انھوں نے تسلیم کیا کہ ایسا واقعہ ان کے سننے میں بھی آیا ہے، لیکن جو کچھ ہوا ہے لڑکی کے شوہر کی جانب سے ہوا ہے سبھا کے آدمیوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ باقی واقعات کا یہ حال ہے کہ جن آدمیوں کو گزرے ہیں خود انھوں نے میرے سامنے بیان کیا۔ مجھے اسکی مہلت نہ ملی کہ موقع پر جا کر تحقیقات کرتا۔ ان کا انداز بیان، حالات کا توافق اور میرے جرحی سوالات کے جوابات ایسے تھے کہ میں سمجھتا ہوں وہ اپنی شہادت میں جھوٹے نہیں ہیں انکے علاوہ ناجائز ترغیب اور دباؤ کے واقعات بھی بیان کیے جاتے ہیں، لیکن مجھے ذاتی طور پر ان کے سننے کا موقع نہیں ملا۔ میں انکی نسبت بطور تحقیق و شہادت کے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

کانگریس کے نائب صدر کی شہادت :

جس دن میں آگرہ پہنچا اسی دن سوامی شردھانند وہاں سے جا رہے تھے باوجود میرے اصرار کے وہ ٹھہر نہ سکے۔ میں نے مسٹر چاند مل سے جو آگرہ کانگریس کمیٹی کے وائس پریزیڈنٹ اور شدھی سبھا کے خزانچی ہیں پوچھا کہ ان کی سبھا نے آج تک کوئی کوشش ایسے واقعات کے انسداد کی کی ہے؟ انھوں نے تسلیم کیا کہ نہیں کی، البتہ وہ معترف تھے کہ ایسا کرنا چاہیے اور آئندہ کیا جائے گا۔

بلاشبہ معاملہ کا یہ پہلو ملک کے ہندو رہنماؤں کیلیے خاص طور پر قابل توجہ ہے انکا فرض ہے کہ اسکے انسداد کی کوشش کریں۔ یہ فرض آریا سماج اور شدھی سبھا کا تھا وہ اگر اس میں پوری نہ اتری تو ہندو پریس اور ہندو لیڈروں کا فرض ہے کہ جہاں تک ان کے حق و انصاف نے نظر دی ہمیں اپنا فرض انجام دیں مجھے یقین ہے کہ کوئی انصاف پسند ہندو اسے پسند نہ کریگا کہ غریب اور بے زبان ملکانہ راجپوتوں میں سے کسی ایک آدمی پر بھی اسلیے سختی ہو کہ وہ اپنی پسند اور مرضی سے اپنا اعتقاد بدلنا نہیں چاہتا۔ •——• (تبرکات آزاد : غلام رسول مہر ص ۲۰۸ — ۲۱۳)

[1] مشہور قومی کارکن تھے

اشاریے

سہ ماہی **فکر و نظر** (علی گڑھ) کا اشاریہ

ڈاکٹر ضیاءالدین انصاری

ڈاکٹر یوسف حسین نے جنوری ۱۹۶۰ء میں 'فکر و نظر' کے نام
سے علی گڑھ یونی ورسٹی کے پہلے علمی مجلہ کی اشاعت شروع کی۔
۱۹۶۵ء تک یوسف صاحب علی گڑھ کے پرو وائس چانسلر رہے
اور 'فکر و نظر' ان کی ادارت میں نکلتا رہا۔ ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر مسعود حسین
اس کے باقاعدہ ایڈیٹر ہوئے۔ ان کے بعد شعبۂ اردو سے اس کی
ادارت وابستہ رہی۔ ۱۹۸۷ء سے ایک مستقل انتظام کے تحت ڈاکٹر شہریار
اس کے ایڈیٹر ہیں۔ —— (ادارہ)

سہ ماہی **فکر و نظر** (علی گڑھ)

کا

اشاریہ

۱۹۶۰ء — ۱۹۹۰ء

ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری



علی گڑھ سے اردو کا تعلق بڑا قدیمی اور گہرا ہے۔ سرسید نے جب اپنی اصلاحی اور تعلیمی تحریک کا مرکز علی گڑھ کو بنایا تو اس کے اثر سے جدید اردو کا مرکز بھی رفتہ رفتہ علی گڑھ ہی بن گیا۔ سرسید نے اپنی تحریک کے ترجمان کے طور پر سرزمین علی گڑھ سے ہی ۱۸۶۶ء میں اخبار "سائنٹیفک سوسائٹی" جاری کیا۔ اس کے بعد یہیں سے انھوں نے ۱۸۷۰ء میں "تہذیب الاخلاق" نکالا۔ اور اس طرح جدید اردو نثر کے ساتھ جدید اردو صحافت کی بنیاد بھی ڈالی۔ ان رسالوں نے اصلاحِ معاشرہ کے علاوہ اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دیں، وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان رسائل نے خود ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور مختصر سے عرصہ میں ملک گیر اثرات مرتب کر دیے۔

اپنی اسی علی گڑھ کی شاندار روایت کو برقرار رکھتے ہوئے یہاں کے دانشوروں نے، جن کی قیادت، ڈاکٹر یوسف حسین خاں کر رہے تھے، ایک علمی، ادبی اور تحقیقی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا، اور جنوری ۱۹۶۰ء کو "فکر و نظر" کے عنوان سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا۔ اس نے جلد ہی اپنا مقام بنالیا۔

اس کے بنیادی مقاصد میں طبیعاتی، حیاتیاتی اور اجتماعی علوم، نیز عالمی ادبیات میں جدید میلانات سے اردو دنیا کو روشناس کرانا تھا۔ رسالہ کے مدیر خود یوسف حسین خاں صاحب تھے، اور ادارہ "فکر و نظر" کے معتمد پروفیسر نذیر احمد، صدر شعبۂ فارسی تھے۔ یوسف صاحب اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر تھے اور نہ صرف انتظامی امور کی سربراہی کر رہے تھے، بلکہ یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی بھی فرما رہے تھے۔ آپ نے یونیورسٹی میں دانشوروں کا ایک حلقہ بنالیا تھا۔ جس کی مرکزی شخصیت خود یوسف صاحب کی تھی۔ اس حلقہ نے اپنی علمی کاوشوں اور تحقیقی کاموں سے یونیورسٹی کے وقار کو بلند کیا اور اپنے اپنے میدان میں تحقیقی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔ ان حضرات نے "فکر و نظر" کے معیار کو بلند کرنے اور اسے استحکام بخشنے میں یوسف صاحب کی مدد کی۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے یوسف اپنی خودنوشت "یادوں کی دنیا" میں لکھتے ہیں :

> " باوجود ان انتظامی مصروفیات کے میں نے اپنے ذمے رسالہ "فکر و نظر" کی ادارت کا کام لیا۔ اور ادارۂ "فکر و نظر" کے سکریٹری پروفیسر نذیر احمد صدر شعبۂ فارسی کی ذاتی دلچسپی

اور محنت کی وجہ سے میں رسالہ کی اشاعت اور طباعت کی طرف سے بے فکر رہا۔ میں نے خود "فکر و نظر" کے لیے مضامین لکھے جنھیں مکتبہ جامعہ دہلی نے "کاروانِ فکر" کے نام سے شایع کیا۔ مجھے مسرت ہے کہ رسالہ کا معیار کافی اونچا رہا۔ چنانچہ اس کے بعض مضامین کے حوالے روس، ایران اور ترکی کے رسایل میں دیے گئے، اور ان ملکوں میں اس قدر افزائی ہوئی۔ ہمارے ملک کے اہلِ نظر نے بھی رسالے کو سراہا۔ مولوی عبدالحق نے بھی اس کی تعریف و تحسین کی۔

یوسف صاحب ۱۹۶۵ء تک علی گڑھ میں رہے۔ جب تک آپ علی گڑھ میں رہے، "فکر و نظر" کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے زمانے میں رسالہ نے بہت ترقی کی اور غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اس عہد میں رسالے کی دو خصوصیات بڑی نمایاں رہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ہر شمارے میں سرسید سے متعلق مضامین بالالتزام شایع ہوتے۔ چنانچہ سرسید کے متعدد غیر مطبوعہ خطوط سے علمی دنیا پہلی بار "فکر و نظر" کے ذریعہ ہی آشنا ہوئی۔ اس کے علاوہ یوسف صاحب کی کوششوں سے ایم۔ اے۔ او۔ کالج اور سرسید کی قایم کردہ سائنٹفک سوسائٹی سے متعلق مراسلت بھی پہلی بار مربوط طریقہ پر "فکر و نظر" ہی میں شایع ہوئی۔ بعد میں یہ کتابی شکل میں SELECTED DOCUMENTS FROM THE ALIGARH ARCHIVES کے عنوان سے بھی شایع ہو گئی۔

"فکر و نظر" کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ مولانا آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری) کے شعبۂ مخطوطات میں قلمی نسخوں کا جو عدیم النظیر اور بیش بہا خزانہ موجود ہے، اس میں سے کسی نہ کسی اہم مخطوطہ کا تعارف ہر شمارے میں شامل ہوتا۔ ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور ڈاکٹر مختار الدین احمد کے تعارفی مضامین مسلسل شایع ہوتے رہے۔ ان کے ذریعہ ایک طرف تو علمی دنیا کو ان نوادر سے واقفیت ہوئی اور دوسری جانب مولانا آزاد لائبریری کی وقعت اور قدر و قیمت سے لوگ متعارف ہوئے۔

"فکر و نظر" کے قلمی معاونین کا حلقہ بڑا وسیع اور ہمہ گیر رہا ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں علی گڑھ کے فضلا کے علاوہ ملک کے نامور ادیب، عالم اور محقق بھی شامل رہے ہیں۔ جس کی بنا پر "فکر و نظر" کا حلقہ خالص یونیورسٹی کے حدود سے نکل کر ملک گیر حیثیت اختیار کر گیا۔

یوسف صاحب کے علی گڑھ سے چلے جانے کے بعد جناب فضل الرحمٰن یونیورسٹی کے پرو وایس چانسلر بنے۔ اسی کے ساتھ آپ نے "فکر و نظر" کی ادارت کے فرایض بھی انجام دیے۔ لیکن زیادہ عرصہ تک یہ سلسلہ نہ چل سکا، اور ۱۹۶۶ء میں مدیر کا عہدہ ختم کر کے ایک مجلس ادارت بنا دی گئی جس

کے صدر فضل الرحمٰن صاحب مقرر ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء کے شمارے میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی:

"جدید تنظیم کے مطابق "فکر و نظر" کا ایک ادارہ بنا دیا گیا ہے، جس کی صدارت محمد فضل الرحمٰن صاحب پرو وائس چانسلر کریں گے۔ مجلس ادارت میں مختلف علوم کی نمائندگی بڑی حد تک ملحوظ رکھی گئی ہے۔"

اسی طرح اکتوبر ۱۹۶۶ء کے شمارے سے رسالہ پر مدیر کے نام کی بجائے مجلس ادارت کے ارکان کے اسمائے گرامی دیے جانے لگے۔ اس کے ساتھ ایک انقلابی تبدیلی یہ بھی ہوئی کہ "فکر و نظر" اب تک ٹائپ میں طبع ہوتا تھا، لیکن اب اسے لیتھو میں چھاپنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسی اکتوبر ۱۹۶۶ء والے شمارے میں اس فیصلہ کی اطلاع ان الفاظ میں دی گئی:

"نسخ ٹائپ کی افادیت کے ہم قایل ہیں، مگر ہمارا تجربہ یہ ہے کہ باوجود ہر ممکن کوشش کے یہ اب تک زیادہ مقبول نہیں ہو سکا ہے، اور لیتھو کی چھپائی کے مقابلے میں جگہ بھی زیادہ لیتا ہے اور گراں بھی پڑتا ہے۔ اس لئے ہم نے لیتھو کی طباعت کو ترجیح دی ہے۔"

اس جدید انتظامی تنظیم کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اس میں خالص ادبی، علمی اور تحقیقی مضامین کے علاوہ سماجی اور سائنسی علوم کو بھی شامل کیا جانے لگا۔ چنانچہ اب اس میں معاشیات، سیاسیات، نفسیات، ارضیات، جغرافیہ اور ملک کی تعلیمی پالیسی وغیرہ سے متعلق موضوعات پر بھی مضامین شائع ہونے لگے۔ اس طرح اس کے مندرجات میں وسعت تو ضرور پیدا ہو گئی، لیکن کسی حد تک یہ اپنے بنیادی دائرے سے باہر آ گیا۔

۱۹۷۰ء کے بعد اس میں غیر یقینی صورت حال پیدا ہو گئی۔ اس کی اشاعت اب مستقل نہیں رہی اور اشاعتوں کے درمیان طویل وقفے ہونے لگے۔ ۱۹۷۱ء میں پروفیسر مسعود حسین خاں اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، مجلس ادارت برقرار رہی۔ آپ کے بعد پروفیسر خورشید الاسلام، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، ڈاکٹر نور الحسن نقوی، یکے بعد دیگرے اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ آجکل اس کی ادارت کے فرائض پروفیسر شہریار انجام دے رہے ہیں۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں — جلد ۱ شمارہ ۱ جنوری ۱۹۶۰ء تا جلد ۶ شمارہ ۲ اپریل ۱۹۶۵ء

۲۔ جناب فضل الرحمٰن — جلد ۶ شمارہ ۳ جولائی ۱۹۶۵ء تا جلد ۷ شمارہ ۴ جولائی ۱۹۶۶ء

مجلس ادارت — جلد ۸ شمارہ ۱ اکتوبر ۱۹۶۶ء تا جلد ۱۰ شمارہ ۴ x ۱۹۷۰ء

۳۔ پروفیسر مسعود حسین خاں — جلد ۱۱ شمارہ ۱ ۱۹۷۱ء تا جلد ۱۳ شمارہ ۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء

۴۔ پروفیسر خورشید الاسلام — جلد ۱۴ شمارہ ۴ دسمبر ۱۹۷۳ء تا جلد ۱۷ شمارہ ۴ اکتوبر ۱۹۸۱ء

۵۔ پروفیسر عتیق احمد صدیقی جلد ۱۸ شمارہ ۱-۲ جنوری/جون ۱۹۸۱ء تا جلد ۲۱ شمارہ ۱-۲ جنوری/جون ۱۹۸۴ء

۶۔ پروفیسر نورالحسن نقوی جلد ۲۲ شمارہ ۱-۳ جنوری/ستمبر ۱۹۸۵ء تا جلد ۲۳ شمارہ ۱۹۸۶ء

۷۔ ڈاکٹر شہریار جلد ۲۴ شمارہ ۱۹۸۷ء تا حال

"فکر و نظر" نے کچھ خصوصی شمارے بھی شائع کیے ہیں۔ یہ سب معیاری ہیں اور اپنے اپنے موضوع پر اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں غالب نمبر، گاندھی نمبر، سائنس نمبر، عربی ادب نمبر، تحریک آزادی نمبر اور ناموران علی گڑھ نمبر شامل ہیں۔ ان کا گوشوارہ حسب ذیل ہے:

۱۔ غالب نمبر	جلد ۹	شمارہ ۲		۱۹۶۹ء
۲۔ گاندھی نمبر	جلد ۹	شمارہ ۴		۱۹۶۹ء
۳۔ سائنس نمبر	جلد ۱۴	شمارہ ۱-۲	مارچ/جون	۱۹۷۵ء
۴۔ عربی ادب نمبر	جلد ۱۶	شمارہ ۱-۴		۱۹۷۹ء
۵۔ تحریک آزادی نمبر	جلد ۲۲	شمارہ ۴	اکتوبر	۱۹۸۵ء
۶۔ ناموران علی گڑھ (پہلا کارواں)	جلد ۲۳	شمارہ ۱-۳	جنوری/ستمبر	۱۹۸۵ء
۷۔ " " (دوسرا کارواں)	جلد ۲۳	شمارہ		۱۹۸۶ء
۸۔ " " (تیسرا کارواں، جلد اول)	جلد ۲۴	شمارہ	جنوری ۱۹۸۷ء - جولائی ۱۹۸۸ء	

"فکر و نظر" ۲۹ سال سے نکل رہا ہے۔ اس دوران اس کی پچیس [۲۵] جلدیں شائع ہوئیں۔ ۱۹۸۸ء کا آخری پرچہ جلد ۲۵ کا شمارہ ۲-۳ ہے۔ اس پر مہینہ درج نہیں ہے۔ لیکن یہ دسمبر کے آخر میں شایع ہوا ہے۔ اسلیے یہ بات یقینی ہے کہ یہ ۱۹۸۸ء کا آخری شمارہ ہے۔ اس ۲۹ سال کے عرصہ میں اس میں پانچ سو سے زاید مضامین شایع ہوئے۔ ان میں ایک جہان معانی پنہاں ہے۔ ان تمام مضامین کو ان رسالوں میں تلاش کرنا اور مطلوبہ مضامین کا انتخاب کرنا بڑا پیچیدہ اور دقت طلب کام ہے، اور مزید یہ کہ ابتدائی دور کے زیادہ تر رسالے اب معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ لہٰذا یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ ان تمام رسالوں کے مندرجات کا ایک توضیحی اشاریہ تیار کر دیا جائے تاکہ اسکالرز، دانشور، اور تحقیقی کام کرنے والے حضرات ان کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔ اور اپنے علمی و ادبی کاموں میں ان سے مدد لے سکیں۔ اسی خیال کے پیش نظر یہ اشاریہ تیار کیا گیا ہے۔

••

فہرست

فکر و نظر (۱۹۶۰ء ـ ۱۹۹۰ء)

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
	افتتاحیہ	یوسف حسین خاں	۱	۱	جنوری	۱۹۶۰ء	۲-۱
	اخلاقیات						
۱۔	اخلاقیات کا ارتقاء	البرٹ شوائٹزر: مترجمہ عبدالحق	۳	۳	جولائی	۱۹۶۲ء	۱۰۶-۹۶
۲۔	اسلام میں اخلاقی فکر کی ابتدا	عمرالدین	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۷۴-۵۷
۳۔	جدید مسلک انسانیت	سیّد عابد حسین	۱	۱	"	۱۹۶۰ء	۴۴-۲
۴۔	حضرت بابا فرید کا فلسفۂ انسانیت	محمد نور نبی	۱۸	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۱ء	۷۸-۶۴
۵۔	معراج انسانیت سیرۃ نبوی کی روشنی میں	علی نقی	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۹۲-۸۸
	ادب						
۱۔	ادب کی قدریں	اسلوب احمد انصاری	۳	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۴۵-۲۲
۲۔	شمالی ہندوستان کا ایک علمی و ادبی مرکز۔ اکبرآباد (آگرہ)	وقار الحق انصاری	۶	۲	اپریل	۱۹۶۵ء	۱۱۰-۹۰
	ادب ـــ تاریخ و تنقید						
۱۔	ادب اور تاریخ	اسلوب احمد انصاری	۲	۴	اکتوبر	۱۹۶۱ء	۱۴-۱
۲۔	ادب اور نفسیات	ظفر احمد صدیقی	۱	۳	جولائی	۱۹۶۰ء	۸۲-۵۹
۳۔	ادب میں شخصیت	شمس الرحمٰن فاروقی	۵	۲	اپریل	۱۹۶۴ء	۹۲-۸۸
۴۔	ادبی تاریخ اور ادبی تنقید	اولاد احمد صدیقی	۷	۲	"	۱۹۶۷ء	۴۲-۲۳
۵۔	ادبی تنقید کے چند مسائل	اسلوب احمد انصاری	۳	۲	"	۱۹۶۲ء	۱۸-۱
۶۔	تحقیق متن کے اصول	صلاح الدین المنجد: مترجمہ محمد فضل الرحمٰن	۲	۲	"	۱۹۶۱ء	۱۰۰-۸۲
۷۔	تدوین کے اصول و مدارج	محمد انصار اللہ	۱۰	۲		۱۹۷۰ء	۶۲-۵۱
۸۔	دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے	رشید احمد صدیقی	۴	۳	جولائی	۱۹۶۳ء	۹۰-۶۷
۹۔	عملی تنقید	محمد یسین	۹	۱	اکتوبر	۱۹۶۸ء	۳۷-۲۹

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۰۔	لوکاچ اور جدید ادب	انڈریو کے بگینڈی: مترجم عقیل احمد	۱۷	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۰ء	۵۹-۵۰
۱۱۔	مشرقی نظریات تنقید	سید محمد ہاشم	۱۷	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۰ء	۴-۳
	اردو ادب ۔ تاریخ و تنقید						
۱۔	آثار ابوالکلام ۔ ایک تنقیدی جائزہ	محمد علی کاظمی	۱۱	۴		۱۹۷۱ء	۹۲-۷۵
۲۔	اردو میں ادبی تنقید کی صورت حال	آل احمد سرور	۷	۱	اکتوبر	۱۹۶۶ء	۲۴-۹
۳۔	اردو میں جدید تحقیق کا آغاز	محمود الہٰی	۵	۳	جولائی	۱۹۶۴ء	۹۲-۷۴
۴۔	اردو نثر کا بنیادی اسلوب	رشید احمد صدیقی	۱	۱	جنوری	۱۹۶۰ء	۱۰۴-۸۶
۵۔	رجب علی بیگ سرور کی مترجم تالیفیں (قسط ۱)	سید نیر مسعود	۶	۴	اکتوبر	۱۹۶۵ء	۸۶-۴۷
۶۔	" " " (قسط ۲)	" "	۷	۱	"	۱۹۶۶ء	۹۳-۶۰
۷۔	رشید صاحب کا اسلوب	منظر عباس نقوی	۲۵	۲-۱		۱۹۸۸ء	۲۹-۲۲
۸۔	قدیم ایرانی و زرتشتی عناصر اردو ادب میں	نذیر احمد	۲	۲	اپریل	۱۹۶۱ء	۵۵-۱
۹۔	کربل کتھا کا زمانہ	محمد انصار اللہ	۹	۳		۱۹۶۹ء	۱۰۹-۸۷
۱۰۔	مولوی نذیر احمد کے لکچر	محمد عزیر	۱	۴	اکتوبر	۱۹۶۰ء	۵۷-۳۰
	افسانہ						
۱۔	نفسیاتی افسانہ	محمد یٰسین صدیقی	۲	۴	اکتوبر	۱۹۶۱ء	۸۰-۵۴
	اردو زبان						
۱۔	اردو رسم الخط	رشید احمد صدیقی	۱۱	۱		۱۹۷۱ء	۱۹-۵
۲۔	اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ	مسعود حسین خاں	۹	۳		۱۹۶۹ء	۲۱-۷
۳۔	اردو زبان کی تدریس کا جدید لسانیاتی طریق کار	عبد الغفار شکیل	۲۰	۲-۱	جنوری جولائی	۱۹۸۲ء	۸۱-۷۵
۴۔	ترکی زبان کا مشہور لفظ اردو	اکمل ایوبی	۱۰	۴-۳		۱۹۷۰ء	۸۴-۷۹

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵۔	موجودہ ہندوستان میں اردو کی حیثیت۔	سید مقبول احمد	۸	۲	جنوری	۱۹۶۸ء	۹۰-۸۶
۶۔	مشینی دماغ اردو کی خدمت میں۔	سید توصیف الحسن نقوی	۱۴	۲-۱	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۹۴-۸۲
۷۔	ہندوستان میں اردو کا عروج و زوال	مسعود حسین خاں	۳	۱	جنوری	۱۹۶۲ء	۹۷-۷۳
۸۔	ہندوستان میں اردو کا مستقبل	محمد محمود فیض	۱۷	۲	اپریل	۱۹۸۰ء	۷۶-۵۹

اردو زبان — قواعد

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	اردو فعل کا تعریفی تجزیہ	اقتدار حسین خاں	۲۱	۲-۱	جنوری جون	۱۹۸۴ء	۹۱-۸۵
۲۔	فارسی صرفی و نحوی اثرات اردو زبان پر	نذیر احمد	۲	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۲۱-۱
۳۔	قواعد صرف و نحو زبان اردو	سید احمد خاں، مرتبہ عبدالغفار شکیل	۱۱	۳		۱۹۷۱ء	۱۲۰-۸۶
۴۔	ماضی تمام کے تین صیغے	سونیا چیرنی کووا	۵	۲	اپریل	۱۹۶۴ء	۴۸-۱۸

اردو شاعری

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	اردو اور ہندی شاعری میں زبان کا نیا رجحان	سمیع اللہ اشرفی	۲۵	۳-۲		۱۹۸۸ء	۶۴-۵۱
۲۔	اردو شاعری کا تہذیبی پس منظر ۱۱۹۱ء سے ۱۹۰۱ء تک	محمد حسن	۱	۲	اپریل	۱۹۶۰ء	۱۰۴-۷۶
۳۔	اردو شاعری میں آسمان (غالب اور اقبال)	شمس الرحمن فاروقی	۳	۳	جولائی	۱۹۶۶ء	۱۱۸-۱۰۸
۴۔	اردو شاعری میں ایہام گوئی	محمد حسن	۲	۳	"	۱۹۶۱ء	۲۹-۱۳
۵۔	اصوات اور شاعری	مغنی تبسم	۷	۴	"	۱۹۶۷ء	۴۷-۲۸
۶۔	بارہ ماسہ کا ارتقائی سفر	الطاف حسین ندوی	۲۰	۲-۱	جنوری جون	۱۹۸۳ء	۴۷-۲۴
۷۔	بکٹ کہانی کا مصنف اور اس کا وطن	عبدالغفار شکیل	۱۱	۲		۱۹۷۱ء	۱۱۴-۸۱
۸۔	تخلیق شعر	منظر عباس نقوی	۱۹	۲-۱	جنوری جون	۱۹۸۲ء	۷۶-۶۵
۹۔	جدید اردو اور ہندی کی رومانی اور چھایاوادی شاعری کے اہم رجحانات (قسط ۱)	سمیع اللہ اشرفی	۱۸	۴-۳	جولائی دسمبر	۱۹۸۱ء	۸۰-۶۵

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۰۔	جدید اردو اور ہندی کی رومانی اور چھایاوادی شاعری کے اہم رجحانات (قسط ۲)	سمیع اللہ اشرفی	۱۹	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۲ء	۲۲-۱
۱۱۔	ڈرامائی شاعری	محمد یٰسین صدیقی	۱۹	۳-۴	جولائی دسمبر	"	۷۵-۵۵
۱۲۔	سماج اور شعر	مسعود حسین خاں	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۵۶-۴۰
۱۳۔	قائم چاندپوری (انتخاب کلام)	رشید احمد صدیقی	۴	۴	اکتوبر	۱۹۶۳ء	۱۰۰-۹۰
۱۴۔	قصۂ مہر افروز و دلبر	نثار احمد فاروقی	۱۱	۳		۱۹۷۱ء	۴۴-۲۴
۱۵۔	محمد شاہی دور کا پس منظر	محمد حسن	۲	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۳۲-۱۹

اس مضمون میں اردو ادب کے ایک مخصوص دور سے بحث کی گئی ہے۔ جسے ادبی لحاظ سے دہلی میں اردو شاعری کا پہلا دور کہا جا سکتا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۶۔	میر انیس کا کلام اور اس میں رنگا رنگی موضوعات	نائب حسین نقوی	۱۵	۳-۴	ستمبر دسمبر	۱۹۷۸ء	۴۲-۲۸
۱۷۔	میر انیس کی منظر نگاری	سلام سندیلوی	"	" "	" "	"	۲۷-۱
۱۸۔	ناسخ کے غیر مطبوعہ قصیدے	گیان چند	۱۲	۱-۲		۱۹۷۳ء	۵۶-۴۵

اردو لغات

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	فرہنگ بلخی	یوسف الدین احمد بلخی	۱۰	۱		۱۹۷۰ء	۱۶۲-۱۳۳
۲۔	" " (حصہ دوم)	" "	۱۰	۲		"	۱۳۵-۱۰۲

اردو ناول ـ تاریخ و تنقید

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	اردو میں ناول نگاری کا آغاز ـــ ایک نیا زاویہ	اقتدار عالم خاں	۲	۱	جنوری	۱۹۶۵ء	۱۳۶-۱۲۱
۲۔	بیدی کی زبان	مرزا خلیل احمد بیگ	۲۵	۱-۲		۱۹۸۸ء	۸۰-۶۵
۳۔	شریف زادہ	خورشید الاسلام	۷	۲	اپریل	۱۹۶۷ء	۷۶-۶۳

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۔	گئودان ـــــ تصنیف یا ترجمہ	مسعود حسین خاں	۱۱	۳		۱۹۷۱ء	۵۴-۲۷

ارضیات

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	گونڈوانا لینڈ	فخرالدین	۱۴	۲-۱	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۶۸-۵۵

اسلامیات

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	اردو میں اسلامی علوم	نذیر احمد	۴	۴	اکتوبر	۱۹۶۳ء	۸۹-۶۷
۲۔	اسلام اور فنون لطیفہ	محمد نجات اللہ صدیقی	۱۱	۳		۱۹۷۱ء	۸۵-۵۶
۳۔	اسولہ و اجوبہ رشیدی	خلیق احمد نظامی	۳	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۱۴-۱۲۵

"اسولہ و اجوبہ رشیدی" ایران کے مشہور فاضل رشید الدین فضل اللہ کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ خواجہ رشید الدین فضل اللہ عماد اللہ ایران کے زبردست علماء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جن کی فہم و بصیرت اور علم و دانش کی منگول سلاطین نے سب سے زیادہ قدر کی۔ ان کو خواجہ نصیر الدین طوسی اور علاء الدین عطا ملک جوینی کا ہم پلہ قرار دیا جاتا ہے "اسولہ و اجوبہ رشیدی" کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں اسی نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۔	الامیون	سعید احمد اکبر آبادی	۴	۴	اکتوبر	۱۹۶۳ء	۲۶-۱

لفظ "اُمّی" اُس کی جمع "اُمیّون"، قرآن کریم میں ان کے محل استعمال اور معانی و مفاہیم سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵۔	الصابئون	سعید احمد اکبر آبادی	۴	۳	جولائی	۱۹۶۳ء	۲۷-۱

قرآن کریم میں چند مقامات مشکل سمجھے گئے ہیں۔ ان میں وہ آیت بھی شامل ہے جس میں 'صابئون' کا ذکر اہل کتاب اور مومنین کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور ان کو ایک ہی حکم کے تحت رکھا گیا ہے۔ زیر نظر مضمون میں لفظ صابئون کے معانی و مفاہیم سے بحث کی گئی ہے۔ اور قرآنی آیت کی تفسیر کی گئی ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۶۔	ایک فکر انگیز تصنیف کا تعارف	(ایک مبصر)	۶	۲	اپریل	۱۹۶۵ء	۷۹-۶۸

نویل جے۔ کولسن کی انگریزی تالیف A HISTORY OF ISLAMIC LAW کا تعارف۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۷۔	حدیث لاتسبوا الدھر کا تاریخی پس منظر	شبیر احمد خاں غوری	۲	۱	جنوری	۱۹۶۲ء	۷۲-۳۱
۸۔	حکمت و دانش (نہج البلاغہ کی روشنی میں)	وحید اختر	۲۵	۳-۲		۱۹۸۸ء	۲۱-۵

اقبال، سر محمد اقبال

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	اقبال اور ان کے شارحین کے تسامحات	ایچ۔ ایم ضیاءالدین شمسی طہرانی	۷	۴	اپریل	۱۹۶۷ء	۸۵-۷۳
۲۔	" " (قسط ۲)	" " "	۹	۱	اکتوبر	"	۶۹-۳۸
۳۔	" " (قسط ۳)	" " "	۸	۲	جنوری	۱۹۶۸ء	۶۱-۲۲
۴۔	اقبال اور شارحین اقبال کی سہل انگاریاں	" " "	۸	۳	اکتوبر	"	۱۲۲-۸۹
۵۔	اقبال اور روحانیت	محمد یٰسین	۱۷	۱	جنوری	۱۹۸۰ء	۸۰-۶۶
۶۔	اقبال کا انسان کامل اور اسلامی تہذیب کی روح	محمد عمر	۴	۲	اپریل	۱۹۶۳ء	۴۸-۱
۷۔	" " " (قسط ۲)	" "	۴	۳	جولائی	"	۴۶-۳۸
۸۔	اقبال کا تصور انقلاب	فخر الاسلام	۱۸	۴-۳	جولائی دسمبر	۱۹۸۱ء	۲۴-۶
۹۔	اقبال کا تصور تعلیم	غلام عمر خاں	۵	۲	اپریل	۱۹۶۴ء	۷۷-۴۹
۱۰۔	اقبال کا تصور عشق	" "	۵	۱	جنوری	"	۶۵-۲۸
۱۱۔	اقبال کا فلسفۂ خودی	نیاز فتحپوری	۲	۲	اپریل	۱۹۶۱ء	۱۱۱-۱۰۱
۱۲۔	اقبال کی شاعری کا حرکی پہلو	قمر غفار	۲۰	۲-۱	جنوری جولائی	۱۹۸۲ء	۶۴-۴۸
۱۳۔	ٹیگور کا ایک خط		۲	۴	اکتوبر	۱۹۶۱ء	۱۱۸-۱۱۷

۷ فروری ۱۹۲۳ء کو لکھا گیا حیدرآباد (دکن) کے ایک ادیب ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ کے نام ٹیگور کا ایک خط جس میں انھوں نے علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اصل خط انگریزی میں تھا یہاں اس کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۴۔	شاعر اعظم اقبال	رحم علی الہاشمی	۹	۲		۱۹۶۹ء	۱۳۲-۱۱۰

انسانیات (علم الانسان)

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	زمین پر زندگی کی ابتدا	محمد معین فاروقی	۹	۳		۱۹۶۹ء	۸۶-۷۷

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۔	نامیاتی ارتقار کا مفہوم	رعایت خاں؛ مترجمہ حبیب الرحمٰن چغتائی	۷	۲	جولائی	۱۹۶۷ء	۲۲-۱۵
	انگریزی ڈراما						
۱۔	ابسن کا گڑیا گھر ایک مطالعہ	اطہر پرویز	۱۹	۲-۱	جنوری جون	۱۹۸۲ء	۳۳-۲۲
۲۔	بندھن	اگسٹ اسٹرنبرگ؛ مترجمہ عتیق احمد صدیقی	۱۵	۴-۳	ستمبر دسمبر	۱۹۷۸ء	۹۲-۵۳
	بنکاری						
۱۔	بنکوں پر سماجی کنٹرول	قمر حسین فاروقی	۸	۲	اپریل	۱۹۶۸ء	۶۸-۶۳
۲۔	قومیائے گئے بنکوں کے مسائل و مقاصد	" " "	۱۰	۱		۱۹۷۰ء	۷۹-۷۳
	بنگالی ڈراما۔ تاریخ						
۱۔	بنگالی ڈرامے کا آغاز	سیّد محمد ناظم	۱۰	۱		۱۹۷۰ء	۷۲-۴۴
	پختونستان						
۱۔	پختونستان ایک تاریخی جائزہ	سیّد حسن علی شاہ جعفری	۱۱	۲		۱۹۷۱ء	۲۲-۱
	تاریخ۔ عہدِ قدیم						
۱۔	عہدِ عتیق کی تاریخ اور اس کے مصادر	محمود حسن قیصر امروہوی	۲	۲	جولائی	۱۹۶۲ء	۲۴-۱
	تاریخ نگاری						
۱۔	عربوں کی تاریخ نویسی۔ (قسط ۱)	ڈی۔ ایس۔ مارگولیتھ؛ مترجمہ نثار احمد فاروقی	۱۲	۲-۱		۱۹۷۲ء	۱۱۰-۷۷
۲۔	" " (قسط ۲)	" " "	۱۲	۲-۱		۱۹۷۳ء	۱۶-۱
۳۔	" " (قسط ۳)	" " "	۱۲	۲	اکتوبر	۱۹۷۳ء	۴۴-۲۳
	ترکی						
۱۔	ترکی میں فکرِ جدید کا ارتقار	محمدؐ صادق	۸	۱	اکتوبر	۱۹۶۷ء	۳۷-۲۳
۲۔	ترکی نے کب اور کس طرح آذربائیجان میں راہ پائی	احمد کسروی؛ مترجمہ کبیر احمد جائسی	۹	۲		۱۹۶۹ء	۷۶-۶۵

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
	ترکی ادب						
۱۔	جدید ترکی ادب	اکمل ایوبی	۵	۲	اپریل	۱۹۶۴ء	۸۷-۷۹
۲۔	عاشق پاشا کی ایک مثنوی	" "	۶	۲	"	۱۹۶۵ء	۱۱۶-۱۱۱

عاشق پاشا (۱۲۷۲ء-۱۳۳۲ء) کا شمار ترکی زبان کے بلند پایہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ اُن کی مشہور ترین مثنوی "غریب خانہ" ہے۔ زیر نظر مضمون میں اس مثنوی کے فنی محاسن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۳۔	مولانا روم کے ترکی اشعار	اکمل ایوبی	۵	۱	جنوری	۱۹۶۴ء	۱۴۰-۹۶
	تصوف						
۱۔	بحر زخار اور اس کا مصنف	مفتی محمد رضا انصاری	۱۲	۴		۱۹۷۲ء	۷۲-۳۵
۲۔	تصوف اور اس کے غیر اسلامی ماخذ	وحید اختر	۱۱	۴		۱۹۷۱ء	۴۸-۵
۳۔	تصوف پر ایک نظر	حبیب الرحمٰن شاستری	۴	۱	جنوری	۱۹۶۳ء	۱۱۶-۱۰۵
۴۔	تصوف قبل از اسلام	محمد عرفان	۲۰	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۳ء	۲۳-۱
۵۔	تصوف کی حقیقت	" "	۱۸	۱-۲	" "	۱۹۸۱ء	۴۸-۳۰
۶۔	رموز السالکین	حسینی شاہد	۱۲	۳		۱۹۷۲ء	۳۲-۱
۷۔	سراج المعرفت	قاضی عبدالودود	۳	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۱۰۰-۹۰

سراج معرفت و منہاج رحمت اپیری و مریدی کے سلسلہ کی ایک اہم تالیف ہے۔ اس کے مؤلف مولوی مفتی سید رحمت علی خاں ہیں۔ اس پر مرزا غالب کا دیباچہ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اس کے مندرجات سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۸۔	سرور الصدور و نور البدور	خلیق احمد نظامی	۳	۳	جولائی	۱۹۶۲ء	۱۳۰-۱۲۶

سرور الصدور و نور البدور، شیخ حمید الدین ناگوری اور آپ کے صاحبزادے شیخ فرید الدین محمود کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اس نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۹۔	شیخ نظام الدین اولیاء کا متصوفانہ فلسفہ	محمد نور نبی	۳	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۸۹-۷۰

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۰-	عوارف المعارف کے قدیم فارسی ترجمے	سخاوت مرزا	۴	۳	جولائی	۱۹۶۳ء	۱۰۲-۹۸
۱۱-	" " " (تکملہ)		"	"	"	"	۱۱۱-۱۰۳
۱۲-	مخ المعانی	خلیق احمد نظامی	۴	۱	جنوری	"	۱۲۶-۱۲۱

"مخ المعانی" امیر حسن علائی سجزی معروف بہ حسن سجزی دہلوی کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۲۹۷ھ، مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۳-	مکتوبات شاہ محب اللہ الہ آبادی	خلیق احمد نظامی	۲	۲	اپریل	۱۹۶۱ء	۱۱۵-۱۱۲

تعلیم

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱-	آداب المتعلمین اور طوسی	امتیاز علی عرشی	۲	۳	جولائی	۱۹۶۱ء	۱۲-۱
۲-	جائزہ (کوٹھاری کمیشن کی چند سفارشات پر ایک نظر)	صابرہ زیدی	۷	۲	جنوری	۱۹۶۷ء	۷-۱

تلگو ادب

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱-	تلگو ادب محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں (۱۵۸۰ء-۱۶۲۰ء)	ہارون خاں شروانی	۲	۴	اکتوبر	۱۹۶۱ء	۱۱۸-۱۱۳

جغرافیہ

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱-	جغرافیہ میں مقداری انقلاب اور اس کے مضمرات	سید محمد رفیع اللہ	۱۴	۱-۲	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۵۴-۲۷
۲-	عہد وسطیٰ میں ہندوستان اور مشرق بعید عرب جغرافیہ دانوں کی نظر میں	محمد ضیاء الدین علوی	۷	۲	جنوری	۱۹۶۷ء	۹۵-۸۷
۳-	گذشتہ آب و ہوا اور براعظموں کا کھسکنا	فخر الدین احمد	۸	۲	اپریل	۱۹۶۸ء	۶۲-۴۷

حیوانیات

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱-	ہڈی دل	ہارون رشید	۱۴	۱-۲	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۱۳۲-۱۲۹

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲.	چند مہلک حیوانات ابتدائی (PROTOZOA)	رفعت محمود آفریدی	۱۹	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۲ء	۲۶-۳۱
۳.	حیوانانی خلیہ اور اس کے افعال	شاہ مسعود عالم	۸	۱	اکتوبر	۱۹۶۷ء	۸۱-۹۰
۴.	طفیلی کیڑے	نزہت ریاض	۱۲	۲	"	۱۹۷۳ء	۴۵-۵۴

دکنی شاعری

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱.	حافظ تاج الدین مشتاق	ثمینہ شوکت	۳	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	-۱۲۰

مشتاق دکن کے ایک اہم شاعر تھے۔ یہ نابینا تھے۔ چندو لال شاداں کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کو ناسخ کا شاگرد بتایا جاتا ہے۔ دہلی کی تباہی اور زوال پذیر ہونے کے باعث دیگر شعرا کی طرح یہ بھی شمالی ہند سے دکن ہجرت کر گئے تھے وہیں ۱۲۸۰ھ میں وفات پائی۔

ڈراما

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱.	ہندوستانی عوامی ناٹک اور بدیشیا	محمد یٰسین	۵	۴	اکتوبر	۱۹۶۴ء	۹۳-۱۰۱

روسی ادب

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱.	چیخوف اور وجودی صورتحال	سلامت اللہ خاں	۱۵	۱-۲	مارچ تا جون	۱۹۷۸ء	۱-۱۶

رومانیوی ڈراما

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱.	لیڈر	یوجین آئونیسکو، مترجمہ عتیق احمد صدیقی	۱۲	۴	دسمبر	۱۹۷۳ء	۷۳-۸۲

سائنس

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱.	سائنس اور سائنسدان	محمد معین فاروقی	۹	۱	اکتوبر	۱۹۶۸ء	۳۷-۴۰
۲.	سائنس اور ہم	رئیس احمد	۷	۱	"	۱۹۶۶ء	۱-۸

سائنٹفک سوسائٹی

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱.	سائنٹفک سوسائٹی کے متعلق غیر مطبوعہ خطوط (انگریزی) (قسط ۱)	یوسف حسین خاں	۴	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۱-۵۰
۲.	" " " (قسط ۲)	" "	۴	۳	جولائی	"	۱-۵۱
۳.	" " " (قسط ۳)	" "	۴	۴	اکتوبر	"	۱۰۱-۱۴۰

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۔	سائنٹفک سوسائٹی کے متعلق غیر مطبوعہ خطوط قسط ۴ (انگریزی)	یوسف حسین خاں	۵	۱	جنوری	۱۹۶۴ء	۱۹۰-۱۴۱
۵۔	" " " " (قسط ۵)	" "	۵	۲	اپریل	"	۱۵۰-۱۹۲
۶۔	" " " " (قسط ۶)	" "	۵	۳	جولائی	"	۳۰۰-۲۵۱
۷۔	سائنٹفک سوسائٹی میں سرسید کی پہلی تقریر	مشتاق حسین	۳	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۱۳۴-۱۲۷
	سائنٹفک سوسائٹی کے قیام اور اس کے مقاصد کے سلسلہ میں سرسید کی تقریر جو ۹ جنوری ۱۸۶۴ء کو غازیپور میں کی گئی تھی۔						
۸۔	سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی	اصغر عباس	۱۲	۳		۱۹۷۲ء	۹۸-۸۱
	سرسید احمد خاں						
۱۔	اخبار الاخیار مظفر پور اور سرسید احمد خاں	قاضی عبدالودود	۱	۳	جولائی	۱۹۶۰ء	۳۱-۲۴
۲۔	حالی کے خطوط سرسید کے نام	اصغر عباس	۱۱	۱		۱۹۷۱ء	۱۲۰-۱۱۳
۳۔	زادِ راہ اور راہنما	سید حامد	۲۲	۱-۲	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۱۸-۱۳
۴۔	سرسیدؒ اور قومی تحریک	نور الحسن	۱۱	۲		۱۹۷۱ء	۸۰-۶۳
۵۔	سرسیدؒ کا ایک لکچر	مشتاق حسین	۲	۳	جولائی	۱۹۶۲ء	۱۲۵-۱۱۹
	لکچر سنہ فصلی ہے، یہ لکچر سرسید نے یکم جون ۱۸۶۶ء کو سائنٹفک سوسائٹی کے زیر اہتمام علی گڑھ میں دیا تھا۔						
۶۔	سرسیدؒ کا مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں	رشید احمد صدیقی	۶	۲	اپریل	۱۹۶۵ء	۶۷-۳۵
۷۔	" " " " (قسط ۲)	" "	۶	۳	جولائی	"	۴۵-۵۶
۸۔	" " " " (قسط ۳)	" "	۶	۴	اکتوبر	"	۲۷-۱
۹۔	" " " " (قسط ۴)	" "	۷	۱	"	۱۹۶۶ء	۶۲-۴۱
۱۰۔	" " " " (قسط ۵)	" "	۷	۳	اپریل	۱۹۶۷ء	۱۶-۱
۱۱۔	" " " " (قسط ۶)	" "	۸	۱	اکتوبر	"	۸۰-۷۰

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۲۔	سرسید کا منفرد تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علیگڑھ میں (قسط ۷)	رشید احمد صدیقی	۸	۲	جنوری	۱۹۶۸ء	۸۵-۷۴
۱۳۔	سرسید کا تصور مذہب اور اس کی عصری معنویت	وحید اختر	۲	۲-۱		۱۹۷۳ء	۴۴-۱۷
۱۴۔	سرسید کے تعلیمی تصورات	آفتاب شمسی	۱۰	۴-۳		۱۹۷۰ء	۱۰۷-۸۵
۱۵۔	سرسید کے چند خطوط	محمود الٰہی	۴	۴	اکتوبر	۱۹۶۳ء	۵۰-۲۷
۱۶۔	سرسید کے چند غیر مطبوعہ خطوط	مشتاق حسین	۴	۱	جنوری	"	۱۲۱-۱۱۷

خواجہ محمد یوسف (م۔ ۱۹۰۲ء) رئیس علی گڑھ کے نام سرسید کے سات (۷) خطوط۔

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۷۔	سرسیدؒ کے دو غیر مطبوعہ خطوط	مختار الدین احمد	۳	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۱۱۴-۱۱۳

۲۶ دسمبر ۱۸۸۴ء اور ۷ جنوری ۱۸۸۵ء کے تحریر کردہ دو نجی خط۔

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۸۔	سرسیدؒ کے تین غیر مطبوعہ خطوط	ہارون خاں شروانی	۱	۳	جولائی	۱۹۶۰ء	۱۰۴-۱۰۱
۱۹۔	سرسیدؒ کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط	مختار الدین احمد	۱	۱	جنوری	"	۱۵-۲۴
۲۰۔	سرسیدؒ کے مخالفین	محمد ضیاء الدین انصاری	۲۲	۳-۱	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۲۴۳-۲۱۱
۲۱۔	سوانح سرسیدؒ کا ایک قدیم ماخذ	محمود الٰہی	۴	۱	جنوری	۱۹۶۵ء	۵۵-۴۹
۲۲	سیدؒ احمد خاں کی مہم پنجاب۔ ایک صدائے بازگشت	سید حسن احمد	۲۵	۳-۲		۱۹۸۸ء	۴۲-۳۰
۲۳	معمار قوم	عتیق احمد صدیقی	۲۲	۳-۱	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۴۴-۳۳
۲۴	مکاتیب سرسید	(ادارہ)	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۱۳۰-۱۲۹

نواب محمد مزمل اللہ خاں شروانی رئیس بھیکم پور کے نام سرسید کے تین خطوط جو علی الترتیب اگست ۱۸۹۴ء ستمبر ۱۸۹۵ء اور ۱۸۹۷ء کو لکھے گئے۔ ان میں سے پہلے خط میں منزل میں روشنی کے لیے چندے کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ دوسرے خط میں غبن کا تذکرہ ہے اور تیسرے خط میں نواب صاحب کی اہلیہ کی وفات پر تعزیت کی گئی ہے۔

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۵۔	مکاتیب سرسید	اکبر علی خاں	۲	۲	جولائی	۱۹۶۱ء	۱۳۶-۱۳۵

نواب کلب علی خاں والیِ رامپور کے نام سرسیدؒ کے دو خطوط۔ پہلا خط اردو میں ہے اور دوسرا انگریزی میں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۶۔	مکتوب سر سید	مختار الدین احمد	۲	۱	جنوری	۱۹۶۲ء	۹۸-۹۹

۲۹ اپریل ۱۸۹۲ء کو لکھا گیا وقار الملک کے نام سر سید کا ایک خط۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۷۔	مکاتیب سر سید (مکتوب ۱۸ تا ۴۱)	مختار الدین احمد	۱	۳	جولائی	۱۹۶۰ء	۱۰۵-۱۲۰
۲۸۔	" " (مکتوب ۴۲-۴۴)	" "	۱	۴	اکتوبر	"	۱۲۵-۱۲۸
۲۹۔	" "	نور الرحمٰن	۵	۳	جولائی	۱۹۶۴ء	۱۰۳-۱۰۷

نور الرحمٰن صاحب کے دادا مولوی منظہر اللہ متوطن بچھرایوں (ضلع مراد آباد) کے نام سر سید کے تین خطوط۔

سماجیات

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	امداد باہمی اور ہمارا سماج	عشرت حسین فاروقی	۷	۲	جنوری	۱۹۶۷ء	۶۶-۷۳
۲۔	انسانیت کا عروج و زوال	یوسف حسین خاں	۱	۳	جولائی	۱۹۶۰ء	۱-۲۲
۳۔	" " " (قسط ۲)	" "	۱	۴	اکتوبر	"	۸۷-۱۱۵
۴۔	" " " (قسط ۳)	" "	۲	۳	جولائی	۱۹۶۱ء	۱۰۹-۱۴۴
۵۔	" " " (قسط ۴)	" "	۵	۱	جنوری	۱۹۶۴ء	۱-۲۷
۶۔	پولیٹکل سوشیالوجی	ابوالفضل عثمانی	۸	۲	"	۱۹۶۸ء	۶۲-۷۳
۷۔	پولیٹکل سوشیالوجی کے بنیادی مسائل اور پولیٹکل کلچر	" "	۱۰	۲		۱۹۷۰ء	۳۷-۵۰
۸۔	سماجی تحفظ اور ہندوستان میں اس کی روایات	نجم الحسن	۱۲	۳	اکتوبر	۱۹۷۲ء	۱-۲۲
۹۔	مارکس اور ہیگل کے فلسفوں کی تطبیق	ظفر احمد صدیقی	۸	۳	اپریل	۱۹۶۸ء	۵-۲۰
۱۰۔	لسانی تعصب اور قومی یکجہتی	انوار الحق حقی	۱۲	۳		۱۹۷۲ء	۵۲-۶۳

سیاسیات

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	ارسطو کے سیاسی نظریے	معین الظفر	۲	۳	جولائی	۱۹۶۱ء	۷۲-۱۰۸

میکیاویلی (۱۴۶۹ء - ۱۵۲۷ء) اٹلی کا مشہور سیاست داں اور مفکر تھا۔ اس کی دو کتابیں "حکمران" اور "مقالات" بہت مشہور رہیں۔

صنعت و تجارت

طبیعیات

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمار	ماہ	سال	صفحات
۶۔	کیا کوارک کا طبعی وجود ہے؟ (QUARK)	محمد ظل الرحمٰن خاں	۱۱	۱	۷۱	۱۹۷۱ء	۱۱۲-۱۱۰
۷۔	نوبل انعامات	سید الطاف چغتائی	۱۴	۲-۱	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۱۲۸-۱۲۱

عربی ادب

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمار	ماہ	سال	صفحات
۱۔	ابن جوزی کی تحریروں کی ادبی حیثیت	محمد راشد ندوی	۱۹	۴-۳	جولائی دسمبر	۱۹۸۲ء	۴۶-۳۲
۲۔	ابونواس (عہد عباسی کا شہرۂ آفاق شاعر خمریات)	مسعود انور علوی کاکوروی	۲۱	۲-۱	جنوری جون	۱۹۸۴ء	۵۸-۲۱
۳۔	" " " (قسط ۲)	" " "	۲۱	۴-۳	جولائی دسمبر	"	۶۶-۲۷
۴۔	المنفلوطی کی حیات اور کارنامے	سمیع اللہ اسد	۱۶	۴-۱		۱۹۷۹ء	۱۸۲-۱۶۱
۵۔	امرؤ القیس۔ جاہلی دور کا نمائندہ شاعر	غلام مصطفیٰ	۱۶	۴-۱		"	۲۲-۱
۶۔	اہل ہند کی عربی شاعری کی قدر و قیمت	حامد علی خاں	۲۰	۴-۳		۱۹۸۳ء	۹۲-۵۹
۷۔	جدید عربی نثر نگاری اور محمود العقاد	محمد راشد ندوی	۱۷	۱	جنوری	۱۹۸۰ء	۶۰-۴۵
۸۔	جریر کی شاعری اور فنی نقائص	عبد الباری	۱۶	۴-۱		۱۹۷۹ء	۸۴-۵۰
۹۔	حافظ ابراہیم (عصر جدید کا ایک سماجی شاعر)	سید احتشام احمد ندوی	۴	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۷۲-۶۰
۱۰۔	دور جدید کا فنکار (توفیق الحکیم)	محمد راشد ندوی	۱۶	۴-۱		۱۹۷۹ء	۲۱۷-۱۸۴
۱۱۔	سنسکرت کہانی سے عربی ناول نگاری تک	بدر الدین	۱۸	۴-۳	جولائی دسمبر	۱۹۸۱ء	۵-۱
۱۲۔	عربی ادب میں تنقیدی رجحانات		۹	۲		۱۹۶۹ء	۴۵-۳۴
۱۳۔	علامات قرأت کے بارے میں سرسید کے خیالات	سید احمد خاں	۱	۲	جولائی	۱۹۷۰ء	۱۰۰-۹۰
۱۴۔	فرزدق	حامد علی خاں	۱۶	۴-۱		۱۹۷۹ء	۱۴۰-۸۵
۱۵۔	قدیم عربی ادب میں قصہ گوئی	محمد مہدی انصاری	۱۲	۲-۱		۱۹۷۲ء	۱۴۰-۱۲۷
۱۶۔	متنبی	غلام مرتضیٰ	۱۶	۴-۱		۱۹۷۹ء	۴۹-۳۳
۱۷۔	محمود تیمور جدید عربی ناول نگاری کا علم بردار	بدر الدین	۱۷	۱	جنوری	۱۹۸۰ء	۹-۱

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۸	مصر کا ایک نامور مصنف — احمد امین	مختار الدین	۷	۲	جنوری	۱۹۶۷ء	۸۶-۷۵
۱۹	مصری ادب میں ڈرامانگاری کا ارتقاء	محمد اسلم اصلاحی	۱۷	۱	"	۱۹۸۰ء	۳۴-۱۰
۲۰	مصری افسانہ نگاری کے جدید رجحانات	محمد راشد	۱۳	۴	دسمبر	۱۹۷۳ء	۴۵-۲۷
۲۱	نہج البلاغہ	خلیق احمد نظامی	۱	۳	جولائی	۱۹۶۰ء	۱۰۹-۱۰۵
"نہج البلاغہ" کا قدیم ترین قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اس نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔							
۲۲	نہج البلاغہ کا تنقیدی مطالعہ	سید محمود حسن قیصر	۱۷	۲	اپریل	۱۹۸۰ء	۳۹-۱۷
۲۳	ہندوستان میں عربی شاعری کا ارتقاء	محمد اسلم اصلاحی	۱۹	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۲ء	۲۵-۱۲
علم جراحت (SURGERY)							
۱	رموز جراحت	نسیم انصاری	۱۳	۴	دسمبر	۱۹۷۳ء	۲۶-۲۰
۲	سرجری	" "	۱۴	۱-۲	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۱۰۶-۹۵
علم طب							
۱	تسمم درقی (THYROTOXICOSIS)	سید مسعود اشرف	۸	۴		۱۹۶۸ء	۹۹-۹۲
۲	دو نادر طبی مخطوطات	کمال الدین حسینی	۲۱	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۴ء	۲۴-۱۷
۳	صحت قلب	" " "	۱۹	۳-۴	" "	۱۹۸۲ء	۱۱-۱
۴	کینسر	نسیم انصاری	۷	۳	جولائی	۱۹۶۷ء	۲۷-۲۲
۵	معالجات بقراطیہ اور طبی ضابطۂ اخلاقیات	شفقت اعظمی	۱۷	۲	اپریل	۱۹۸۰ء	۱۶-۱
علم کتاب خانہ							
۱	اشاریہ فکر و نظر	احتشام بن حسن	۶	۴	اکتوبر	۱۹۶۵ء	۱۲۷-۱۱۴
۲	تنسیق علوم کی اجمالی تاریخ	محمود حسن قیصر امروہوی	۳	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۱۰۷-۷۳

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۳۔	کتاب نمبر	محمود حسن قیصر امروہوی	۴	۲	اپریل	۱۹۶۳ء	۱۰۷-۷۳
۴۔	مشرقی کتب خانے اور ان کی جدید تکنیکی تنظیم	" " "	۱۵	۲-۱	مارچ جون	۱۹۷۸ء	۹۸-۷۱
	علی گڑھ تحریک						
۱۔	ایم۔ اے۔ او۔ کالج سے متعلق غیر مطبوعہ خطوط	یوسف حسین خاں	۵	۴	اکتوبر	۱۹۶۴ء	۲۰۵-۲۰۱
۲۔	" " " (قسط ۲)	" "	۶	۱	جنوری	۱۹۶۵ء	۴۰۹-۲۵۱
۳۔	پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ	رشید احمد صدیقی	۳	۳	جولائی	۱۹۶۲ء	۷۹-۴۰
۴۔	سلام ہو تجھ پر	" " "	۲	۲	اپریل	۱۹۶۱ء	۸۱-۵۶
۵۔	سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا	" " "	۳	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۱۱۹-۸۵
۶۔	" " " (قسط ۲)	" " "	۴	۱	جنوری	۱۹۶۳ء	۴۸-۱
۷۔	عزیزانِ علی گڑھ	" " "	۱۲	۲-۱		۱۹۷۲ء	۱۰۶-۹۹
۸۔	" " (قسط ۲)	" " "	۱۲	۳		"	۱۸۲-۱۴۱
۹۔	" " (قسط ۳)	" " "	۱۳	۲-۱		۱۹۷۳ء	۱۰۲-۵۷
۱۰۔	علی گڑھ اور عصر حاضر	آل احمد سرور	۲۲	۲-۱	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۲۴-۱۹
۱۱۔	وقار الملک اور محسن الملک کے خطوط	مشتاق حسین	۱۰	۱		۱۹۷۰ء	۹۲-۸۰
۱۲۔	یہ کارواں ہمارا۔ (اداریہ)	نور الحسن نقوی	۲۲	۲-۱	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۷-۵
۱۳	" " "	" "	۲۳			۱۹۸۶ء	۶-۵
	غالب، مرزا اسد اللہ خان						
۱۔	آب حیات میں مرزا کے ذاتی حالات	محمد انصار اللہ	۹	۲		۱۹۶۹ء	۱۱۱-۱۰۵
۲۔	پورے غالب	آل احمد سرور	۹	۲		"	۱۶۶-۱۱۲
۳	غالب کا محبوب	شمس الرحمٰن فاروقی	۵	۴	اکتوبر	۱۹۶۴ء	۹۲-۸۲

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۔	غالب کی فارسی غزل گوئی	کبیر احمد جائسی	۹	۲		۱۹۶۹ء	۳۶-۲۲
۵	غالب کے اشعار فارسی کا ایک مجموعہ	قاضی عبدالودود	۱	۲	اپریل	۱۹۶۰ء	۹-۱
	غالب کے کلیات نظم فارسی کے قلمی نسخہ مخزونہ خدابخش لائبریری پٹنہ کا تعارف۔						
۶۔	غالب کے کچھ سن و سال	حامد حسن قادری	۱۲	۴		۱۹۶۲ء	۴۴-۱
۷۔	کلام غالب کا جمالیاتی مطالعہ	نورالحسن نقوی	۲۵	۴-۲		۱۹۸۹ء	۵۰-۴۴
۸۔	لکھنؤ کی شاعری پر غالب کا اثر	رحم علی الہاشمی	۹	۲		۱۹۶۹ء	۶۸-۵۷
۹۔	مثنوی ابر گہر بار کا تنقیدی مطالعہ	سید وحید اشرف	۹	۲		"	۵۶-۲۷
۱۰۔	مرزا غالب کا بچپن	واقف مراد آبادی	۹	۲		"	۹۶-۷۹
۱۱۔	مغنی نامہ	خورشید الاسلام	۷	۱	اکتوبر	۱۹۶۶ء	۹۰-۸۱

" غالب کی ایک فارسی مثنوی جس کا عنوان " یا اسداللہ الغالب " ہے، بے تامل و بے تکلف دنیا کی چند اچھی نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ " مغنی نامہ " اس کا ایک حصہ ہے جس میں غالب نے شعر اور موسیقی، فن اور فرد خلاق کی سیرت اور خود اپنا تجربہ بیان کیا ہے۔ چونکہ ایک مختصر مضمون میں اس کے ظاہری اور معنوی پہلوؤں پر جامع تبصرہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اس مثنوی کے چند بنیادی خیالات پیش کرنے پر قناعت کرتا ہوں۔"

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۲۔	نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب	آل احمد سرور	۹	۲		۱۹۶۹ء	۱۰۴-۹۷
۱۳۔	نظم طباطبائی کی شرح دیوان غالب	اشرف رفیع	۱۱	۴		۱۹۷۱ء	۱۱۲-۹۳

فارسی ادب

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	ابوالقاسم لاہوتی	کبیر احمد جائسی	۲۱	۴-۳	جولائی و دسمبر	۱۹۸۴ء	۱۶-۱
۲۔	الحاق اور دیوان انوری ترتیبۂ پروفیسر نفیسی	نذیر احمد	۲	۱	جنوری	۱۹۶۲ء	۱۲۲-۱۰۶
۳۔	ایران کی دو معاصر شاعرات	منیب الرحمٰن	۸	۱	اکتوبر	۱۹۶۷ء	۹۸-۹۱

" پروین اعتصامی " اور " فرخ زاد " کی شاعری اور فن پر تبصرہ۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴-	تذکرہ مخزن الغرایب کا ایک مکمل اور قدیم ترین مخطوطہ	اکبر حیدری کاشمیری	۱۳	۳	اکتوبر	۱۹۷۳ء	۸۴-۶۵

"مخزن الغرایب" مولفہ شیخ احمد علی ہاشمی سندیلوی، فارسی شعرا کا ایک اہم تذکرہ ہے۔ اس کا قدیم ترین قلمی نسخہ ۱۲۱۹ھ کا مکتوبہ ہے۔ یہ راجہ محمود آباد صاحب کے کتابخانہ میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵-	حافظ شیرازی کی ایک نایاب تاریخی غزل		۱۲	۳		۱۹۷۲ء	۹۲-۷۲
۶-	حافظ شیرازی کے دو قدیم ترین ماخذ یعنی لطائف اشرفی اور مکتوبات اشرفی	نذیر احمد	۱	۱	جنوری	۱۹۶۰ء	۸۶-۶۴
۷-	دیوان حافظ	خلیق احمد نظامی	۲	۳	جولائی	۱۹۶۱ء	۱۵۲-۱۴۷

"دیوان حافظ" کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۹۷۱ھ/ ۱۵۶۳ء مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۸-	دیوان سراجی	نذیر احمد	۳	۱	جنوری	۱۹۶۲ء	۱۰۵-۱۰۰
۹-	دیوان نوعی	قاضی عبدالودود	۱	۴	اکتوبر	۱۹۶۰ء	۷۱-۵۸

"دیوان نوعی" کا ایک نادر مخطوطہ مکتوبہ ۱۰۱۹ھ خدابخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ اس مضمون میں اسی نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۰-	سامانی عہد کا نثری ترجمۂ کلیلہ و دمنہ	راج انیل پرشاد جلیسی	۳	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۶۴-۴۶
۱۱-	سلاطین و اُمرائے مغلیہ کا نیا کلام	نذیر احمد	۴	۱	جنوری	۱۹۶۳ء	۷۵-۴۹
۱۲-	شاہان شرقی کے دور کا ایک شاعر (ملک عزیز اللہ بسطامی)	"	۱۲	۳		۱۹۷۲ء	۵۲-۲۲
۱۳-	شیراز ہند جونپور کا مایۂ ناز صوفی شاعر نور محمد شاہ کامیاب صبر حدی	شمس عالم خاں	۱۷	۲	اپریل	۱۹۸۰ء	۵۸-۴۰

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۴۔	عبدالعظیم قریب	کبیر احمد جائسی	۱۰	۲		۱۹۷۰ء	۱۰۵-۷۹
۱۵۔	عرفی شیرازی	نبی ہادی	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۸۷-۷۵
۱۶۔	عہد حافظ کی ادبی روایت	کبیر احمد جائسی	۶	۳	جولائی	۱۹۶۵ء	۱۰۴-۹۶
۱۷۔	عہد شاہجہانی کا ایک قابل توجہ شاعر یعنی سعید قریشی	امیر حسن عابدی	۴	۱	جنوری	۱۹۶۲ء	۱۲۴-۹۵
۱۸۔	فوائد غیاثی اور ہندوستان	نذیر احمد	۶	۴	اکتوبر	۱۹۶۵ء	۱۱۲-۸۷

فوائد غیاثی فارسی رقعات کا ایک اہم اور ضخیم مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب جلال الدین یوسف ہیں۔ اس میں دوسری صدی ہجری سے او اسط نویں صدی ہجری کے تقریباً دو سو مشاہیر کے کم و بیش آٹھ سو خطوط شامل ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۹۔	مثنوی شمع و پروانہ	اکبر الدین صدیقی	۱۲	۳	اکتوبر	۷۳-۱۹۷۲ء	۶۴-۵۲
۲۰۔	" " (قسط ۲)	" "	۱۲	۴	دسمبر	"	۱۸-۱

"شمع و پروانہ" اہلی شیرازی کی مشہور مثنوی ہے۔ قسط اول میں اس کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اور دوسری قسط میں اس کا متن پیش کیا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۱۔	محاکمات الشعراء	عبدالقادر سروری	۴	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۵۹-۴۹

محاکمات الشعراء میر محمد محسن محسن کا ایک اہم رسالہ ہے جس میں شیخ علی حزیں اور سراج الدین علی خاں آرزو کے ادبی تنازعے پر محاکمہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۲۔	مرگ مادر (افسانہ)	علی دشتی، مترجمہ راشد حسین	۱۷	۴-۳	جولائی دسمبر	۱۹۸۰ء	۶۸-۶۰
۲۳۔	مولانا حمید الدین قلندر اور اُن کے چند ہم عصر شعراء	نذیر احمد	۶	۲	اپریل	۱۹۶۵ء	۳۴-۱
۲۴۔	مونس الاحرار بمولفہ احمد بن محمد کلاتی اصفہانی	" "	۲	۴	اکتوبر	۱۹۶۱ء	۵۲-۱۵

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات

"مونس الاحرار" فارسی اشعار کی نہایت اہم بیاض ہے۔ اس کا واحد قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس مضمون میں اس نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۵۔	نفائس المآثر۔	خلیق احمد نظامی	۱	۴	اکتوبر	۱۹۷۰ء	۱۲۹-۱۴۲

"نفائس المآثر" عہد اکبری کے مشہور ادیب اور مورخ میر علاء الدولہ کامی قزوینی کی تالیف ہے جس میں سولہویں صدی عیسوی کے فارسی شعراء اور شاہان مغلیہ کے حالات درج ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری میں اس کا قدیم ترین نسخہ محفوظ ہے۔ یہاں اس نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۶۔	طوطی ہند (حضرت امیر خسرو)	قمر غفار	۲۱	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۴ء	۵۹-۶۸
۲۷۔	چہار مقالہ کا سال تصنیف	شبیر احمد خاں غوری	۲	۳	جولائی	۱۹۶۱ء	۵۵-۷۱
۲۸۔	چہار مقالہ	نذیر احمد	۳	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۱۰۷-۱۱۲

"چہار مقالہ" کا اصل نام "مجمع النوادر" ہے۔ اس کا شمار فارسی نثر کی اہم ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس کا مصنف نظامی عروضی سمرقندی ہے جس نے ۵۵۰ھ کے قریب اسے تالیف کیا۔ زیر نظر مضمون میں اس کی فنی اور ادبی حیثیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

فارسی زبان

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	امیر خسرو کا فارسی تلفظ (بحث ہائے مخفی)	امتیاز علی خاں عرشی	۱۲	۱-۲		۱۹۷۲ء	۳۲-۵۲
۲۔	پہلوی زبان	سیّد وحید اشرف	۹	۳		۱۹۶۹ء	۴۶-۶۴
۳۔	فارسی املا کے مسائل	نذیر احمد	۵	۳	جولائی	۱۹۶۴ء	۴۷-۷۲
۴۔	فارسی زبان کا ارتقاء	علی اصغر حکمت، مترجمہ محمد ضیاء الدین انصاری	۱۱	۳		۱۹۷۱ء	۴۵-۵۵
۵۔	ہائے مخفی اور اس سے متعلق دستور عام و املائی مسائل	نذیر احمد	۱۲	۱-۲		۱۹۷۲ء	۵۳-۷۶

فارسی لغات

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	تیغ تیز	قاضی عبد الودود	۲	۳	جولائی	۱۹۶۱ء	۴۰-۵۴

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۔	فارسی کی ایک قدیم فرہنگ زفان گویا	سید حسن	۳	۳	جولائی	۱۹۶۲ء	۹۵-۸۰
۳۔	فرہنگ نامۂ قواس	نذیر احمد	۴	۳	"	۱۹۶۵ء	۵۵-۱

فرانسیسی ادب

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	بالزاک کا آرٹ*	یوسف حسین خاں	۲	۴	اکتوبر	۱۹۶۱ء	۹۲-۸۱

*بالزاک (BALZAC) فرانس کا مشہور ناول نگار تھا۔

فلسفہ

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	ابن تیمیہ بحیثیت مفکر و مصلح	محمد عمر الدین	۳	۳	جولائی	۱۹۶۲ء	۴۶-۲۵
۲۔	برٹرینڈرسل کا تحلیلی فلسفہ	انظار الحق	۱۸	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۱ء	۲۹-۱
۳۔	" " " (قسط ۲)	" "	۱۸	۳-۴	جولائی دسمبر	"	۴۳-۲۵
۴۔	جدیدیت کے بنیادی تصورات	وحید اختر	۸	۳	جولائی	۱۹۶۸ء	۴۴-۱۵
۵۔	جی۔ ای۔ مور۔ بیسویں صدی کا ایک ممتاز برطانوی فلسفی	محمد انظار الحق	۱۹	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۲ء	۴۳-۲۲
۶۔	" " (قسط ۲)	" "	۲۰	۳-۴		۱۹۸۳ء	۳۲-۱
۷۔	" " (قسط ۳)	" "	۲۱	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۴ء	۲۹-۱
۸۔	فلسفہ سائنس اور مذہب	ذوالفقار احمد	۲۱	۳-۴	جولائی دسمبر	"	۸۱-۶۷
۹۔	مسکویہ کا تصور ارتقار	عبدالحق	۲	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۶۹-۵۵

کتاب خانے

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	کتاب خانۂ ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد	سید فیض علی	۱۹	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۲ء	۵۴-۴۷
۲۔	کتاب خانہ حبیب گنج	نذیر احمد	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۱۱۸-۹۲

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
	کتابیات						
۱۔	نقشِ ذاکر	محمد ضیاء الدین انصاری	۱۳	۴	دسمبر	۱۹۷۳ء	۱۹-۲۹
	ڈاکٹر ذاکر حسین کی تصانیف کی وضاحتی فہرست۔						
	گاندھی جی						
۱۔	گاندھی جی	برہم دت	۹	۴		۱۹۶۹ء	۴۴-۵۰
۲۔	گاندھی جی اور اسلام	سید مقبول احمد	۹	۴		"	۲۴-۴۲
۳۔	گاندھی جی اور قومی تعلیم	سید محمد ضیاء الدین علوی	۹	۴		"	۸۵-۹۸
۴۔	گاندھی جی اور مسئلہ تعلیم	" "	۹	۱	اکتوبر	۱۹۶۸ء	۶۶-۷۷
۵۔	گاندھی جی اور ہندوستان کا لسانی مسئلہ	عبد الغفار شکیل	۹	۴		۱۹۶۹ء	۹۹-۱۲۶
۶۔	گاندھی جی کا تصور حق	سعید احمد اکبر آبادی	۹	۴		"	۷-۱۶
۷۔	گاندھی جی کا سیاسی فلسفہ	محمد ہاشم قدوائی	۹	۴		"	۵۱-۷۷
۸۔	گاندھی جی کا فلسفۂ تعلیم	سید محمد ضیاء الدین	۸	۳	اپریل	۱۹۶۸ء	۸۱-۸۷
۹۔	گاندھی جی کی عظمت کا راز	ریاض الرحمٰن خاں شروانی	۹	۴		۱۹۶۹ء	۷۸-۸۴
۱۰۔	مہاتما گاندھی اور فرقہ واریت	ہربنس لال شرما	۹	۴		"	۱۷-۲۳
	لسانیات						
۱۔	اردو مارفالوجی کا خاکہ	اقتدار حسین خاں	۱۵	۳-۴	ستمبر دسمبر	۱۹۷۸ء	۴۳-۵۲
۲۔	زبان اور بولیاں	عبد الغفار شکیل	۹	۱	اکتوبر	۱۹۶۸ء	۴۱-۶۵
۳۔	زبان کیا ہے	عتیق احمد صدیقی	۸	۳	اپریل	"	۶۹-۸۰
۴۔	لسانیات۔ عہد بہ عہد	" "	۸	۴	جولائی	"	۷۵-۹۱
	ماحولیات						
۱۔	ہندوستان میں کثافت آب و ہوا۔ ایک جائزہ	محمد اجمل	۱۸	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۱ء	۴۹-۶۳

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
مذاہب							
۱۔	حال نامہ بایزید انصاری	خلیق احمد نظامی	۱	۱	جنوری	۱۹۶۰ء	۱۲۵-۱۲۷

"حالنامہ" تحریک روشنائی کے بانی بایزید انصاری (۱۵۲۸ تا ۱۵۸۱ء) کے حالات میں ایک اہم تالیف ہے اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہے۔ اس مضمون میں اسی نسخہ کا اجمالی تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۔	دساتیر پر ایک نظر	نذیر احمد	۱	۲	اپریل	۱۹۶۰ء	۱۰-۴۲
۳۔	فرقہ نقطوی پر ایک طائرانہ نظر	" "	۱	۳	جولائی	"	۲۲-۵۸
مشرق وسطیٰ							
۱۔	عرب قوم پرستی۔ ایک تاریخی جائزہ	محمد اقبال انصاری	۱۳	۴	دسمبر	۱۹۷۳ء	۵۴-۷۲
۲۔	مغربی ایشیا میں فوجی انقلاب	شاہ عبدالقیوم	۱۲	۳		۱۹۷۲ء	۶۵-۸۰
معاشیات							
۱۔	ابو یوسف کا معاشی فکر	نجات اللہ صدیقی	۵	۱	جنوری	۱۹۶۴ء	۶۶-۹۵

قاضی ابو یوسف خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں بغداد کے قاضی القضاۃ تھے۔ "کتاب الخراج" ان کی مشہور کتاب ہے، جس میں انتظامی اور معاشی امور، بالخصوص محاصل اور ان کی شرعی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۔	بیرونی امداد اور ہندوستان کی اقتصادی ترقی	محمد شبیر خاں	۸	۲	اپریل	۱۹۶۸ء	۲۱-۴۶
۳۔	بین الاقوامی اقتصادی عدم مساوات اور تجارتی پالیسی	ادریس احمد قریشی	۱۰	۲		۱۹۷۰ء	۲۳-۳۶
۴۔	ترقی کے دس برس میں مجلس اقوام متحدہ کا حصہ	محمد شبیر خاں	۷	۲	جنوری	۱۹۶۷ء	۷-۱۵
۵۔	جواہر لال نہرو اور ہندوستان کی معاشی ترقی	اولاد احمد صدیقی	۷	۲	اپریل	۱۹۶۷ء	۴۴-۵۲

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۶۔	رانا ڈے کا معاشی تفکر	اولاد احمد صدیقی	۸	۲	جنوری	۱۹۶۸ء	۵-۲۱
۷۔	قدیم ہندوستان میں اقتصادی نظام	نور محمد	۱۵	۱-۲	مارچ جون	۱۹۷۸ء	۶۲-۷۰
۸۔	کینز اور ہم	اولاد احمد صدیقی	۱۲	۱-۲		۱۹۷۲ء	۲۶-۱۱۱

"مشہور ماہر اقتصادیات لے نارڈ کینز کے اقتصادی نظریات اور اس کی تصانیف سے بحث۔"

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۹۔	گوکھلے اور ان کا عہد	اولاد احمد صدیقی	۷	۱	اکتوبر	۱۹۶۶ء	۲۵-۴۰

"اس مضمون کا مقصد اُن اہم معاشی مسائل کا تنقیدی جائزہ لینا ہے جو انیسویں صدی کے نصف آخر سے لیکر پہلی جنگ عظیم تک ہندوستان کی معیشت پر اثر انداز رہے۔ ان مسائل پر جن اشخاص نے اظہار خیال کیا ہے، ان میں مہادیو گووند رانا ڈے، دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہمیں اس وقت گوکھلے کے کارنامے اور شخصیت سے بحث ہے۔"

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۰۔	مبادلات خارجہ کی ترتیب نو پر ایک نظر	نجم الحسن	۱۲	۱-۲		۱۹۷۲ء	۵-۱۹
۱۱۔	معاشی جائزہ: چوتھے پنج سالہ منصوبے کا خاکہ	اولاد احمد صدیقی	۷	۱	اکتوبر	۱۹۶۶ء	۹۱-۹۲
۱۲۔	معاشیات پس ماندگی	" "	۱۱	۴		۱۹۷۱ء	۴۹-۶۴
۱۳۔	نظریۂ قدر محنت	" "	۱۳	۴	دسمبر	۱۹۷۳ء	۴۶-۵۳
۱۴۔	ہمارا تیسرا پنج سالہ منصوبہ	نجات اللہ صدیقی	۳	۱	جنوری	۱۹۶۲ء	۱-۳۰
۱۵۔	ہماری معاشی منصوبہ بندی	محمد شبیر خاں	۱	۴	اکتوبر	۱۹۶۰ء	۱-۲۹
۱۶۔	ہندوستان کی منصوبہ بندی میں حکمت عملی	" " "	۷	۴	جولائی	۱۹۶۷ء	۱-۱۵
۱۷۔	ہندوستان کے سرکاری منطقہ میں متوازن بورڈ کی ضرورت	قمر حسین فاروقی	۷	۳	اپریل	"	۸۴-۹۲
۱۸۔	ہندوستان میں حالیہ معاشی پس روی	مسعود حسن	۱۰	۱		۱۹۷۰ء	۹۴-۱۰۲

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۹۔	ہندوستانی معیشت ۱۹۸۰ء میں	اولاد احمد صدیقی	۱۷	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۰ء	۱-۹
	مصر						
۱۔	انیسویں صدی میں مصر کے تعلیمی رجحانات اور شیخ محمد عبدہ	محمد راشد	۱۰	۲		۱۹۷۰ء	۵۱-۶۲
۲۔	مصر کی ایک سیاسی اور سماجی تحریک	" "	۱۰	۳-۴		"	۱۰۸-۱۲۸
	منطق						
۱۔	جدید ریاضی میں منطق کی اہمیت	محمد ابوالکاظم	۱۴	۱-۲	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۶۹-۸۲
	نباتات						
۱۔	جنین تخم کی مصنوعی پرورش اور اس کی اہمیت	رعایت خاں	۹	۱	اکتوبر	۱۹۶۸ء	۷۸-۸۸
	نفسیات						
۱۔	آپ وسوسوں کو دور رکھ سکتے ہیں۔	مترجمہ: سید صدیق حسن کروی	۳	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۱۰۱-۱۰۶
	YOU CAN RESIST TEMPTAION BY SMILEY BLANTON کا اردو ترجمہ						
۲۔	انسانی فطرت کے حدود و تنوع	اے۔ ایچ۔ میسلو، مترجمہ معزز علی بیگ	۹	۲	-	۱۹۶۹ء	۲۲-۳۲
۳۔	انگریزی حکمراں طبقہ کا کردار کا نفسیاتی پس منظر	اولاد احمد صدیقی	۸	۴	جولائی	۱۹۶۸ء	۷-۱۴
۴۔	ایک نفسیاتی مسئلہ	اے۔ ایچ۔ میسلو، مترجمہ معزز علی بیگ	۹	۱	اکتوبر	"	۷-۲۸
	A.H. MASLOW کے ایک مضمون کا ترجمہ۔						
۵۔	جدید نفسیات اور انسان کے اخلاقی کردار کا مسئلہ	معزز علی بیگ	۷	۲	جنوری	۱۹۶۷ء	۲۳-۶۵

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۶۔	جدید نفسیات اور انسان کے اخلاقی کردار کا مسئلہ (قسط ۲)	معزز علی بیگ	۷	۲	اپریل	۱۹۶۷ء	۶۲-۵۲
۷۔	علامت کا تصور	ابن فرید	۸	۴	جولائی	۱۹۶۸ء	۷۴-۴۴
۸۔	فرائڈ کا نظریۂ لاشعور	ظفر احمد صدیقی	۷	۲	اپریل	۱۹۶۷ء	۶۲-۵۲
۹۔	فلسفہ اور تحلیل نفسی	" " "	۱۰	۲		۱۹۷۰ء	۲۲-۱۹
۱۰۔	مضطرب طالب علم	اولاد احمد صدیقی	۱۰	۳-۴		"	۷۷-۷۲
۱۱۔	وجودی تحلیل نفسی	ظفر احمد صدیقی	۵	۲	جولائی	۱۹۶۴ء	۴۶-۲۷

وسط ایشیا

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	عہد وسطیٰ میں یورپ اور وسطی ایشیا	سید محمد ضیاء الدین علوی	۷	۴	جولائی	۱۹۶۷ء	۶۴-۵۴

ہندوستان

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	براعظم گونڈوانہ لینڈ کے خاکے میں افریقہ کے بالمقابل ہندوستان کا مقام	فخر الدین احمد	۱۰	۳-۴		۱۹۷۰ء	۵۸-۲۵
۲۔	تاریخ کا سبق — ایک مطالعہ	قمر غفار	۲۱	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۴ء	۲۶-۲۵
۳۔	ذخیرۃ الخوانین کا ایک اہم نسخہ	محمد شمعون اسرائیلی	۳	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۵۲-۳۴

ذخیرۃ الخوانین دور اکبری سے عہد شاہجہانی تک کے امراء و خوانین کا تذکرہ ہے۔ اس کے مصنف شیخ فرید بھکری ہیں اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اس نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۔	ذکر ملوک	خلیق احمد نظامی	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۱۳۴-۱۳۱

" ذکر ملوک " شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی تالیف ہے جس میں سلطان معز الدین محمد بن سام کے زمانے سے لے کر عہد اکبری تک کے تاریخی واقعات درج ہیں۔ اس کا ایک مخطوطہ جو ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱ء کا مکتوبہ ہے۔ مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی مخطوطہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵	سترہویں صدی کے ایک فرانسیسی سیاح کے تاثرات	خلیق احمد نظامی	۱	۲	اپریل	۱۹۶۰ء	۴۵-۴۴

فرانسیسی سیاح برنیر (BERNIER) کے ہندوستان کے سفرنامے پر تفصیلی بحث۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۶	سلاطین گجرات کی ایک نادر تاریخ	نذیر احمد	۱	۴	اکتوبر	۱۹۶۰ء	۷۲-

تاریخ گجرات کا ایک مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس مضمون میں اسی مخطوطہ کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۷	طبقات اکبری	خلیق احمد نظامی	۱	۲	اپریل	۱۹۶۰ء	۱۳۲-۱۳۱

طبقات اکبری عہد اکبری کے مشہور مورخ نظام الدین احمد بخشی کی تالیف ہے جس کا قدیم ترین قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس مضمون میں اسی نسخہ کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۸	محمود شاہ تغلق کے ایک فرمان کی بابت آزاد بلگرامی کی شہادت	نذیر احمد	۱	۳	جولائی	۱۹۶۰ء	۸۹-۸۴
۹	مرزا عزیز کوکہ	ام ہانی فخر الزماں	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۱۲۷-۱۱۹
۱۰	عربوں کے ہندوستان پر احسانات	سید مقبول احمد	۷	۳	جولائی	۱۹۶۷ء	۸۳-۷۷
۱۱	ہندوستان قزوینی کے بیانات کی روشنی میں	محمود حسن قیصر امروہوی	۶	۱	جنوری	۱۹۶۵ء	۴۸-۱
۱۲	ہندوستان میں انسانی معیار کی بلندی اور بقا کے لیے اچھے انتظامیہ کی ضرورت	قمر حسین فاروقی	۱۰	۲		۱۹۷۱ء	۶۲-۵۵
۱۳	ہندوستان میں جمہوریت اور اس کا مستقبل	معراج احمد	۱۷	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۰ء	۱۶-۱۰

ہندوستان کی تاریخ تحریک آزادی

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱	انڈین نیشنل کانگریس کی صد سالہ تاریخ	محمد انتظار الحق	۲۲	۴	اکتوبر	۱۹۸۵ء	۱۰۵-۶۶
۲	اودھ اور جنگ آزادی	میرزا کوکب قدر	"	"	"	"	۴۹-۴۶
۳	جنگ آزادی میں اردو کا حصہ	محمد قاسم صدیقی	"	"	"	"	۵۲-۵۰

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۔	چند مسلم مجاہدین آزادی	سید مشرف علی	۲۲	۴	اکتوبر	۱۹۸۵ء	۱۴۸-۱۳۲
۵۔	خلافت تحریک	اخلاق احمد	"	"	"	"	۶۵-۵۳
۶۔	ریشمی رومال تحریک	محمد صلاح الدین عمری	"	"	"	"	۳۱-۲۶
۷۔	سراج الدولہ۔ ایک مدبر حکمراں	ریشماں سہیل	"	"	"	"	۱۴۲-۱۲۸
۸۔	شاہ ولی اللہ کا مجاہدانہ اور قائدانہ کارنامہ	سید ابوالحسن علی ندوی	"	"	"	"	۲۰-۱۲
۹۔	شہید آزادی۔ سید احمد شہید	عتیق احمد صدیقی	"	"	"	"	۲۵-۲۰
۱۰۔	علی گڑھ اور تحریک آزادی	وصی الرحمٰن	"	"	"	"	۱۲-۶
۱۱۔	مجاہد آزادی۔ ٹیپو سلطان	ظفر الاسلام	"	"	"	"	۱۳۷-۱۲۶
۱۲۔	مسلم لیگ کی تاریخ	عبید اللہ فہد	"	"	"	"	۱۲۵-۱۱۹
۱۳۔	ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی	شجاع الدین فاروقی	"	"	"	"	۴۵-۴۲
۱۴۔	ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں جمعیۃ علماء کا حصہ	محمد ضیاء الدین انصاری	"	"	"	"	۱۱۸-۱۰۶

ہندی ادب

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	چھایاواد	زیدی جعفر رضا	۱۵	۱-۲	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۶۲-۱۷
۲۔	سید غلام نبی رسلین بلگرامی کے متفرق ہندی گیت	" "	۶	۱	جنوری	۱۹۶۵ء	۱۳۰-۵۶
۳۔	مولانا داؤد اور ان کی چنداین	الطاف حسین ندوی	۱۷	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۰ء	۴۹-۳۱
۴۔	میرابائی اور اس کے گیت	نورالحسن نقوی	۱۹	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۲ء	۹۶-۷۷
۵۔	نرالا کی شاعری	سری نواس لاہوٹی	۵	۳	جولائی	۱۹۶۴ء	۱۰۳-۹۴

یونانی ڈرامہ

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	یونانی المیہ	اسلوب احمد انصاری	۱	۱	جنوری	۱۹۶۰ء	۶۲-۴۵

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
	مشاہیر تذکرہ						
۱۔	آرزو بلگرامی۔ صغیر بلگرامی (خط کے آئینے میں)	مرتضیٰ حسین بلگرامی	۱۷	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۰ء	۰
۲۔	اقبال سہیل	اخلاق احمد	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۸ء ۱۹۸۸ء	۲۱۸-۲۰۹
۳۔	اوٹو اسپیس: علی گڑھ کا ایک جرمن مستشرق	اکمل ایوبی	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۷۰-۲۶۳

OTTO SPEASE یہ اصلاً جرمنی کی یہودی نسل سے تھے۔ مشرقی علوم بالخصوص اسلامیات سے خصوصی شغف تھا۔ ۱۹۳۲ء میں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں پروفیسر اور صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں سبکدوش ہو کر واپس اپنے وطن جرمنی چلے گئے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۔	ایل کے۔ حیدر	مختار مسعود	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۸ء ۱۹۸۸ء	۲۱۶-۲۰۵

ڈاکٹر لودی کریم حیدر مسلم یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ لندن میں انتقال کیا۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵۔	بابائے اردو مولوی عبدالحق	ابن علی بدایوانی	۹	۱	اکتوبر	۱۹۶۸ء	۹۸-۸۹
۶۔	" " " مرحوم	رشید احمد صدیقی	۲	۴	"	۱۹۶۱ء	۱۱۲-۹۳
۷۔	بابو جادو چندر چکرورتی	ایم۔ اے۔ پٹھان	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۶۲-۲۵۷

آپ علی گڑھ کالج میں ریاضی کے پروفیسر تھے۔ ۱۸۸۷ء میں کالج سے وابستہ ہوئے۔ ۲۸ فروری ۱۹۱۶ء کو کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ کالج کے رجسٹرار کی حیثیت سے بھی کچھ عرصہ کام کیا۔ ریاضی پر آپ کی بے شمار تصانیف ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۸۔	پرنسپل تھیوڈور بیک	نفیس بانو	۲۲	۱-۳	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۲۷۰-۲۵۹

THEODORE BECK علی گڑھ کالج کے تقریباً پندرہ سال تک پرنسپل رہے۔ یکم فروری کو اپنے عہدہ کا چارج لیا ۲ ستمبر ۱۸۹۹ء کو انتقال کیا۔ آخر وقت تک بحیثیت پرنسپل کام کرتے رہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۹۔	پرنسپل تھیوڈور مارسین	ظفر الاسلام	۲۲	۱-۳	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۲۸۲-۲۷۱

THEODORE MORYSON (۱۸۶۳ء-۱۹۳۶ء) اکتوبر ۱۸۸۹ میں کالج میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اکتوبر ۱۸۹۹ء میں کالج کے پرنسپل بنے۔ ۱۹۰۴ء میں سبکدوشی حاصل کی۔ ۱۹۰۵ء میں انگلستان واپس چلے گئے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۰۔	پرنسپل جے۔ ایچ۔ ٹول	قمر الہدیٰ فریدی	۲۲			۱۹۸۶ء	۲۸۰-۲۷۱

J. H. TOWEL یکم نومبر ۱۹۰۹ء کو علی گڑھ کالج کے پرنسپل بنائے گئے۔ اس وقت وہ تقریباً سات سال سے پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ۲۸ فروری ۱۹۱۹ء کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۱۔	پرنسپل ڈبلیو اے۔ جے۔ آرچبولڈ	قمر الہدیٰ فریدی	۲۲	۱-۲	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۲۹۰-۲۸۳

W. A. J. ARCHBOLD ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو علی گڑھ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے، یکم نومبر ۱۹۰۹ء کو مستعفی ہوئے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۲۔	پروفیسر ابوبکر حلیم	جلیل قدوائی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۹۴-۲۸۷

پروفیسر ابوبکر احمد حلیم ۱۹۲۱ء میں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ و سیاسیات کے پروفیسر و صدر مقرر ہوئے۔ بعد میں یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر بنے۔ یہاں سے سبکدوش ہو کر کراچی چلے گئے۔ وہاں پہلے سندھ یونیورسٹی اور بعد میں کراچی فیڈرل یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۳۔	پرنسپل سر ٹامس واکر آرنلڈ	عبدالباری	۲۲	۱-۲	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۲۵۸-۲۴۳

SIR THOMAS WALKER ARNOLD دسمبر ۱۸۸۷ء میں علی گڑھ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۹۷ء میں انھوں نے علی گڑھ کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل بن گئے۔ ۱۹۰۴ء میں وہ لندن واپس چلے گئے۔ اسلامیات سے انھیں خصوصی شغف تھا۔ "PREACHING OF ISLAM" ان کی مشہور کتاب ہے

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۴۔	پروفیسر رشید احمد صدیقی	مالک رام	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۵۴-۲۲۷
۱۵۔	پروفیسر سالم کرنیکو	عبدالباری	"		" "	" "	۲۹۲-۲۰۵

PROF. S. KRENKOW ۱۲ اگست ۱۸۷۲ء کو شمالی جرمنی کے ایک شہر شون برگ (SCHONBURG) میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں لندن چلے گئے۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ عربی اور فارسی ادبیات سے خصوصی دلچسپی تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں مہمان پروفیسر بن کر آئے۔ ۱۹۳۰ء میں سبکدوش ہو کر وہ وطن واپس چلے گئے۔ ۱۹۳۱ء BONN یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں ریٹائر ہو کر کیمبرج چلے گئے۔ ۱۹۵۲ء میں انتقال کیا۔ عربی، فارسی اور انگریزی میں تالیفات بے شمار ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۶۔	پروفیسر عبدالمجید قریشی	جمال آرا نظامی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۵۸-۱۵۱
۱۷۔	پروفیسر کفیل احمد چودھری	محمد اقبال	"		" "	" "	۲۴۹-۲۴۳
۱۸۔	پروفیسر محمد بابر مرزا	الطبہ صدّیقی	۲۴		" "	" "	۲۴۲-۲۳۳
۱۹۔	پروفیسر ہادی حسن	کبیر احمد جائسی	"		" "	" "	۲۳۲-۲۲۵
۲۰۔	پروفیسر ہارون خاں شروانی	حسن الدین احمد	"		" "	" "	۲۰۴-۱۹۹
۲۱۔	ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی؛ کچھ اپنے متعلق خیالات	رشید احمد صدیقی	۴	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۶۶-۵۱
۲۲۔	تری یاد کا عالم	" " "	۱	۴	"	۱۹۶۰ء	۱۲۴-۱۱۶

اردو کے مشہور شاعر علی سکندر جگر مرادآبادی پر تاثراتی مضمون۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۳۔	جسٹس سید محمود	جسٹس ہدایت اللہ بہ ترجمہ منظر عباس نقوی	۲۲	۱-۲	جنوری ستمبر	۱۹۶۵ء	۱۴۴-۱۴۳
۲۴۔	" " "	فرخ علی جلالی	"	" "	" "	"	۱۴-۱۴۵

جسٹس محمود سرسید احمد خاں کے دوسرے بیٹے تھے۔ ۲۴ مئی ۱۸۵۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ پہلے کوئنس کالج بنارس میں اور بعد ازاں کرائسٹ چرچ کالج کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۷۲ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ وطن واپس آکر قانون کا پیشہ اختیار کیا۔ ترقی کرکے الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج بنے۔ ۱۸۹۴ء میں سبکدوش ہوئے۔ آپ کا شمار ملک کے قابل ترین ججوں میں ہوتا ہے۔ سرسید کی تعلیمی تحریک میں ان کے دست راست رہے۔ ۱۸۷۲ء میں مسلم یونیورسٹی کا جامع منصوبہ تیار کیا۔ سرسید کے انتقال کے بعد کالج کے سکریٹری اور بعد میں صدر بنے۔ ۸ مئی ۱۹۰۳ء کو سیتاپور میں وفات پائی۔ مسلم یونیورسٹی کی مسجد میں دفن ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۵۔	جسٹس کرامت حسین	سید کمال الدین حسین	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۴۴-۲۲۷
۲۶۔	چارلس ایمبروز اسٹوری	محمد سالم قدوائی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۴۰-۲۲۵

CHARLES EMBROSE STOREY مشہور مستشرق ہیں۔ ۲۱ اگست ۱۸۸۸ء کو انگلستان میں پیدا ہوئے

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات

۱۹۱۴ء کو علی گڑھ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں علیحدگی اختیار کرلی۔ اور انڈیا آفس لائبریری لندن کے اسسٹنٹ لائبریرین مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں لائبریرین بنے۔ ۱۹۳۳ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۲۴ اپریل ۱۹۶۸ء میں تقریباً اسی برس کی عمر میں انگلینڈ میں وفات پائی۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۷۔	چودھری خلیق الزماں	شان محمد	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۳۵-۱۵۰
۲۸۔	حاجی اسمعیل اور چند غیر معروف رفقا	فرخ علی جلالی	۲۲	۱-۲	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۱۷۱-۲۰۱

حاجی محمد اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی (ضلع علی گڑھ) سرسید کے مخلص احباب میں شامل تھے۔ سرسید کی تعلیمی تحریک کے زبردست حامی تھے۔ سرسید اپنے انتقال سے ایک ہفتہ قبل ان کی کوٹھی دارالانس، واقع سول لائن علی گڑھ میں منتقل ہو گئے اور یہیں انھوں نے ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو انتقال کیا۔ حاجی اسمٰعیل خاں کی وفات ۱۹۲۱ء میں آگرہ میں ہوئی۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۹۔	حالی کی دو کمیاب تحریریں	مختار الدین احمد	۱۰	۳-۴		۱۹۷۰ء	۷-۲۳
۳۰۔	حبیب الرحمٰن خاں شروانی	عبد الباری	۲۳			۱۹۸۶ء	۵۱-۶۴
۳۱۔	حسرت کے سن وسال	حامد حسن قادری	۱۵	۲	اکتوبر	۱۹۷۳ء	۸۵-۸۹
۳۲۔	حسرت موہانی	نورالحسن نقوی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۶۵-۱۷۶
۳۳۔	حکیم احمد شجاع	شہپر رسول	"		" "	" "	۱۸۳-۱۸۸

حکیم احمد شجاع ۱۸۹۵ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں سے ۱۹۱۱ء میں انھوں نے انٹرمیڈیٹ کیا اس کے بعد میرٹھ کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۴ء میں یہیں انگریزی اور تاریخ کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ مشہور ڈرامانگار آغا حشر کاشمیری کے ساتھ متعدد ڈرامے لکھے۔ اور اسٹیج بھی کئے۔ ۴ جنوری ۱۹۶۹ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۳۴۔	حضرت امیر خسرو۔ افکار و شخصیت	خلیق احمد نظامی	۵	۴	اکتوبر	۱۹۶۴ء	۱-۲۶
۳۵۔	حیدری صاحب	ہارون خاں شروانی	۱۲	۱-۲		۱۹۷۲ء	۲۰-۳۴

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات

سر محمد اکبر نذر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ کے حالات زندگی۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۳۶۔	خان بہادر مولوی حبیب اللہ خاں	شجاع الدین فاروقی	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۷۷-۲۸۴

خان بہادر صاحب جنوری ۱۸۶۸ء کو شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ کالج سے بی۔اے پاس کیا۔ آپ کو علی گڑھ اور علی گڑھ والوں سے تعلق خصوصی تھا۔ آپ اتر ولی میں نائب تحصیلدار اور بعد میں تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ڈپٹی کلکٹری سے ریٹائرڈ ہوئے۔ تمام عمر علی گڑھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کی خدمت میں صرف کی۔ ۱۳ مارچ ۱۹۶۱ء میں وفات پائی۔ یونیورسٹی کے حاطے میں آپ کی کوٹھی ولایت منزل بہت مشہور ہے۔ آج کل اس میں دینیات فیکلٹی ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۳۷۔	خان بہادر مولوی بشیر الدین	محمد الدین مارہروی	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۷۱-۲۷۷
۳۸۔	خان عبد الغفار خاں	محمد محمود فیض آبادی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۸۴-۱۹۴
۳۹۔	خلیفہ عبد الحکیم	محمد انظار الحق	"		" "	" "	۲۰۵-۲۱۶

خلیفہ عبد الحکیم (۱۸۹۵ء۔ ۱۹۵۹ء) ممتاز فلسفی اور ادیب۔ علی گڑھ سے ۱۹۱۳ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ سینٹ اسٹفز کالج دہلی سے ۱۹۱۵ء میں بی۔ اے اور ۱۹۱۷ء میں فلسفہ میں ایم اے کیا۔ ۱۹۱۹ء میں لاہور سے ایل۔ ایل۔ بی کیا۔ جرمنی سے فلسفہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۱۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۶ء تک جموں وکشمیر میں ڈائریکٹر تعلیمات رہے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے۔ وہیں ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا۔ کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں۔ فکر اقبال، حکمت رومی، افکار غالب مشہور تصانیف ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۰۔	خواجہ الطاف حسین حالی	صالحہ عابد حسین	۲۲	۱-۲	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۱۰۵-۱۱۰
۴۱۔	" " "	جمال آرا نظامی	"	" "	" "	"	۱۱۱-۱۱۶
۴۲۔	خواجہ غلام الثقلین	خواجہ غلام السیدین	۲۳			۱۹۸۶ء	۹۳-۱۰۷
۴۳۔	خواجہ غلام السیدین	صالحہ عابد حسین	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۱۹-۲۲۶

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۴۔	خواجہ محمد یوسف	فرخ جلالی	۲۳			۱۹۸۶ء	۸۵-۹۲

خواجہ صاحب سرسید کے رفیق خاص تھے۔ علی گڑھ کے روسا میں شمار کیے جاتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۵۔	خواجہ منظور حسین	اسلوب احمد انصاری	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۴۵-۲۵۲

خواجہ صاحب ۲۱ مئی ۱۹۰۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا ۱۹۲۹ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز کیا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۸ء تک مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں ریڈر اور پروفیسر رہے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۹ء تک انٹر یونیورسٹی بورڈ پاکستان کے سیکریٹری رہے۔ کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۶۔	خوشی محمد ناظر	انوار احمد	۲۳			۱۹۸۶ء	۴۱۹-۴۳۰
۴۷۔	ڈاکٹر رضیاالدین	عشرت علی قریشی	"			"	۱۴۷-۱۶۴
۴۸۔	ڈاکٹر ضیاالدین احمد	رشید احمد صدیقی	۱۱	۲		۱۹۷۱ء	۵-۲۶
۴۹۔	ڈاکٹر ذاکر حسین	محمد ضیاءالدین انصاری	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۱۷-۲۳۳
۵۰۔	ڈاکٹر سید محمود	عبدالباری	۲۳			۱۹۸۶ء	۹۵-۱۲۶

علی گڑھ کے نامور فرزند۔ ڈاکٹر سید محمود ۱۸۸۹ء میں غازی پور کے ایک گاؤں سید پور بھیتری میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم علی گڑھ کالج میں حاصل کی۔ بیرسٹری کا امتحان کیمبرج سے پاس کیا۔ ۱۹۱۲ء میں واپس آکر وکالت شروع کی۔ اسی زمانے میں تحریک آزادی میں شامل ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں شامل ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں اس کے جنرل سکریٹری بنے۔ کانگریس کے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ متعدد بار جیل گئے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کے نائب وزیر خارجہ بنے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵۱۔	ڈاکٹر عابد حسین	صغریٰ مہدی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۷۶-۲۸۰
۵۲۔	ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری	خورشید الاسلام	"		" "	" "	۹۳-۱۰۰
۵۳	ڈاکٹر عبدالستار صدیقی	ضیاءالحق چودھری	"		" "	" "	۲۶۱-۲۶۸

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵۴	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۲۴		جنوری، جولائی	۱۹۸۷ء، ۱۹۸۸ء	۴۴۹-۴۵۴
۵۵	راجہ جے کشن داس	محمد انظار الحق	۲۲	۱-۲	جنوری، ستمبر	۱۹۸۵ء	۱۶۱-۱۶۹

راجہ جے کشن داس (ولادت: ۲۴ نومبر ۱۸۳۲ء - وفات ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء) مراد آباد کے ایک اعلیٰ خاندان کے فرد تھے۔ رئیس ابن رئیس تھے۔ سرسید کے بہترین دوست اور جاں نثاروں میں تھے۔ سرسید کے پوتے راس مسعود کا ۱۸۹۲ء میں جب مکتب ہوا ہے تو انھوں نے بسم اللہ راجہ جے کشن داس کی گود میں بیٹھ کر پڑھی تھی۔ انھیں علی گڑھ تحریک اور اس کے اغراض و مقاصد سے بے پناہ لگاؤ تھا۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵۶	راجہ راؤ	محمد یٰسین	۲۴		جنوری، جولائی	۱۹۸۷ء، ۱۹۸۸ء	۲۲۷-۲۳۶

راجہ راؤ میسور میں ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ یہاں انھوں نے فرانسیسی زبان سیکھی۔ اس کے بعد نظام کالج حیدرآباد سے بی۔ اے پاس کیا۔ ۱۹۲۹ء میں فرانس چلے گئے اور سوربان (SORBONNE) یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ اعلیٰ پایہ کے انگریزی کے مصنف ناول نگار اور افسانہ نویس تھے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵۷	راجہ غلام حسین	ضیاء الدین احمد برنی	۲۴		جنوری، جولائی	۱۹۸۷ء، ۱۹۸۸ء	۴۹-۵۲
۵۸	راجہ مہندر پرتاپ سنگھ	محمد انظار الحق	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۳۵-۲۵۴
۵۹	رفیع احمد قدوائی	محمد ہاشم قدوائی	۲۴		جنوری، جولائی	۱۹۸۷ء، ۱۹۸۸ء	۲۲۷-۲۴۴
۶۰	سر آغا خاں	نسیم انصاری	۲۳			۱۹۸۶ء	۷-۱۴
۶۱	سر راس مسعود	ارشد مسعود	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۹۳-۳۰۰

سرسید کے پوتے اور جسٹس محمود کے بیٹے۔ ۱۹ فروری ۱۹۲۹ء سے اکتوبر ۱۹۳۴ء تک مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۶۲	سر رضا علی	صبیحہ انور	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۵۵-۲۶۲
۶۳	سر سکندر حیات خاں	عبدالمجید سالک	۲۴		جنوری، جولائی	۱۹۸۷ء، ۱۹۸۸ء	۱۹۵-۱۹۸

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات

سابق متحدہ پنجاب کے وزیر اعظم، سرسکندر حیات ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے علی گڑھ کالج اور لندن میں تعلیم حاصل کی پنجاب قانون ساز اسمبلی کے رکن اور پھر ۱۹۳۰ء میں حکومت پنجاب کے ریونیو ممبر بنے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء تک پنجاب کے گورنر بھی رہے۔ اس کے بعد ریزرو بنک آف کلکتہ کے گورنر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے۔ ۱۹۴۲ء میں وفات پائی۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۶۴۔	سرسید کے ایک رفیق۔ منشی نجم الدین	مختار الدین احمد	۲۲	۳-۱	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۶۲-۴۵
۶۔	سرشاہ سلیمان	اخلاق احمد	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۴۲-۲۳۱
۶۶۔	سرمحمد فیض علی خاں بہادر	الطاف حسین ندوی	"			"	۲۳۰-۲۲۱
۶۷۔	سروالٹر رالے	اقبال احمد انصاری	"			"	۲۵۰-۲۴۳

SIR WALTER RALEIGH انگریزی کے ادبیات کے مشہور اسکالر کیمبرج یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ اکتوبر ۱۸۸۵ء میں علی گڑھ کالج میں انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے آئے، لیکن خرابی صحت کے باعث صرف ڈیڑھ سال رہ کر وطن واپس چلے گئے۔ سرسید اور ان کی تعلیمی تحریک سے بہت زیادہ متاثر تھے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۶۸۔	سلطان حیدر جوش	وحید احمد	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۴۳-۱۵۹
۶۹۔	سید سجاد حیدر یلدرم	ثریا حسین	"		" "	" "	۲۷۴-۲۶۹

اردو کے مشہور ادیب اور افسانہ نگار۔ ۱۸۸۰ء میں قصبہ کانڈہ ضلع جھانسی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کیا۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۹ء تک مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے۔ اسی دوران شعبۂ اردو کی سربراہی بھی کی۔ ۱۹۳۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء کو لکھنؤ میں فوت ہوئے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۷۰۔	سیدنا ابو محمد طاہر سیف الدین	حامد علی خاں	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۴۹۲-۴۵۵
۷۱۔	شفاء الملک حکیم عبداللطیف	سید ظل الرحمٰن	"		" "	" "	۲۷۰-۲۶۱
۷۲۔	شمس العلماء مولوی نذیر احمد	نور الحسن نقوی	۲۲	۳-۱	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۱۲۸-۱۱۷
۷۳	شیخ عبداللہ	آل احمد سرور	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۹۲-۲۸۵

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ۔ آپ نے ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ ایس۔ سی کیا۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۷۴۔	صاحبزادہ آفتاب احمد خان	محمد ضیار الدین انصاری	۲۳			۱۹۸۶ء	۸۴-۶۵
۷۵۔	عبدالماجد دریا بادی	ظفر حسین خان	۲۳		جنوری جولائی	۱۹۸۶ء ۱۹۸۸ء	۴۲۲-۴۱۷
۷۶۔	علامہ شبلی نعمانی	خورشید الاسلام	۲۲	۲-۱	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۹۲-۸۶
۷۷۔	" " "	سید محمد ہاشم	"	" "	" "	"	۱۰۴-۹۳
۷۸۔	فانی اور ان کی شخصیت	ابن علی نقوی بدایونی	"	۱		۱۹۷۱ء	۱۰۹-۶۵
۷۹۔	فانی بدایونی	ظہیر احمد صدیقی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۳۴-۱۲۷
۸۰۔	قاضی سید رضا حسین عظیم آبادی	مختار الدین احمد	۲۳			۱۹۸۶ء	۵۰-۴۳
۸۱۔	کہاں ہے آج تو اے آفتاب نیم شبی	رشید احمد صدیقی	۵	۳	جولائی	۱۹۴۴ء	۲۲-۱

پنڈت جواہر لال نہرو پر ایک تاثراتی مضمون۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۸۲۔	کے۔ ایم۔ سردار پانیکر	محب الحسن	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۶۰-۲۵۵

پانیکر ۳ جون ۱۸۹۵ء کو کیرالہ کے امبالا پورہ تعلقہ کے کوالم گاؤں میں پیدا ہوئے۔ مدراس سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۷ء میں بی اے آنرز کیا۔ ۱۹۱۹ء میں علی گڑھ کالج میں تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ جون ۱۹۲۲ء میں مستعفی ہو گئے۔ آزادی کے بعد اقوام متحدہ میں ہندوستان کی نمائندگی کی اپریل ۱۹۴۸ء میں چین میں ہندوستان کے سفیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں مصر میں اور جون ۱۹۵۶ء میں فرانس میں ہندوستان کے سفیر بنائے گئے۔ جموں وکشمیر یونیورسٹی اور بعد میں میسور یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۳ء کو فوت ہوئے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۸۳۔	محسن الملک سید مہدی علی خاں	سید محمد طارق	۲۲	۲-۱	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۷۲-۶۳
۸۴۔	محمد حسین آزاد	اسلوب احمد انصاری	۱۰	۴-۳		۱۹۷۰ء	۴۴-۲۳
۸۵۔	محمود احمد عباسی امروہوی	مالک رام	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۸۲-۱۷۷

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۸۶۔	سڈنس	ظفر الاسلام	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۵۷-۲۵۱

HENRY GEORGE IMPEY SIDDONS علی گڑھ کالج کے پہلے پرنسپل تھے۔ ۱۸۷۵ء میں اپنے عہدے کا چارج لیا۔ اگست ۱۸۸۳ء میں استعفا دیا۔ آپ کالج کے کامیاب ترین پرنسپل تسلیم کئے جاتے ہیں۔ طلبا کی یونین آپ ہی کے نام سے منسوب ہے

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۸۷۔	مسز ممتاز حیدر	ثریا حسین	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۸۴-۲۷۹
۸۸۔	مغربی مستشرقین کے چند بنیادی مقاصد	اکمل ایوبی	۲۱	۲-۱	جنوری جون	۱۹۸۴ء	۸۴-۶۹
۸۹	مقتدیٰ خاں شروانی	مالک رام	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۹۲-۸۹

مولوی مقتدیٰ خاں شروانی علی گڑھ کی مقتدر شخصیات میں تھے۔ ۱۸۸۰ء میں ولادت ہوئی۔ زیادہ تر تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۹۰۲ء میں منشی محبوب عالم کے مشہور زمانہ روزنامہ "پیسہ اخبار" لاہور سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی پریس کے مہتمم مقرر ہوئے۔ ان کے زمانے میں یونیورسٹی پریس سے بہت اعلیٰ پیمانے پر کتابیں شائع ہوئیں۔ ۱۹۲۶ء میں اپنا ذاتی پریس قایم کر لیا۔ ۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کو ۸۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۹۰۔	مولانا ابوبکر شیث	محمد صابر صبر حدی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۸۶-۲۸۱
۹۱۔	مولانا احسن مارہروی	ظفر الاسلام	"		" "	" "	۳۰۹-۲۹۵
۹۲۔	مولانا اسلم جیراجپوری	محمد سالم قدوائی	"		" "	" "	۱۲۶-۱۱۵
۹۳۔	مولانا حمید الدین فراہی	عبید اللہ فہد	"		" "	" "	۲۰-۷
۹۴۔	مولانا سید طفیل احمد منگلوری	یٰسین مظہر صدیقی	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۰۴-۱۸۷
۹۵۔	مولانا شوکت علی	قمر الہدیٰ فریدی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۳۰-۲۱
۹۶۔	مولانا ضیاء الدین احمد بدایونی	مالک رام	"		" "	" "	۲۷۸-۲۷۱

پروفیسر ضیاء الدین احمد بدایونی ۲۱ ستمبر ۱۸۹۴ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پہلے اردو کے پھر فارسی کے لکچرر، ریڈر اور پروفیسر و صدر شعبہ بنے ۱۹۵۹ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۸ جولائی ۱۹۷۳ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۹۷	مولانا ظفر علی خاں	محمد ضیاء الدین انصاری	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۶۱-۷۴
۹۸	مولانا عبدالرزاق کانپوری	سعیدہ بانو	"		" "	" "	۵۳-۶۰
۹۹	مولانا عبدالعزیز میمن	شیخ نذیر حسین	"		" "	" "	۲۵۳-۲۶۰

عہد حاضر کے عربی کے مشہور ادیب، محقق، عالم اور انشاپرداز (مولانا عبدالعزیز میمن (۱۸۸۸ء-۱۹۷۸ء) ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ عرب ممالک میں بھی معروف تھے۔ ۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی میں عربی کے ریڈر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں پروفیسر و صدر شعبہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد پاکستان چلے گئے۔ وہیں ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو کراچی میں وفات پائی۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۰۰	مولانا عبداللہ انصاری انبیٹھوی	مفتی ظفر الحق راشد کاندھلوی	۲۲			۱۹۸۶ء	۲۹۷-۳۱۸

مولانا عبداللہ انصاری ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے پہلے ناظم دینیات تھے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد تھے۔ ۱۹۲۵ء میں راہی ملکِ عدم ہوئے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۰۱	مولانا محمد علی جوہر	مشرف علی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۳۱-۴۸
۱۰۲	مولانا وحید الدین سلیم	منظر عباس نقوی	۲۳			۱۹۸۶ء	۱۶۵-۱۸۲
۱۰۳	مولوی چراغ علی	کبیر احمد جائسی	۲۲	۱-۲	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۲۰۱-۲۱۰
۱۰۴	مولوی ذکاء اللہ	یٰسین مظہر صدیقی	۲۲	۱-۲	" "	"	۱۸۷-۲۰۰
۱۰۵	مولوی زین العابدین	اخلاق احمد	"	" "	" "	"	۱۷۷-۱۸۶
۱۰۶	مولوی سمیع اللہ خاں	شجاع الدین فاروقی	"	" "	" "		۱۲۹-۱۴۲
۱۰۷	مولوی عبدالحق	ابوالکلام قاسمی	۲۳			۱۹۸۶ء	۱۷۳-۱۸۶
۱۰۸	مولوی عنایت اللہ دہلوی	محمد صابر	"			"	۲۶۳-۲۷۰

مولوی عنایت اللہ (۱۸۶۹ء-۱۹۴۳ء) مولوی ذکاء اللہ کے فرزند تھے۔ اردو کے صفِ اول کے مترجمین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے تراجم کی تعداد ۶۰ سے متجاوز تھی۔ علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۱۰۔	مولوی محمد عزیز مرزا	حبیب الرحمٰن چغتائی	۲۳			۱۹۸۶ء	۱۴۶-۱۲۷
۱۱۱۔	مہاراجہ محمد علی خاں	محب الحسن	"			"	۲۰۶-۲۱۱
۱۱۲۔	میر محفوظ علی بدایونی	شمس بدایونی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۸۶-۷۵
۱۱۳۔	میر ولایت حسین	مرتضیٰ حسین بلگرامی	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۹۹-۲۸۵
۱۱۴۔	عظیم بیگ چغتائی	محمد علی جوہر	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۴۴-۲۲۷
۱۱۵۔	نواب احمد سعید خاں چھتاری	الطاف حسین ندوی	۲۴		" "	" "	۱۱۴-۱۰۱
۱۱۶۔	نواب حمید اللہ خاں	سید ظل الرحمٰن	۲۳			۱۹۸۶ء	۴۴۰-۴۳۱
۱۱۷۔	نواب سلطان جہاں بیگم	نفیس بانو	"			"	۲۹۲-۲۷۹
۱۱۸۔	نواب سید محمد علی	محمد ابو صالح	"			"	۴۴۸-۴۳۱

نواب سید محمد علی سرسید کے بڑے بھائی سید محمد کے پوتے اور سرسید کے بیٹے سید حامد کے داماد تھے۔ یہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۰ء تک علی گڑھ کالج کے سکریٹری رہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۱۹۔	نواب محمد اسحٰق خاں	کبیر احمد جائسی	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۲۱-۲۰۵

نواب صاحب (۱۸۶۰ء - ۱۹۱۸ء) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے صاحبزادے تھے۔ جولائی ۱۹۱۲ء سے ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۸ء تک علی گڑھ کالج کے سکریٹری رہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۲۰۔	نواب محمد اسماعیل خاں	ظفر الاسلام	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۱۸-۲۰۷

نواب اسماعیل خاں (۱۸۸۴ء - ۱۹۵۸ء) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے پوتے اور نواب محمد اسحٰق خاں کے بیٹے تھے۔ آپ ۲۴ جولائی ۱۹۲۱ء سے ۱۹ اپریل ۱۹۲۵ء تک مسلم یونیورسٹی کے خازن اور ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء سے ۲۹ نومبر ۱۹۴۸ء تک وائس چانسلر رہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۲۱۔	نواب مزمل اللہ خاں	اسلوب احمد انصاری	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۲-۱۵
۱۲۲۔	وقار الملک مولوی مشتاق حسین	ثاقب حسن رضوی	۲۲	۳-۱	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۹۶-۷۳

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
	تبصرے						
	آگ کا دریا از قرۃ العین حیدر	اسلوب احمد انصاری	۱	۴	اکتوبر	۱۹۶۰ء	۱۵۵-۱۴۳
	اقبالؔ کا نظریۂ اخلاق از سید احمد رفیق	محمد قریشی	۲	۲	اپریل	۱۹۶۱ء	۱۲۶-۱۱۲
	تاثرات و تعصبات از نظیر صدیقی	اسلوب احمد انصاری	۴	۱	جنوری	۱۹۶۳ء	۱۳۰-۱۲۷
	دیوان غالبؔ (نسخۂ عرشی) مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی	مالک رام	۳	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۱۵۷-۱۳۵
	شعلۂ آواز از سراج لکھنوی	نبی ہادی	۲	۴	اکتوبر	۱۹۶۱ء	۱۱۹
	فکرِ اقبالؔ از خلیفہ عبدالحکیم	اسلوب احمد انصاری	۱	۳	جولائی	۱۹۶۰ء	۱۱۶-۱۰۹
	متاعِ تسکین از تسکین قریشی	محمد حسن	۴	۱	جنوری	۱۹۶۳ء	۱۳۳-۱۳۱
	مسلمانوں کے سیاسی افکار از پروفیسر ہارون خاں شروانی	انوار الحق حقی	۳	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۱۲۶-۱۱۵

جناب عبدالرؤف خاں
مہتمم لائبریری
اودی کلاں اسوائی مادھوپور

خدابخش لائبریری جرنل ۶۹-۷۰ کے بارے میں

امید کہ آپ عافیت سے ہوں گے۔ خدابخش لائبریری جرنل نمبر ۶۹-۷۰ مشتمل بر تعارف منظوطاتِ تصوف بڑی اہمیت کا حامل ہے جسے آپ نے نہایت عرق ریزی سے مرتب فرما کر پیش کیا ہے۔ اس کے لیے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ اگر اجازت ہو تو اس شمارہ کے بعض مادہ ہائے تاریخ کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں:۔

● ص ۴۶ سطر ۱۲ پر حضرت شیخ وجیہ الدین گجراتیؒ المتوفی ۹۹۸ھ کے مادۂ وفات "ولہم جنّٰت الفردوس نزلاً" میں "لہم" سے پہلے "واو" زائد ہے بایں سبب اعداد کا میزان ۱۰۰۳ ہوتا ہے۔ اگر "جنّٰت" کے کھڑے الف کو بھی شمار کریں تو ۱۰۰۴ ہوگا۔ چنانچہ مادہ "لہم جناتِ الفردوس نزلاً" ہونا چاہیے۔ گو اس صورت میں "جنّٰت" کا املا قرآنی املا کے برعکس ہو گیا ہے لیکن تاریخ گو مادہ میں ایسا کرتے رہے ہیں۔ اس املا سے ۹۹۸ھ نکلے گا ورنہ بصورت "جنّٰت ۹۹۷ھ"۔

● ص ۲۰۷ سطر ۱۰-۱۱ پر شیخ محمود چشتیؒ کی وفات کے دو مادے ہیں: "کہ ید طریقت بہ لطف معبود ۱۰۲۶ھ" لیکن اس میں "بالطف" کو "بہ لطف" لکھنے سے پانچ عدد زاید ہو گئے لہذا میزان ۱۰۳۱ ہوتا ہے نیز مادہ "محمود خوش وہاں نام مبارک" کے آگے کوئی سنہ درج نہیں اور نہ اس مادے سے ۱۰۲۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔

● ص ۲۲۵ پر (سطر ۱۹-۱۸) خانقاہ زڈی بل کی تعمیر شروع کرنے کے قطعہ کا آخری شعر یہ دیا ہے:

بر در اِیں مقام ہمچو بہشت خردُ اللہ ذوالبقا نوشت

فی الاصل یہی تاریخی شعر ہے، لیکن مصرعۂ ثانی کے نیچے یا سامنے ۹۰۳ھ ثبت نہیں ہے۔ دراصل یہ مادہ

نہایت حسین تعمیہ تخرجہ سے کہا گیا ہے یعنی مادہ "اللہ ذوالبقا" (۹۰۶) عقل نے بہشت جیسے اس مقام کے "در" پر لکھدیا چونکہ حساب جمل کی رو سے "در" کا دروازہ (پہلا حرف) دال ہے جس پر مادہ لکھنے کے سبب (دال) پوشیدہ ہو گئی گویا لطیف اشارہ چار عدد کے اسقاط کا کیا گیا ہے۔ اس طرح (۹۰۶-۴) ۹۰۲ برآمد ہوں گے جو مطلوبہ سال ہے۔ اس تاریخی شعر کے لطیف تعمیے کی جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ گمانِ غالب ہے کہ اس طرف صاحب مقالہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کا ذہن منتقل نہ ہو سکا۔

● ص ۲۳۵ پر (سطر ۲) حضرت شیخ یعقوب صرفی کاشمیری متوفی ۱۰۰۳ھ کا مادۂ وفات "فخرالامم" رقم کیا ہے جس سے صرف ۹۹۲ برآمد ہوتے ہیں۔ مکمل مادہ "فخرالامم بود" ہے جو بزیادتِ یک عدد ہے۔ یہ مادہ صرف سترہ اٹھارہ دن کے فصل ثانی سے کہا گیا ہے (وفات ۱۲ ذیقعدہ ۱۰۰۳ھ تاریخ دعوت عزیمت ۴: ۱۲۹ حاشیہ ۲)

● اسی صفحہ ۲۳۵ کی سطر ۶ پر تاریخی شعر ؎

یافتم بہرِ سال تاریخش
پنج و ہفتاد سالہ آں شاہ

کے مصرعۂ ثانی (مادہ) سے بھی ۱۰۰۴ھ برآمد ہوتے ہیں۔ ظن غالب ہے کہ یہ مادہ ۱۰۰۳ھ کے پیش نظر مکمل اعداد ۱۰۰۳ کے لیے نکالا گیا ہے جس کا املا "پنج و ہفتاد سالہ آں شہ" ہوگا۔ مدت عمر ۷۵ سال یعنی مادہ میں حسنِ تاریخی ہے۔

● ص ۲۴۹ سطر ۱۱ پر شیخ عبدالکریم (م ۱۰۵۷) کے انتقال کے بارے میں یہ فقرہ "آپ کے انتقال کا قطعہ تاریخ ذات اللہ ہے"۔ جبکہ یہ نہ تو قطعہ ہے اور نہ اس سے مطلوبہ اعداد ۱۰۵۷ ہی نکلتے ہیں مادہ "ذات اللہ" ہے جس پر داویں بھی نہیں ہیں۔ ۱۱۶۷ برآمد ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ سہوالکاتب ہے یا صاحب مقالہ کے نوکِ خامہ کی لغزش۔

● ص ۲۵۰ سطر ۲ پر حضرت پیر محمد سلونی (م ۱۰۹۹ھ) کے بارے میں بھی مادہ کے لیے "آپ کے انتقال کی قطعہ (کذا) تاریخ ذات محمد ہے۔ (؟) (کذا) "ذاتِ محمد" بھی قطعہ نہیں مادہ ہے اور نہ اس مادہ سے ۱۰۹۹ برآمد ہوتے ہیں بلکہ ۱۱۹۳ نکلتے ہیں دونوں مقامات پر قطعہ اور مادہ میں فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

● ص ۴۹ سطر ۱ مصرعۂ اولیٰ "چو پرسیدم ز ہاتف سالِ تعریف" میں "تاریخ" "تعریف" ہو گیا ہے۔

● فہرست صفحہ چار پر (سطر ۳) ص نمبر ۴۶۸ کے بجائے سہواً ۴۸۱ لکھا ہوا ہے۔

● ص ۲۴۱ سطر ۱۵ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا جو شیخ یعقوب صرفیؒ نے نقل کی ہے "اے اللہ مجھے حضرت محمد صلعم کی امت میں سے اٹھا" پر حاشیہ ۵ لکھ کر ڈاکٹر شمس الدین احمد صاحب نے اشکال کرتے ہوئے بڑی صفائی سے یہ بات فرما دی ہے کہ راقم کی نظر آئی وسیع نہیں لہٰذا اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے پیش نہیں کی جاسکتی ہے البتہ اتنا ضرور کہہ سکتا

ہوں کہ ناقل نے نسخۂ مذکور کو نقل کرتے وقت "عیسیٰ" کے بجائے "موسیٰ" لکھا ہوگا" (ص ۲۴۲ حاشیہ) گویا یہ حضرت موسیٰ کی دعا نہیں ہو سکتی۔ دلیل میں ڈاکٹر ظہور الدین احمد صاحب کی تصنیف "پاکستان میں فارسی ادب ا: ۴۹۳ کا حوالہ دیا ہے (ص ۲۴۲) جنھوں نے اس حدیث کو وضعی قرار دیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ حدیث پاک کے سلسلے میں کسی محدثِ جلیل کا اسم گرامی اور ان کی عبارت کو استناداً پیش فرمایا ہوتا نہ کہ کسی ڈاکٹر اور پروفیسر کا فرمایا ہوا۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد صاحب نے تو مذکورہ دعا کو حضرت موسیٰؑ کے بارے میں اس انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ دوبارہ دنیا میں آنا چاہتے ہیں۔ لیکن مذکورہ دعا کا مفہوم دوبارہ دنیا میں آنے سے نہ ہو کر امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حشر فرمانے سے بھی تو ہو سکتا ہے اور یہی قرین قیاس ہے۔ کہ یہودی قوم کے ساتھ حشر میں اٹھنا کون پسند کرے گا۔ بہرحال حدیثِ بالا کے مستند و وضعی ہونے کے بارے میں ہو سکا تو ان شاء اللہ پھر عرض کروں گا۔ کیونکہ اس میدان میں تخمین و ظن کو دخل نہیں۔ فقط۔ والسلام مع الاکرام۔

نیاز مند

عبدالرؤف خاں

جناب مصطفٰے خاں شروانی
۶/۳-۲-۶۰۳ - حمایت نگر
حیدرآباد



عرصہ بعد آپ کا شرف نامہ ۱۱۸۵ مورخہ ۱۶ر جون ۱۹۹۲ء نظر نواز ہوا مشکور فرمایا۔ دراصل مجھے اس کا قطعی علم نہیں تھا کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر شخصیات کو بھی نمبر ایک اور نمبر دو کے زمروں میں تقسیم فرمایا جا سکتا ہے! اس لیے کہ اس نوع کا شمار تو بالائی اور زیریں آمدنی کے سلسلہ میں ہوا کرتا تھا۔ بہرحال اب میں متوقع رہوں کہ جب بھی کسی اہم نمبر ایک والی شخصیت کا سرفراز نامہ صادر ہو اس کی xerox آپ کی "تصحیح" (یا تنسیخ) کے لیے پیش خدمت کروں۔ ان شاء اللہ العزیز۔

جناب طیب بخش صاحب مرحوم و مغفور بدایوں کے ایک شگفتہ تحریر کے مصنف گذرے ہیں ان کی ایک تصنیف "اعتقادات سرسید اور شرر بدایونی" پر اتر پردیش اردو اکیڈمی کا انعام بھی عطا کیا گیا۔ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر سعید طیب نے ایک اشاعتی ادارہ "طیب پبلشنگ ہاؤس" بدایوں میں کھولا ہے جہاں سے جناب طیب بخش مرحوم کی ایک اچھوتی تصنیف "رشحات قلم" شائع ہوئی ہے۔ میں ڈاکٹر سعید طیب کو اس کا ایک نسخہ آپ کی خدمت میں روانہ کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ اس میں ایک انشائیہ "ایک طوائف کا خط" کا یہ فقرہ بہت معنی خیز ہے: "جب میری بہن نے "محمد شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم" گایا تھا نہ جانے کتنے اہل اللہ اس مصرعہ کو سن کر وجد کرنے لگے تھے اور ایک بزرگوار تو یہ مصرعہ سن کر جان بحق

ھوگئے تھے۔ لیکن آج کے سینما اور ٹی وی کے گانے سن کر لڑکیاں اپنے عاشقوں کے ساتھ فرار ہوجاتی ہیں۔ !!!

امید ھے آپ بخیریت ہوں گے۔

مخلص

مصطفیٰ شروانی



کل میں آپ کی خدمت میں نیاز نامہ بمعہ ۴ آٹوگراف کے xerox (محترمہ ارونا آصف علی صاحبہ اور ۳ مکاتب جناب بھشم نرائن سنگھ سابق مرکزی وزیر امکنہ اور حالیہ گورنر تامل ناڈ) روانہ خدمت کیا تھا اور آج خدابخش لائبریری جرنل (۶۳ تا ۶۸) موصول ھوا جو حسب سابق مختلف النوع موضوعات پر محیط ھے خصوصاً "ہند عہد اورنگ زیب میں" کا دوسرا حصہ اور اس اہم تصنیف پر میرا ناچیز تبصرہ بہت بروقت ہم دست ہوا اس لیے کہ آج ہی کے *The Hindu* میں شاہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر پر میرا ایک مکتوب شائع ھوا ہے، جو حسب ذیل ہے:

Pandey on Aurangzeb

Sir, — Mr. V. Sagar in his letter (The Hindu, May 12) disputes the contention of Mr.Bishambhar Nath Pandey, former Governor of Orissa, of Emperor Aurangzeb's rule (1658-1707) being 'just and benevolent'. No doubt there is some substance in what Mr.Sagar says about Aurangzeb's punishment to the Mahant of Vishwanath Temple and of the extraordinary action in the demolition of the sacred temple for the misconduct of the Mahant in dishonouring a Hindu Princess. Unfortunately, however, Aurangzeb has been painted as an utterly orthodox ruler which is not quite true. A person who in 1659 fought and defeated his eldest brother, Dara Shikoh, paraded him through the streets of Delhi in ragas and finally put him to death could not be considered either orthodox or pious. Then later Aurangzeb forcibly dethroned his father, Emperor Shah Jahan and held him prisoner in Agra Fort until Shah Jahan's death. This could not be treated as just or benevolent action. Actually Aurangzeb was a seasoned politician who would set his goals and try to reach them by means fair or foul. This tendency is reflected in some of the Emperor's actions in granting Jagirs to some of the temples like the Temple of Someshwar Nath Mahadev in Allahabad. The matter had legal ramifications as late as in 1950 when a dispute arose over the property dedicated to this tempale and

the supporting documents contained a Firman of Emperor Aurangzeb conferring a Jagir and cash gift on this temple.

It would therefore be a distortion of historical facts to paint Emperor Aurangzeb as just another Muslim fanatic.

Mustafa K. Sherwani, Hyderabad
(The Hindu, May 20, 1992)

علیگڑھ کے حالیہ سیمینار میں جناب بشمبھر ناتھ پانڈے نے اورنگ زیب عالمگیر کو منصف اور دور اندیش حکمران قرار دیا تھا اس پر ایک جناب **V. sagar** نے اورنگ زیب کی "بدحکومتی" اور اس کے "متعصب" دور پر پانڈے صاحب کے احساسات پر تنقید فرمائی تھی میں نے اس تنقید کا "در پردہ" جواب دیا ھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کو آجتک صحیح کسوٹی پر جانچا ہی نہیں گیا۔ اسے متعصب اور سخت گیر حکمراں کا درجہ دے کر اس کے دورِ حکومت کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا امید ہے آپ میرے اس شائع شدہ خط کے مندرجات سے اتفاق فرمائیں گے۔

امید ھے آپ مع الخیر ھوں گے۔

مخلص مصطفیٰ شروانی
۲۰ رمئی ۱۹۹۲ء



"خدابخش لائبریری جرنل" کے شمارہ ۶۳ تا ۶۸ کی ایک خصوصیت یہ ھے کہ اس میں محترمہ ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین نے اپنے تحقیقی مقالہ "ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ" میں میری ایک خالہ صاحبہ مرحومہ ز۔خ۔ش (زاہدہ خاتون شروانیہ مرحومہ) پر ایک سوانحی مضمون شامل فرمایا ھے جس کے لیے میری والدہ ماجدہ محترمہ انیسہ ھارون بیگم شروانیہ صاحبہ مرحومہ و مغفورہ کی تصنیف "حیات ز۔خ۔ش" (مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۴۰ء) اور محترمہ انیسہ ھارون بیگم شروانیہ مرحومہ و مغفورہ کے زیرنگرانی دارالاشاعت پنجاب لاہور سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئے دیوان "فردوس تخیل" سے استفادہ فرمایا ھے۔

محترمہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ مغفورہ کے "ز۔خ۔ش مرحومہ کے قرب کے متعلق جناب نصیرالدین ہاشمی اپنی تصنیف "خواتین دکن" (۱۹۴۰ء) میں تحریر فرماتے ہیں:

"آپ کی عمر کے ابتدائی بارہ سال زیادہ تر ننہالی ماحول میں گذرے یہاں آپ کی سہیلی زاھدہ خاتون نزہت شروانیہ (ز۔خ۔ش) بنت نواب مزمل اللّٰہ خاں مرحوم تھیں جن کی علمی قابلیت اور شاعرانہ بلند پروازی کا ڈنکا ھندستان کے گوشہ گوشہ میں بج چکا ھے۔ موصوفہ اپنے ابتدائی عمر ہی سے شعرگوئی کرتی تھیں اس لحاظ سے انیسہ بیگم بھی بوجہ دوستی یکجائی اور ہم سنی متاثر ہوئیں"۔

ز۔خ۔ش مرحومہ ۸؍دسمبر ۱۸۹۴ کو پیدا ہوئیں اور صرف ۲۸ سال کی عمر میں ۲؍فروری ۱۹۲۲ کو انتقال ہوا اور خود ان کا یہ شعر صادق آگیا جو اپنے والد کی شفقت سے متاثر ہوکر ز۔خ۔ش مرحومہ نے کہا تھا:

جب کہوں میں خیر باد اس عالم حق پوش کو
روح چل دے سونپ کر قالب تری آغوش کو (ز خ ش)

اپنے پہلے مجموعہ کلام "آئینہ حرم" کو ز۔خ۔ش مرحومہ نے اپنے والد گرامی محترم نواب سر مزمل اللہ خاں شروانی مرحوم سے معنون کیا تھا۔

جب نواب عثمان علی خاں آصف جاہ سابع فرمانروائے حیدرآباد نے ۱۹۱۹ میں ھندستان کی پہلی اردو زبان میں تعلیم کی جامعہ عثمانیہ قائم کی۔ اس وقت ز۔خ۔ش مرحومہ نے ایک طویل نظم کہی تھی۔ جس کا عنوان تھا "سپاسنامہ بحضور بانی جامعہ عثمانیہ" "جذبات اردو" کا ہر شعر اردو زبان کی بے کسی کی تصویر ہے جو آج بھی اپنی معنویت کے لحاظ سے بامقصد ہے:

میں اشانہ سے در گذری آئینہ سے باز آئی
اب دل ہی نہیں جس میں ہو ذوق خود آرائی

اور پھر: آخر در محسن تک قسمت مجھے لے آئی
ہاں تجھ کو بشارت ہو اے ذوق جبیں سائی

چوں شمس و قمر روشن ہے اسم شریف اس کا
ہے نام خدا جس میں نورین کی یکجائی

ہے آج بعد زینت ہر کان کا آویزہ
عثمان علی خاں کا آویزۂ یکتائی

اور یہ سپاسنامہ اور اس میں نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں مرحوم کی توصیف ایک ایسی صرف ۲۲ سالہ شاعرہ کے موقلم کا نتیجہ تھا جو علیگڑھ سے ۲۵ میل دور ایک گاؤں میں اپنی شاعرانہ عظمت کا لوہا اردو داں دنیا سے منوا رہی تھی۔

محترمہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ مرحومہ نے ز۔خ۔ش مرحومہ کے لیے فرمایا تھا:

جو ہو سدا بہار وہ گلشن ہے تیرا ذکر
دائم جو اوج پر ہو وہ قسمت ہے تیری یاد

نیازمند

مصطفیٰ شروانی

In this inscription the importance of the epigraph has been lost owing to a free translation of the first couplet in which all the important points have been left out.

The line reads :—

بنال فرقتی خستہ دل بماتم او
کہ مرد زوجۂ خوبت محمدی خانم

which Mr. Syed Muhammad translates :—

> 'My heart is broken with lamentation for the separation of the good lady Muhammadi Khanam who is dead.'

The correct translation of the couplet should, in my humble opinion, be as follows :—

> 'Cry (بنال) *O broken hearted Furqati* in mourning over her, for *thy good wife* (زوجۂ خوبت) Muhammadi Khanam is dead.'

Thus the line contains the poetic name, Furqati, of the composer of these verses who was the husband of the deceased lady. The author's translation does not bring out this relationship and the *takhallus* which invest the epitaph with considerable human interest.

Some of the inscriptions dealt with by Mr. Syed Muhammad are of great historical importance and it would have been better to publish their facsimiles and also to give brief accounts of the careers of the personages mentioned therein.

(7) *Inscription No. 79 on Kazim Ali's mosque*:—Here again, as in the case of No. 47, the 2nd hemistich has been read as the 3rd and *vice versa*. Moreover the word *sininash* in the third hemistich meaning 'its date' has been misread as *sina ash*, 'its chest'. The difference is obvious. Again, the closing words of the second line seem to be quite clear on the stone and read (که بود فرق عرش سا) 'of which the pinnacle touches the heavens'. Lastly the alphabetical value of the Arabic line (فولوا وجوهکم شطر المسجد الحرام البسیط) which is a slightly altered form of the Quranic verse 143, Chapter II with an additional word (al-basit) at the end, comes to 1242 A.H., and is just one unit too much compared with the date given in the closing words of the main inscription which is in Persian verse. It was no doubt with the object of recording the date of the construction of the Mosque in Arabic that these alterations were made in an important Quranic verse.

(8) *Inscription No. 105 on Mir Abdullah's tomb.*—The words which have been read by Mr. Syed Muhammad as 'Amthal-i-wafiran' 'the richest men who were examples for it' are really 'Amthal-o-Aqran' (امثال و اقران) 'equals and compeers'.

(9) *In inscription No. 108 on Mian Khan's tomb in the compound of Shaikh Barkat's Mosque*, the first couplet reads :—

میان خان که در عنفوان شباب
بساط حیاتش قضا در نوشت

which Mr. Syed Muhammad translates as :—

'Mian Khan in the beginning of whose youth,
Death was written on the carpet of his life.'

But (در نوشت) means 'rolled up'; so the verse should be translated as follows :—

'Mian Khan, whose carpet of life Death rolled up in the prime of youth.'

(10) *Inscription No. 110 on the tomb of Muhammadi Khanam in the Shia cemetery situated near the Gulzarbagh Railway Station* :—

related to Shaista Khan; but the *Yai nisbat* (ی) in Shaista-khani (شایستہ خانی) leaves no doubt whatsoever that the builder, Haji Chand, was a slave or a personal servant of Nawwab Shaista Khan. This construction is of frequent occurrence in Muslim inscriptions and we find even ruling kings such as Qutbuddin Aibak and Shamsuddin Altamish mentioning the fact that they were the slaves of the Sultan (Shihābuddin Ghauri) by adding the epithet *Sultani* at the end of their names.

(5) *Inscription No. 47 on the Lodi Katra Mosque.*—In this inscription the 2nd hemistich has been read as the 3rd and *vice versa.* The two couplets, of which the inscription consists, should be read as follows:—

(۱) چو این مسجد بتائید الٰهی
طفیل شاه ارزانی بنا یافت
(۲) بتاریخ همایون کلک تقدیر
رقم زد کعبهٔ ثانی بنا یافت

And the translation would be:—'When with the help of God, and through the grace of Shah Arzāni, this mosque was constructed, the pen of Fate wrote down on an auspicious date "A second Kāba has been erected".'

(6) *Inscription No. 72 on Shah Rustam Ali's tomb in the compound of a mosque in the Nanmuhia* quarter:—

In the third hemistich of this inscription Mr. Syed Muhammad has read Na-Jawānmardam as Najawan Murdam. The translation should therefore be '*if I have not been a* (جوانمرد) *i.e., a brave or an ideal man in deeds,* pass thou by me like a brave man (جوانمرد)'. Mr. Syed Muhammad's translation '*if I died unmanly in action*' gives a different sense from that which the composer of the verses intended to convey.

The verse in question reads:—

اگر من نا جوانمردم بکردار
تو بر من چون جوانمردان گذر کن

(٥) کردم سوال سال بنایش ز پیــر عقــل
گفتــا بگو خرامی خیــر المقــام جای

which the author translates as :—

In the reign of the Emperor *Jahangir the light of the eye*,
The just, generous, wise and intelligent Parvez Shah,

* * * *

Constructed this choice building *under his supervision* and *which* is
As firm as a rock in the pursuit of the precepts of Mohammad

* * * *

I asked about the date of construction from the old wisdom,
Which said 'Say, it is a place *to walk to* paradise'.

In the light of the readings offered by me, however, the translation of the verses should be as follows :—

'*During the viceroyalty of* Prince Parvez, *the light of the eyes of the Emperor Jahangir*, who is just in judgment and generous with wisdom.

* * * *

This especial (خاص) building was *constructed by Nazar Khweshgi who is* steadfast like a mountain, in obeying the Law (شرع) of Muhammad.'

* * * *

I questioned the old man of wisdom about the year of its construction and he replied, *Say O Khirāmi* 'This place is the best resort'.

The inscription might be *in situ ;* but there is nothing in the inscription to indicate that it was originally put up on a mosque.

(3) *Inscription No. 9 on the Idgah of Saif Khan.*—The last but one word in the sixth line of this inscription should be *Khush*, not *Arsh*.

(4) *Inscription No. 12 on Haji Chand's Mosque.*—Mr. Syed Muhammad finds it difficult to make out how Haji Chand was

amended. According to Mr. Syed Muhammad the mosque was built in 1036 A.H. 'by Prince Parvez under his supervision'; but as that Prince died in 1035 A.H. at Burhanpur, the author believes that although the Prince began the construction of the mosque it was finished after his death. As a matter of fact, however, the inscription clearly mentions in the 3rd line the construction of the building by a highly respectable officer of the Prince named 'Nazar Khweshgi', i.e., Nazar Bahadur, a Khweshgi Afghan of Qasur, near Lahore, who later on held a rank of 1,500 under Jahangir and of 4,000 under Shah Jahan and died in the year 1062 A.H. at Lahore (Maathirul Umarā, Vol. III, pages 818 ff.). The syllable *Ba* read by the author of the article at the beginning of the name Nazar Khweshgi does not appear on the stone as will be seen from the facsimile published with this note.

The chief reason why Mr. Syed Muhammad falls into this error, seems to be his failure to read the *izafat* at the end of the word *chashm* in the first line of the inscription. Obviously it was Prince Parvez and not the Emperor Jahangir who was the light of the other's eyes.

Lastly the fact that Khirāmi (خرامی) in the last line was the poetic name of the composer of the verses has been lost sight of altogether with the result that the author is faced with a construction quite unusual in Persian and has to give a translation which he would not have given otherwise.

The lines in question read:—

(۱) در عهد نور چشم جهانگیر بادشاه
پرویز شاه عادل ، با ذل بعقل و رائی

(۲) ... ...
... ...

(۳) کرد این بنای خاص نظر خویشگی که هست
در پیروی شرع محمد چون کوه پای

(۴) ... ...
... ...

A Note on 'Old Muslim Inscriptions at Patna'.

By M. Hamid Kuraishi, Esq., B.A., Archæological Survey of India.

In the recent (September–December, 1930) issue of the Journal of the Bihar and Orissa Research Society Mr. Syed Muhammad, B.A., B.L., has published a lengthy article on 'Old Muslim inscriptions at Patna' complete with bibliography, index, etc. An effort has been made by the author to include in the article all available Persian and Arabic inscriptions from the time when the town formed part of the extensive kingdom of Sultan Husain Shah of Bengal to the year 1857 A.C. Much as the work is to be appreciated, certain defects have crept in here and there which it is the object of this note to correct. In the first place there are a number of Printer's mistakes in the Persian and Arabic texts of the inscriptions, which it is hoped will be duly rectified in the errata. Secondly in some of Mr. Syed Muhammad's readings of the inscriptions the requirements of Persian grammar and idiom have been apparently overlooked. It is not my purpose here to deal with each individual inscription; but a few of the more obvious emendations have been made in the hope that the author who seems to take a keen interest in Muslim epigraphy may be encouraged to be more careful in future.

(1) *Inscription No. 6 on the Mausoleum of Shah Arzāni.*— The reading شاد جنت ارزاني '*Beautiful* paradise of Arzāni', neither rhymes properly nor gives good sense; nor indeed does it yield the date 1028 which should be the alphabetical value of the chronogram and which is written in figures at the end of the epigraph. Obviously the phrase should be read as 'Shah-i-Jannat Arzāni'. This reading would rhyme properly, make the chronogram equivalent to 1028 A.H., and give the full name of the saint at the same time.

(2) *Inscription No. 8 on the Patthar-ki-Masjid.*—In this important inscription some serious mistakes require to be

W

Z

R

S

T

N

O

P

I

J

K

L

M

C

D

F

G

H

INDEX TO NAMES IN INSCRIPTIONS.

(REFERENCE IS TO THE NUMBER OF THE INSCRIPTION.)

A

B

Inscription.

مسجدے مرتفع بنا فرمود　　چون تبارک علی پاک سرشت
کلک نکہت بسال تعمیرش　　کعبہ نو بہند ساخت نوشت

في سنه ۱۲۷۵

Translation.

When Tabarak Ali of holy disposition
Built this high mosque,
The odoriferous pen for its date of construction
Wrote " He built a new Kaaba in India ".

In 1275 A. H.

No. 112.

Headstone of Latifan's tomb.

There is a headstone of a tomb of a lady named Bibi Latifan kept in a niche in Haji Chand's mosque which seems to have been brought from the grave-yard to the north of the mosque which has been turned into vegetable garden. She died in 1276.

Inscription.

چو رفتہ سیدہ بي بي لطيفاً　　سوے باغ ارم با صد تاسف
بجستم عبرتي سال وفاتش　　سوے خلد بریں شد گفت ہاتف

۱۲۷۶

Translation.

When Syeda Bibi Latifan went
Towards the garden of paradise, with great regret
Ibrati, I searched the date of her death.
" She went toward sublime paradise " said the latent informer.

1276.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

بنال فرقتی خسته دل بماتم او
که مرد زوجه خوبت محمدي خانم

چو او بوده زنے پاکدامنے بجهان
فداے عصمت زان نیکخو دل و جانم

ربیع اول و تاریخ بود سیزدهم
که ریخت خاک مصیبت به فرق سایانم

هرین کشاکش ماتم که هر نفس ملک
چو شعله بر بکشیدست آه و فغانم

به فکر سال رحلتش جگر طپان بودم
که سوے خلد برین شد گفت رضوانم

۱۲۷۲ ھ

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.

My heart is broken with lamentation for the separation of the good lady Mohammadi Khanum who is dead.

As she was a pious lady in this world, my heart is a sacrifice for her chastity.

It was the thirteenth of the first Rabi that this calamity fell on my head.

In mourning intensely for her all the people of the country are drawing sighs like flames.

My heart was palpitating in search of the date when Rizwan[1] said " She went towards the paradise."

1272 A.H.

No. 111.

Baqargunge lane mosque.

The mosque in Baqargunge lane which is about 6 furlongs east of Gola was built by one Tabarak Ali in 1275 A. H.

---

[1]. The angel at the gate of the paradise.

Translation.

Mian Khan in the beginning of whose youth
Death was written on the carpet of his life,
Started on Monday the fourth of month of fast[1]
For a walk in the garden of paradise.
On the headstone of his tomb about the date of his death, wisdom
Wrote " the death of the youth ".
1271 Hijri of the Prophet may be blessing of God be on him and peace.

No. 109.

Shaikh Heingan's mosque.

Shaikh Heingan's mosque is situated in Nagla about 7 miles east of Gola. It was built by him in 1271 A.H.

Inscription.

با صدق و صفا چو شیخ هینگن   کرد از سر نو بناے خانه
شهرـت پے یاد گار عالم   تاریخ بگو خداے خانه
فی ۱۲۷۱ هجری

Translation.

As Shaikh Heingan with truth and conviction
Newly constructed the house
Which is famous for being a monument of its time,
Say its chronogram " House of God ".
In 1271 A. H.

No. 110.

Mohammadi Khanum's tomb.

The Shia cemetery situated near the Gulzarbagh railway station has some old tombs the inscription of two[2] of which have already been described. In it there is the tomb of a lady named Mohammadi Khanum who died in 1272 A.H.

---

[1] i.e. the month of Ramzan.

[2] Those of Mir Abdullah (no. 105) Mehdi Ali Khan (No. 106).

No. 107.

Nai Sarak mosque.

The Nai Sarak mosque is on the main road at Hajigunj where the Nai Sarak or the New Road joins it. It is about 6½ miles east of Gola and was built by Kulsum-un-nisa in 1270 A.H.

Inscription.

مسجد عالی بتوفیق خدا کان عبادت خانه باشد گدا و شاه‌را
هاتف غیب ......این تاریخ بگفت کرد کلثوم النساء بنیاد بیت‌اللہ‌را

۱۲۷۰

Translation.

The great mosque which by the grace of God
Is a house of prayer for the rich and poor,
The latent informer......said its chronogram[1]
"Kulsum-un-nisa constructed the house of God."

1270.

No. 108.

Mian Khan's tomb.

Mian Khan was the son of Shaikh Barkat in the compound of whose mosque he is buried. Shaik Barkat's mosque is in Moghalpora, a quarter of the city. Mian Khan died in 1271 A.H.

Inscription.

میان خان که در عنفوان شباب
بساط حیاتش قضا در نوشت
درشنبه چهارم ز ماه صیام
روان شد پسے سیر باغ بهشت
بلوح مزارش خرد سال فوت
قضا نوجوان پسے هي نوشت
۱۲۷۱ هجری النبی صلی الله علیه و سلم

[1] Some words in the third line could not be read.

سه شنبه بد و چارم شوال که چون گل

داعی ......زین لاله ستان رفت

بنگاشت سن رحلت او عبرتی زار

والا مسمی باکرمی سوے جنان رفت

بروز سه شنبه چهارم ماه شوال سنه ۱۲۶۶ الدوران مهدي علي خان

از این جهان فانی رحلت فرمود -

Translation.

O the best of forgivers

In the name of God the Merciful and Clement

Why should I not weep? Mehdi Ali Khan passed away from this world.

Why should I not lament? The generous Hatim[1] of his time is dead.

He had a desire to go to paradise, it was for this that

His bier was carried rapidly on the cloud;

He was very generous to all the people,

Therefore every one of them was crying with sorrow;

The ears of the angels were swollen like oyster,

As all the people were lamenting for him.

How is it that the sky has become black in mourning for him?

It seems that the smoke of lamentation from his friends went up to the heaven.

Ever since he died, young and old were much oppressed.

Every burnt heart that came on his grave

Went away shedding tears like the candle on his tomb.

It was Tuesday the fourth of Shawwal when like a rose

[2]........he went away from this garden.

The sorrowful Ibrati, wrote the date of his death

" The well known generous person went to the paradise."

On Tuesday the 4th of Shawwal 1266 of the era Mehdi Ali Khan passed away from this transient world.

---

[1] Hatim is name of Arabian King proverbial for generosity.

[2] This could not be read in the inscription as it was not clear.

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.
When the worthy and magnificent Abdullah
Slept below the earth by God's command,
From the heaven Gabriel said in Ibrati's ears
About the date of his death " His patrons are the five holy persons[1] ". 1265.

No. 106.

Mehdi Ali Khan's tomb.

Mehdi Ali Khan was the brother of Mir Abdullah the inscriptions on whose tomb are recorded above. He lies buried near the tomb of his brother in the cemetery near Gulzarbagh railway station. He was the father of Nawab Vilayet Ali Khan who became very prominent in the Mutiny of 1857 A.D. Mehdi Ali Khan died in 1266 A.H.

Inscription.

یا خیر الغافرین
گریم نه چرا مهدی علی خان ز جهان رفت
نالم نه چرا حاتم فیاض زمان رفت
در سر هوس خلد برین داشت کز اینجا
برابرش تابوت چنین کرم عذاں رفت
میکرد بهر خلق خدا بسکه مروت
هر فرد بشر در غم او نعره زمان رفت
شد گوش ملائک چو صدف آبله زارے
تا نوحه او اهل جهان را بزبان رفت
در ماتم او گشت فلک از چه سیه پوش
بر عرش زبارانش مگر دود فغان رفت
تا نوحه از سنگ شده زیب مزارش
صد آوه ستم بر سر پیر و جوان رفت
هر سوخته جانے که سر تربتش آید
چون شمع مزارش ز الم اشک فشان رفت

---

[1] پنجتن or the five holy persons are Prophet Mohammad, Ali, Fatma, Hassan and Hossin.

رئیس زمان میر عبداللہ چون
دلش گشت مشتاق سیر جنان
بیاراست بر تن قبائے ممات
بعزم سفر بست محکم میان
نورد دید مرگش بساط حیات
برون رفت ازین بزم دامن فشان
بمن گفت محزون زسال رحیل
هزار در صد شصت پنجم بدان

Translation.

The person buried here was a believer with pious intentions. He amassed a vast fortune for eighty-seven years and he spent much in charity and beneficence over the mourning for the fifth *Aly aaba* [1] and exceeded the richest men who were example for it. At last on the night of Thursday the 30th Moharram...he passed to the holy region empty handed leaving all the wealth and dignity and he did not carry with him anything except the wealth of religion. Ponder over this, oh people of vision !

When the heart of Mir Abdullah, the prince of his time became fond for the paradise,
He put on his body the robe of death and he bound his waist fast for the journey,
Death folded the carpet of his life and he passed away from this showy assembly.
About the date of his death Mahzun told me "Know it to be one thousand one hundred and sixty-four".

Inscription on the other side of the stone.

بسم اللہ الرحمن الرحیم
چو عبداللہ والا قدر ذي جاه
بحکم ایزدی زیر زمین خفت
بگوش عبرتی از چرخ جبرئیل
سن رحلت شفیعش پنجتن گفت
۱۲۶۵

1 By fifth آل عبا is meant Imam Hussain, the grandson of the Prophet.

No. 104.

City Court mosque.

The mosque known as City Court mosque which is on the main road near the Patna City Court was built by one Paember Bux in 1265-A. H.

Inscription.

یافت چون مسجد خجسته بنا   اختتام از ید پیمبر بخش
خامه تاریخش از سر برکات زد   زد رقم مسجد پیمبر بخش[1]

Translation.

When the construction of this auspicious mosque,
Ended from the hands of Paember Baksh,
The pen through blessings,
Wrote "Mosque of Paembar Baksh".

No. 105.

Mir Abdullah's tomb.

Mir Abdullah who was also called Mir Gadahia was the father of Nawab Lutf Ali Khan, C.I.E., of Guzri family[2]. He left a very large fortune when he died in 1265-A. H. Both the side of the headstone of his tomb have got inscriptions.

Inscription on one side.

صاحب این قبر مرحوم بود پاک عقیده تا عمر هشتاد و هفت
سال زر فراوان اندوخت و بعزائے خامس آل عبا خیرات مبرات
بسیار خرچ ساخت و از امثال واقران گوئے سبقت ربود آخرکار
بتاریخ ۳۰ محرم بگذشت[3] ......کهنه...... از شب پنجشنبه همه
جاه و دولت را گذاشته تهی دست بعالم اقدس ارتحال نمود
و جز دولت دین چیزے با خود نبرد فاعتبروا یا اولی الابصار

---

[1] مسجد پیمبر بخش — 1263 سر برکات is ب which is equal to 2 thus the total is 1265.

[2] For the description of Guzri family see Mr. James' Patna Gazetteer pages 139-140.

[3] Some words are missing.

Inscription.

بهنگام احسن بفضل الله چو راحد علی تاجر با سخا
بنا کرد مسجد ر هاتف بگفت در آیند عابد بخانه خدا
سنه ۱۲۶۳

Translation.

In an auspicious time by the grace of God,
When Wahid Ali the generous merchant,
Constructed the mosque, the latent speaker said,
"The devotees may come in the house of God",
1263.

No. 103.

Shish Mahal private mosque.

The private mosque at Shish Mahal was constructed by one Hakim Zulfaqar Ali Khan of Agra in 1264-A. H. It is in Shish Mahal, a quarter of the City about 5½ miles east of Gola.

Inscription.

کرد بهر نماز خرد تعمیر نه پے غیر مذهبان کثیر
مسجد بیتی ذوالفقار علی از براے رضاے رب قدیر
در صد و یکهزار شصت چهار بود از هجرت رسول کبیر
حکیم ذوالفقار علی خان رضی الحسینی اثناے عشری اکبرآبادی
بصرف یکهزار و دو صد و پانزده روپیه مسجد در سنه ۱۲۶۴ هجری
بعرصه یک سال تیار ساخت

Translation.

For the gratification of God,
Zulfaqar Ali constructed the private mosque,
To say his own prayers,
And not for the numerous followers of other beliefs,
It was one thousand two hundred and sixty-four,
Of the Hijri of the great Prophet,

Hakim Zulfaqar Ali Khan Raziul Husaini Asnai Ashri Akbarabadi built this mosque in 1264-A. H. in one year at a cost of rupees one thousand, two hundred and fifteen.

No. 101.

Dafali's mosque.

The mosque built by Mohon, the wife of a *dafali* or drum maker, which is known as the *Dafali's* mosque is on the main road on the north-side of it in Sultangunge about 2½ miles east of Gola. It was built in 1263-A. H.

Inscription.

بجد رجہد چو تعمیر کرد مسجد خام
نکو سرشتہ موھن زن ربانہ ساز
بگفت سال بنایش ز روے دل فرحت
بیا بمسجد حق با ادب نماز گذار
سنہ ۱۲۶۳
تعمیہ چار عدد

Translation.

When the good natured Mohon, the wife of a drum-maker,
Constructed the mud built [1] mosque with great endeavour,
Farhat said from his heart the date of construction (thus),
"Come in the mosque of God and pray respectfully,[2]
1263,
Addition 4.

No. 102.

Wahid Ali's mosque.

The mosque known as Wahid Ali's mosque is on the main road in Chowk about 6 miles east of Gola. The inscription shows that it was built by a merchant named Wahid Ali in 1263-A. H. but the mosque seems to have been only rebuilt in that year and as its plinth and the shops attached to it are very old. Perhaps this is the mosque which was known as Shaista Khan's mosque and was built by Nawab Shaista Khan at the close of the seventeenth century.[3]

---

the mosque is brick built.

[2] بیا بمسجد حق با ادب نماز گذار gives 1259.

[3] Both Mr. OMalley, and Mr. James mention it in their Patna Gazetteers as Shaista Khan's mosque. Mr. R. L. Sinha in "Pataliputra" speaks of it as such, but it is locally known as Wahid Ali's mosque.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

دریغا آن امام و قبله دین   چراغ افروز راه بزم ارشاد
فقیه و عالم و علامه عصر   اساس ورعه را بود است بنیاد
نجف را با علی چون [1]   که نام نامی پاکش دهد یاد
سروش غیب سال رحلتش خواند   ستون کعبه دین حیف افتاد

١٢٦١

کتبه السید مرتضی النونهروی   محمد صادق ذاکر کنده نمود
سبط سید مرحوم

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.
Alas! that priest and leader of religion,
The kindler of the lamp of society of religious orders,
The theologian, the sage and the most learned of his time,
Who was the foundation of piety (died).
When Najaf is (joined) with Ali [2]
Whose name reminds to the holy name, [3]
An angel of paradise said his date of death,
"Alas the pillar of Kaaba of religion (thus) fell down"

1261.

Written by Syed Murtuza Nohnahravi, son of Syed deceased.	Mohammad Sadiq Zakir inscribed it.

No. 100.

Heengan's Mosque.

Heengan's mosque is in Kamangar Gali about 5¼ miles east of Gola. It was built in 1261 A. H. by Heengan who was a dancing girl.

Inscription.

این خانه خدا هست زبیجی قایم

١٢٦١

Translation.

This "house of God" exist through the help of Beji.[4]

1261.

---

1. One of the words of the third verse in the inscription could not be read.
2. This line is not clear in the inscription
3. The reference about holy name is to Ali, the son-in-law of the prophet.

Beji was Heengan's daughter.

Inscription.

آن مسجدیکه بهر سجود نمازیان
زل علي عظیم بنایش نهاده بود
از هم شکست مثل دل حضرت بلال
چون فرق سجده زیر بخاک افتاده بود
بار دگر چو میر سعادت علي بدهر
بهر درستیش کف همت گشاده بود
از امر او غلام حسین خوش اعتقاد
تعمیر آن بطرز خجسته نهاده بود
جز خانه خدا سنه تعمیر زیر چرخ
در گوش عبرتی نه ز هاتف فتاده بود
سنه ۱۲۶۱

Translation.

The mosque which for the prayer of the devotees,
Ali Azim had at first constructed,
Broke down like the heart of Hazrat Balal, [1]
When it fell head like in prostration.
A second time Mir Saadat Ali
Had shown generosity by constructing it.
By his order Gholam Husain of good belief
Built it in an auspicious way.
For its date of construction except the " house of God "
Nothing did reach Ibrati's ears from the latent informer.
1261.

No. 99.

Najaf Ali's Tomb.

Najaf Ali died in 1261 A. H. and his tomb is near Moghalpura in the city.

---

[1] Hazrat Balal was the Abyssinian companion of the prophet who used to cry the call of prayers in mosque. The reference is to the fact that he was very much disturbed after the death of the prophet.

built in 1258 A. H. The inscription has come out of its place and is kept in a house near by.

Inscription.

مسجدے خادم علي كرده بنا

کان پسند چشم هر کس آمده

از خرد جستم چو تاریخش بگفت

ثانی بیت المقدس آمده

سنه ۱۲۵۸ هجري

Translation.

Khadim Ali constructed the mosque,
Which was liked by every body,
When I enquired of its date from wisdom, it said,
"It is a second temple of Jerusalem."

1258 A. H.

No. 97.

Ibadullah Shah's Mausoleum.

Ibadullah Shah's mausoleum is within the compound of Shah Arzani's *dargah* about 3 miles east of Gola. He died in 1260 A. H.

Inscription.

جانشین شاه ارزان چون جنید * یافته: تا دولت قرب الله

گفت سال رحلتش را عبرتی * زین جهان رفته عباد الله شاه

سنه ۱۲۶۰ ه

Translation.

When the Junaid like successor of Shah Arzan,
Found the wealth of proximity to God,
Ibrati said the chronogram of his death,
"Ibadullah Shah passed away from this world".

1260 A.H.

No. 98.

Alamgunge Mosque.

The Alamgunge mosque is on the main road in Alamgunge **about 4 miles east** of Gola. It belongs to the Shia Community and was built in 1261 A. H.

He is Forgiver.
In the name of God the Merciful and Clement. Oh God forgive the sins of both, by the grace of the Prophet may the blessing of God be on him and peace.

Translation.

God is Great.
Two brothers with pious intentions,
Constructed the house of prayer,
The fond heart for its chronogram
Was engaged for an hour,
For the sake of unity it deleted the conjunction " and ".
(And) said " Construction of Jumman " *and* Himmat ",
1258 A. H. Constructed by Jumman and Himmat Barbers.

In the name of God the Merciful and Clement. I declare that there is no God but God and I declare that Muhammad is his servant and Prophet.

No. 95.

Idgah of Dargah.

Within the compound of the mausoleum of Shah Arzani is the *idgah* constructed by Ibadullah Shah who was seventh in succession to the saint Shah Arzani. It was built in 1258 A. H.

Inscription.

كعبه نظير عيدگہی عرش وسعتی
تعمیر چوں خلیفه شیم ...... نموده [1]
پرسید عبرتی سنه اوارا زغیب گفت
سنه یکہزار ودو صد پنجاه وهشت بود

Translation.

The Kaaba like *idgah* which is as extensive as heaven,
When the caliph like................constructed it,
Ibrati asked its date and he was told invisibly,
" It was one thousand two hundred and fifty-eight."

No. 96.

Khadim Ali's Mosque.

Khadim Ali's mosque is in Golakpur about 2 miles east of Gola. The mosque which is now in a ruinous condition was

[1]. The second verse of the inscription could not be read properly. It seems that some word is missing.

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement
Fazl Ali, the Syed[1] of high parentage
Having constructed the great mosque provided with a house of piety.
Although its beginning was with the help of the faithfuls,
But by Fazl Ali its construction was completed.
When Zakir consulted from his heart about the date of its construction,
A voice came from the latent speaker that it was a "second Holy House".

1257 Hijri of the prophet, may the blessing of God be on him and peace.

No. 94.

The Lawn mosque.

The mosque known as "Lawn mosque" is to the south of the Bankipore Maidan on the main road. It was built in 1258 A. H. by two hairdressers Himmat and Jumman who were brothers.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

اشهدان لا اله الا الله و اشهدان محمداً عبده و رسوله

الله اکبر

دو برادر به نیت صادق
کرد بنیاد خانه طاعت
پے تاریخ از دل مشتاق
رفت در بحر فکر یکساعت
بهر توحید دار عطف فگند
گفت تعمیر جمن و همت
سنه ۱۲۵۸ هجری تعمیر جمن و همت حجام

اللهم اغفر ذنوبنا بحرمت نبی صلی الله علیه وسلم

بسم الله الرحمن الرحیم

هو الغفار

[1]. Syeds are the descendants of the prophet.

که مجذوب حق شاه تکیه گذشت
گلستان جنت شدش خوابگاه
کرامات او شهره عالم است
برین عالمے را بیارم گواه
چو شب تیره بودش تن ازخاکمال
ولیکن دلش بود روشن چو ماه
ملائک پے سال رحلت بعرش
نوشتند مجذوب عشق الله[1]

Translation.

All things are transitory and the face of your God the Gracious and Merciful will remain for ever.

Why should not the world flute like lament with sorrow
Why should not sighs arise from the hearts of people,
For the saint Shah Tikia passed away, (and)
The garden of paradise became his resting place.
His miracles are so well known throughout the world that
I can bring the whole world to bear witness to this.
His body was black like night from the dust
But his heart was as bright as moon.
The angels in the heaven for the date of his death
Wrote "the saint of the love of God".

No. 93.

Fazl Ali's mosque.

Fazl Ali's mosque which is in the City was built in 1257 A. H. by him.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحیم
کرد چو فضل علي سید عالی نسب
خانه تقوی درست مسجد عالي بهم
از مدد مومنین گرچه شد آغاز او
لیک ز فضل علي گشت بنایش اتم
فکر بتاریخ او کرد چو ذاکر زدل
گشت ز هاتف ندا ثانیه بیت الحرم
سنه ۱۲۵۷ هجری النبی صلی الله علیه وسلم

1. مجذوب عشق الله gives 1257 as the date.

No. 91.

Bakergunge mosque.

The mosque which is on the Lower Road about a furlong east of the Bankipore Maidan was built by a lady named Khairunnissa in 1257 A. H.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

لمسجد أسس على تقوى من اول يوم احق ان تقوم فيه [1]

بهر رضاے ساخته خیر النسا

مسجد عالی بنا چوں حرم محترم

خامه زاهد چو کرد سال بنایش طلب

هاتفش آواز داد ثانیه بیت الحرم

سنه ۱۲۵۷

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.

Verily the mosque has been founded on purity, from the first day. You have the full right to pray in it.

For God's pleasure Khairunnissa built
The great mosque like the holy Kaaba.
When Zahid's pen wanted the date of construction
The latent informer cried "A second Holy House".[2]

1257.

No. 92.

Tikia Shah's tomb.

Tikia Shah's tomb is in Diwan Mahalla, a quarter of the city about 5 miles east of Gola. Tikia Shah who was saint died in 1257 A. H.

Inscription.

کل من علیها فان و یبقی وجه ربک ذوالجلال والاکرام [3]

جهاں همچوے چوں ننالد زغم

نه خیزد ز دلها چرا درد آه

[1]. Holy Quran portion of verse 14, Part 11, Chapter IX, entitled the "Repentence".

[2]. Holy House, the temple at Mecca.

[3], Holy Quran, Part 27, Chapter LV, entitled the 'Merciful", verse 25.

Translation.

God the holiest is Great.	God is sufficient.	The lamp, mosque, *mihrab* and the pulpit.
Mohammad the chosen one is true Prophet.	In the name of God the Merciful and Clement.	(? re so to say) Abu Bakr, Omar, Usman and Haider.

Only he constructs mosques for God who believes in God and the day of judgment and performs prayer, gives alms, and did not fear.

He who builds a mosque for God, paradise is for him.	There is no God but God and Mohammad is His prophet.	Abu Bakr, Omar, Usman and Ali.	The caliphs of the prophet of God, may God be pleased with them.

Abu Bakr, Omar, Usman and Ali were the four caliphs after the prophet.	Sheikh Ali for God's sake and through the grace of God constructed the mosque.	Hijri 1255.	When I searched for the date from the chronogram a "house of righteousness" was the hidden cry.	Bu Hanifa, Shafai, Humbli and Ahmad Malik were the four *imams*.

No. 90.

Shah Gholam Husain's mosque.

Shah Gholam Husain's mosque is in Nagla about 7 miles east of Gola. It was built by him in 1255 A. H.

Inscription.

مسجد بنا چو شاه غلام حسین کره

چون گلشن ارم شده مطبوع دلکشا

تاریخ او چو فکر نمودم ندا رسید

بر کش حروف او بگو خانه خدا

سنه ۱۲۵۵ هجری

Translation.

When Shah Gholam Hussain built the mosque.

It was as pleasant as the garden of paradise.

When I wanted a chronogram, a voice said.

Delete the letters of "that" and say "House of God".

1255 A. H.

---

[1]. خانه خدا gives 1262 and if the equivalent of از (=7) is deleted it becomes 125 5.

No. 89.

Gulzarbagh mosque.

The Gulzarbagh mosque is situated on the main road on the north side of it about 4½ miles east of Gola. It was built by one Sheikh Ali in 1255 A.H.

Inscription.[1]

چراغ و مسجد و محراب و ممبر	الله کافي	خداے پاک تر الله اکبر
ابوبکر و عمر عثمان حیدر	بسم الله الرحمن الرحيم	محمد مصطفي برحق پیمبر

انما يعمر مساجدالله من امن بالله واليوم الاخر و اقام الصلوة واتي الزكواة و لم يخش[2]

ابو بكر عمر خليفه رسول	من بنى الله مسجداً
عثمان علي الله رضوان الله عليهم لااله الاالله محمدرسول الله	فله الجنه[3]

هجری	شیخ علي زبهر خدا	ابو بکر و عمر و عثمان و علي
سنه ۱۲۵۵	کرد مسجد بنا بمهر خدا	بعد پیمبر خلیفه چار شد
بو حنیفه شافعی هم حنبلی		سال تاریخ از همي جستم
احمد مالک امام چار شد		بیت بالخیر شد زغیب ندا

[1]. The writing in the corner should be read together. The four lines in the upper portion in both the corners form a qu train similarly the four lines in the lower portion form another quatrain.

[2]. The quotation in Arabic in the middle is from the Holy Quran, Part X, Chap. IX, entitled "Repentence."

[3]. This is abridged from the saying of the prophet من بني مسجدالله بني اله له بيتاً في الجنه

No. 88.

Kaua Khoh mosque.

In Kaua Khoh [1], a quarter of the city about 6¾ miles east of Gola is mosque known as Kaua Khoh mosque which was built in 1253 A. H. by Shaikh Ali Baksh Qadiri or Ahmad Chisti or both, as both the names are mentioned in the inscription. Although the inscription is in Persian it contains two Urdu words [2] of pure Hindi origin.

Inscription[3]

بسم‌الله الرحمن الرحیم

لااله الاالله محمد رسول‌الله

شیخ علی‌بخش قادری را بخش رب‌العالمین

سرخ رو احمد چشتی هو یا مالک دیار و دین

دوازده صد سال هجرت سال در پنجاه و تین

مسجدے آراستہ نو کرد بر روے زمین

Translation.

In the name of God, the Merciful and Clement.

There is no God but God and Mohammad is his prophet.

O, Creator of the universe! pardon Shaikh Ali Baksh Qadiri.

O Master of world and faith triumph Ahmad Chisti,

It was twelve hundred fifty-three of the Hijra

When he made a new mosque and adorned it on the face of the earth.

---

1 Kana Khoh is corruption of Kaiwan Shikoh or "the Splendid Palace" which was the name of the palace built by Prince Azimushan while he was governor of Bihar. The palace no longer exists now but the quarter of the city where it stood is called as such after it.

2 هو and تیں are Hindi words.

3 This inscription is also given in an article in Patna College Magazine (March 1913, page 96) but is mentioned as an inscription from dargah of Shaikh Shakri in *mohalla* Shakri.

Translation.

<table>
<tr><td>Abu Bakar.</td><td>In the name of God the Merciful and Clement.</td><td>Omar.</td></tr>
<tr><td colspan="3">Say the date of the construction of
the beautiful old mosque rebuilt.
The latent informer cried from merciful heart
"O righteous, come and say your prayer."</td></tr>
<tr><td>Usman.</td><td>1251 prophet's Hijri.</td><td>Ali.</td></tr>
</table>

No. 87.
Shah Karim Bux's Mausoleum.

Shah Karim Bux who was sixth in succession to Shah Arzani died in 1252 A.H. His mausoleum is in the compound of Shah Arzani's mausoleum.

Inscription.

آن کریمے کہ بود بحر کرم
کرد رحلت زکہنہ دیر فنا
بود مقبول خالق اکبر
ماتمش کرد عالمے بالا
قدسیان عدن همي کردند
سال تاریخ فوت او انشا
گفت رضوان بخلد تاریخش
اے جناب کریم بخش بیا
سنه ۱۲۵۲ هجري

Translation.

That benevolent who was an ocean of charity
Passed away from the transitory world.
He was a chosen one of the Great Creator, (so)
The world above mourned for him.
The pious of paradise were trying
To write the chronogram of his death
(When) the angel of paradise said its date
"Come on, Your Honour, Karim Bux."

1252 A.H.

Public Library, Patna. The inscription belongs to some bath in Patna City[1], and it appears from the inscription that it was built in 1249 A.H.

Inscription.

محمد یحیی خان ابن علي قاسم خان بهادر مغفور
بماه ربیع‌الاول سنه ۱۲۴۹ هجري حمام سنگي تعمیر نمود

Translation.

Mohammad Yehya Khan, son of Ali Quasim Khan Bahadur deceased, constructed the stone bath in the month of Rabi I, one thousand two hundred and forty-nine Hijri.

No. 86.

Chowk mosque.[2]

The Chowk mosque is on the main road at Chowk about 6¼ miles east of Gola. The inscription in figure has 1251 as the date of construction but the chronogram gives 1221 A.H.

Inscription.

یا عمر	بسم الله الرحمن الرحیم	یا ابوبکر
مسجدے خوب کهنه نو تیار سال تهذیب کن برین اظهار زدل رحم بانگ زد هاتف اے مصلی بیا نماز گذار [3]		
یا علي	سنه ۱۲۵۱ هجري النبوی	یا عثمان

[1] There is a quarter of the City of Patna known as Hammam or the Bath, near the residence of Ali Ibrahim Khan. It seems probable that the stone belongs to the bath from which the quarter of the city derives its name.

[2] The inscription of this mosque has also been given in an article on mosques of Patna in Patna College Magazine for March 1913, page 95, but has wrongly been mentioned as an inscription from Fakhruddowla's mosque. Fakhruddowla's mosque the inscription of which has been noticed before (No. 46 supra) is situated about a furlong west of this mosque.

[3] اے مصلی بیا نماز گذار gives only 1213 but we have to add 8 (= ح) according to the hint.

No. 84.

Golakpur mosque,

The mosque called Golakpur mosque is in Golakpur, a quarter of the city about 2 miles east of Gola. It was repaired in 1248 A.H. by Zulfaqar Ali and has again recently been repaired. From the inscription it appears that Emperor Farrukh Sayair said his prayer in this mosque.

Inscription.

كرد احيا چو ذرالفقار علي
درستدار علي امام هدیٰ
مسجد شادمان را كه درو
كرد فرخ سير نماز ادا
بانگ زد سال حي بلال دلم
ساز آباد خانه تقویٰ
سنه ١٢٤٨ هجري

Translation.

When Zulfaquar Ali
The friend of Ali, the *imam* and true leader,
Rebuilt Shadman's mosque in which
Farrukh Sayair performed his prayer.
The Balal [1] of my heart cried the date of renovation
" May this house of piety flourish well ".
1248 Hijri.

No. 85.

Inscription of a Bath.

An inscription of a stone bath built by Mohammad Yehya Khan son of Ali Qasim Khan Bahadur[2] is in the Oriental

1. Balal was the companion of the Prophet who used to cry the call of prayer in the mosque.

2. Ali Qasim Khan was the brother of the famous Ali Ibrahim Khan (Syeerul Mutakh in English translation, 1789 edition, Volume II, page 348). Mr. James thinks that Mohammad Yehya was the brother of Ali Ibrahim Khan (Patna Gazetteer, page 40).

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement. There is no God but God and Muhammad is his Prophet. I declare verily that there is no God but God, the One having no equal and I declare that verily Muhammad is his servant and prophet. Constructed by Asalat Khan, Subedar, in one thousand two hundred and forty-four of holy Hijri.

No. 83.

Balkhi Saheb's mosque.

There is a small mosque in Bakshi Mahalla about 5½ miles east of Gola known as Balkhi Saheb's mosque after Hafizuddin Balkhi Saheb who repaired it. It was originally built by Akramul Haque in 1247 A.H.

Inscription.

لا اله الا الله محمد رسول الله

اکرم الحق چو کوفت بر سر راه

میخ اسلام مسجد دلخواه

گفت واعظ زسال تاریخش

فاذکروا فیه واسجدوا لله

من بنی مسجداً لله بنی الله له بیتاً فی الجنه [1]

سنه ۱۲۴۷ هجری

Translation.

There is no God but God and Muhammad is his Prophet.
When Akramul Haque struck on the road
The peg of Islam—the beautiful mosque,
Waiz said its date by chronogram (thus)
"Pray to God and recite His name in it."
God will build a house in heaven for him who will build a mosque for God.

1247. A.H.

---

1. This is from the sayings of the prophets.

No. 81.

Nagla mosque.

The mosque called the Nagla mosque was built by a lady named Aaliunnissa Begam in 1244 A.H. It is situated in mahalla Nagla about 7 miles east of Gola.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

کرد چون مسجد علي نسا بيگم بنا
از پـــئے شاه وگدا باب عبادت درکشود
گفت اين تاريخ از فضل امير درجهان
شد بنا بهر نمازي درجهان دارالسجود

سنه ۱۲۴۴ نبوي

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.
When this great mosque was built by Aaliunnissa Begam
The gate of worship was opened to the king and beggar alike,
By the help of the Master of the two worlds
" The house of worship was built for those who pray".
1244 the year of the Prophet.

No. 82.

Asalat Khan's mosque.

The small mosque of Asalat Khan is in *mahalla* Fakirbara about a mile to south-east of Gola. Asalat Khan as it appears from the inscription was a subadar, probably in the British Indian army.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

لا الله الا الله محمد رسول الله - اشهد ان لا اله الاالله وحده لا شريک له و اشهد ان محمداً عبده ورسوله تعمير ساختة اصالت خان صوبه دار يکهزار درصد چهل وچهار هجري قدسي

چون ساخت مسجدے که ....

بشکسته فرق کفر بگو خانه خدا [1]

سنه ۱۲۴۱ یکهزار و دو صد و چهل یک هجری

Transl^tion.

In the name of God the Merciful and Clement.
Turn your faces towards the extensive Holy Mosque
Kazim Ali who is a Shia (built this mosque).
The angel gave a cry from his chest to my ear
When he constructed this mosque ... .
Breaking the head of unbelief say 'house of God'.
1241 A.H. one thousand two hundred forty-one Hijri.

No. 80.

Bam Saheb's mosque.

The big mosque in Jaggi Chauraha Moghalpura about 5½ miles east of Gola known asB am Saheb's mosque was built by one Zahoran said to be the mistress of one Bam Saheb who according to local tradition was in the service of Government about one hundred years ago.

Inscription.

مسجدے نو ساخت چو آراست شد

در بلندی برد از گردون سبق

هاتفے تاریخ تعمیرش بگفت

معبد با رفعت از انوار حق

سنه ۱۲۴۳ هجری

Translation.

When this new mosque was constructed
It even went higher than the sky.
A latent informer said its chronogram of construction,
" An elevated place of worship from the light of God".
1243 A.H.

---

[1] خانه خدا 1261 but according to the hint ک (−20) is to be deducted.

Translation.

When Gholam Muhammad, the great physician
Ordered the construction of this mosque
Its chronogram was cried out
" The mosque was well made on the road."
1240.

No. 78.

Shaikh Bihari's mosque.

The mosque of Shaikh Bihari is in Moghalpura, a quarter of the city. It was built by Shafiuddin Hosain *alias* Shaikh Bihari in 1240 A. H.

Inscription.

آں شفع الدین حسین با صفا   داں برنغل رفیع حلم وجود
حسب امر قدرت و توفیق او   چوں بنائے مسجدے عالی نمود
گفت شاکر سال تعمیرش همین   حبذا دار حقیق بالسجود
۱۲۴۰ یکهزار دو صد و چهل هجری

Translation.

That pure Shafiuddin Hosain
The product of sublime humility and beneficence,
According to his power and grace
When he constructed this great mosque,
Shakir said its date of construction thus
" What a fine house to pray to God ".
1240. One thousand two hundred and forty Hijri.

No. 79.

Kazim Ali's mosque.

The large mosque of Kazim Ali is on the main road in Hajigunge about 6½ miles of Gola. It was built in 1241 A.H.

Inscription.[1]

بسم الله الرحمن الرحیم
فولوا وجوهکم شطرالمسجد الحرام البسیط *[2]
کاظم علي که دم زند از حب اهل بیت
بانگ بگوش من زسنیش سروش زد

1. Only a portion of the third verse of the quatrain could be read.
2. In Holy Quran, Part II, Chapter II entitied " the Cow" are the following verses:—فولوا وجو هکم شطر المسجدالحرام verse III, فوله و جهک شطرالمسجدالحرام verse VII, فوله و جهک شطرالمسجدالحرام و حیث ما دنتم فولو وجوهم شطر verse VIII;

No. 76.

Shah Hamza Ali's tomb.

The tomb of Shah Hamza Ali is in Shah Baqar-ki-takia, a quarter of the city about 4 miles east of Gola. Shah Hamza Ali died in 1236 A.H.

Inscription.

الف الله

عاشق حق مجرد و آزاد   شاه حمزه علی پاک وجود
چون ز مولی صداے عشق شنید   در ره وصل کام ذوق کشود
بود در جستجوے تاریخش   سر فرو برده احمد بے بود
از لب یاس گفت هاتف غیب   برده بستر بدرگه معبود

۱۲۳۶

Translation.

Begin with Allah.

The lover of God, the celebate and free
Shah Hamza Ali of pure existence,
When he heard the voice of love from God,
He became desirous to meet Him.
The lowly Ahmad bending his head
Was in search of the date,
(When) the latent informer said with the lips of despair
" He carried his bedding to the house of God."

1236.

NO. 77.

Choti Masjid, Gurhatta.

The mosque known as Choti Masjid or the small mosque is in Gurhatta, a quarter of the city about $5\frac{1}{2}$ miles east of Gola. It is on the main road and was built by Hakim Gholam Mohammad in 1240 A.H.

Inscription.

غلام محمد حکیم بزرگ   چو فرمود تعمیر این سجده گاه
شد از سر بانگ تاریخ او   بخوبی بناکرده مسجد براه

۱۲۴۰

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم الله اكبر الله اكبر لا إله الاالله و الله
اكبر و لله الحمد لا اله الا الله محمد رسول الله

تعمير بتاريخ پانزدهم شهر جمادي الاول سنه ۱۲۳۳ هجري
روز سه شنبه بوقت صبح مسماة بي بی نورن رحلت فرمودند
ابو بكر عمر عثمان علي ابو بكر عمر عثمان على

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement. God is Great, God is Great, there is no God but God and God is Great and all praises are due to God. There is no God but God and Mohammad is his prophet.

Constructed fifteenth Jamadi I 1233 A.H. Tuesday, in the morning Musammat Bibi Nooran died.

Abu Bakr, Umar.	Abu Bakr, Umar.
Usman, Ali.	Usman, Ali.

No. 75.

Moradpur mosque.

The mosque known as Moradpur mosque is on the main road in Moradpur about a mile and a quarter east of Gola. It was built by Bibi Mannoo Khanum who was the mistress of Mr. Boilard, the then owner of Chajju Bagh, now the residence of the Chief Justice. The mosque was built in 1234 A.H.

Inscription

لا اله الاالله محمدرسول الله

مسجدے عالی بناکرده کمل بي بي منو خانمی فرزانه
گفت دل تاريخ از هجر رسول پاک بنيادي عبادت خانه
سنه ۱۲۳۴

Translation.

There is no God but God and Mohammad is His prophet.
This great mosque was constructed.
By the wise Bibi Mannoo Khanum.
The heart said its date by the prophets Hijri.
" A house of worship " of clean foundation.

1234 A.H

No 73.

Muradunnissa's mosque.

Muradunnissa's mosque is in Lodikatra a quarter of the city about 6 miles from gola. She built it in 1233 A.H.

Inscription.

جل شانه	بسم الله الرحمن الرحيم	سبحانه
چون مراد النساء بحق آگاه خوش بناکرد مسجدے دلخواہ یافتم سال ازروے طلب فاذکرو رافیه دائما لله ۱۲۳۳		

Translation.

He is praiseworthy.	In the name of God the Merciful and Clement.	His state is glorious
When godly Muradunnissa Beautifully constructed the pleasant mosque, I got its date as I wanted it, (which is) " Pray to God in it for ever " 1233.		

No. 74.

Pagal Khana mosque.

The Pagal Khana mosque is so called because it is opposite to the compound in which formerly there was lunatic asylum. It is about a mile east of Gola and was built by Bibi Nuran as is given in the inscription. The inscription which is on the building of the mosque strangely shows the construction of the building as well as relates about the death of the lady as if it were a tombstone.

* فاذکرو رافیه دائما لله gives 1 24 but according to the hint 9 (the equivalent of letter (ط) should also be added which makes up the total 1233.

No. 72.

Shah Rustum Ali's Tomb.

In the compound of a mosque in Nanmohia, a quarter of the city about 3½ miles east of gola, is the tomb of the saint Shah Rustum Ali who died in 1230 A. H.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحیم

لا اله الا الله محمد رسول الله

بتاریخ بست و یکم شهر جمادی الاول سنه ۱۲۳۰ هجری المقدس روز سه شنبه گنهگار رستم علی وفات و از برکات روح پر فتوح حضرت شاه ابوالبرکات قدس سره درین مقام آرام و نجات یافت توقع از پارسایان و ناظران همین که بنظر شفقت جانب مزارم نگرند و دعاے مغفرت یاد آرند

متاب اے پارسا رو از گنهگار بہ بخشایندگی دروے نظر کن
اگر من نا جوانمردم بکردار تو برمن چون جوان مردان گذر کن

۱۲۳۰

اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمداً عبده ورسوله

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.

There is no God but God and Mohammad is his prophet.

On Tuesday the twenty first Jamadi I, 1230 of holy Hijri Rustum Ali the sinner died and from the favour of the conquering soul of Shah Abul Barkat, may his remains be sacred, took his rest and salvation here. From the pious men and the readers it is expected that they cast an affectionate look towards my tomb and pray for my pardon.

O pious man don't turn thy face from the sinner,
(But) look at him with forgiveness.
If I died unmanly in action,
Thou shouldst pass by me like a brave man.

1230.

I declare that verily there is no God but God and I declare that verily Mohammad is His servant and prophet.

No. 71.

Qilla mosque.

The Qilla mosque is in *mahalla* Qilla or the Fort [1] about 6¾ miles east of Gola. It was built in 1229 A.H. by some one who is said to be a religious person but whose name is not mentioned in the inscription.

Inscription. [2]

ذلک بیت الله

سنه ۱۲۲۹

مسجدے ساخت مرد دیندارے   از مقیمان   آستانه   حق

سال تعمیر از زدل جستم   دل بمن گفت هست خانه حق

سنه ۱۲۲۹

Translation.

"This is the house of God."

1229.

A religious person whose residence is the threshold of God [3] constructed this mosque.

I searched the date of construction from heart which said "This is the house of God."

1229.

[1] The quarter of the city known as Qilla or the Fort is near the fort built by Sher Shah which was the residence of the provincial governors during the Moghal times. The fort no longer exists now but its site is occupied by the beautiful mansion of Rai Bahadur Radha Krishen Jalan.

[2] ذلک بیت الله and هست خانه حق are chronograms which give 1229 as the date. Both mean "this is the house of God" but the former is Arabic and the latter in Persian.

[3] By "residence is the threshold of God" is meant that he is dead.

It was Thursday, the second of Shaban,
That she went from this transient world to the pleasant paradise.
Rizwan[1] said this for the date of her death,
" Bibi Man made her place a garden of Eden ".

Coombs and Co.,
Calcutta.

No. 69.

Shah Hassan Ali's tomb.

Shah Hassan Ali who was a saint is buried in Khawja Kalan, a quarter of city about 5½ miles east of gola. He died in 1224 A.H.

Inscription.

کرد آرام در ریاض بهشت شاه حسن علی که بود ولی
سال تاریخ رحلتش هاتف گفت مخدوم شاه حسن علي

۱۲۲۴

Translation.

Shah Hassan Ali who was a saint took this rest in the garden of paradise,
The latent informer said the chronogram of the date of his death " Shah Hassan Ali, the saint " 1224.

No. 70.

Dhoulpura Mosque.

The mosque known as Dhoulpura mosque is situated in Dhoulpura, a quarter of the city. It was built in 1227 A.H.

Inscription.

إن المساجد لله فلا تدعوا مع الله احداً
إجتمع المومنون وحده والباقي

سنه ۱۲۲۷ ه
۱۲۲۷

Translation.

Verily mosques are for God. Don't call any body equal to God. The believers were collected and they narrated about the unity of the Everlasting one.

1227 A. H.
1227

---

[1] Rizwan, the angel of paradise.

No. 68.

Bibi Man's tomb.

Bibi Man who was the mistress of Christopher Keating, senior Judge of the Provincial Court of Appeal, died in 1223 A. H. as the chronogram of the tombstone of her grave shows. The inscription on the mosque built by her has been described before (no. 59). Her tomb is in the mosque compound and the stone is affixed in the wall to the west of the tomb.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

غني چوں مان بی‌بي خلق را کرد از سخنهاے خود

بسے نعـــم البدل بنمود حاصل از خداے خود

پے تعـــزیت آل عبا مصروف بود از جان

همین آں در فردوس بکشاد از براے خود

زبس اعمال نیکو کشته رو صادر ازاں دریاے

غریق بحر غفران خدا سر تا بپاے خود

بروز پنجشنبه کاں ز شعبان بود برده در

برفت از دهر فاني در بهشت دلکشاے خود

پے تاریخ سال رحلتش زینگونه رضوان گفت

گلزار عدن بنمود بي بی مان جاے خود

COOMBS & Co.
Calcutta.

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement,
When Man Bibi made the people rich by her words,
She got its full recompense from God;
She was heartily engaged in mourning for Aal-i-aba. [1]
And this opened the gate of paradise for her.
With all good motives Sadir asked lamenting about her
Who was head to foot submerged in the sea of mercy.

---

[1] Fatma, the daughter of the prophet, Ali his son-in-law, Hassan and Hossain his grand sons are called Aal-i-aba.

Translation.

He is Forgiving and Everlasting,

Gholam Mohi-ud-din who by chance came to Azimabad wrote this.

His old native place was the city of Meerut but Barh is known as the place of his birth.

He begot a beautiful son after the desire of an age.

He fondly named him Jamal-ud-din which was followed by the word "Haidar".

Death became desirous of his face and it did not give a chance of life.

The strong and cold wind of death arose and the tree of his life fell head long from the feet.

A common chronogram was said "Ah Poor"

1219.

"May every one be his intercessor and recommender"

1219.

SECTION IV.

Inscriptions from 1807 to 1857.

No. 67.

Mirza Aziz's tomb.

In the grave yard to the north of Sher Shah's mosque in Dhaulpura, a quarter of the city is the tomb of one Mirza Aziz who died in 1223 A.H. The inscription consists of beautiful lines in Persian.

Inscription.

چو شد مرزا عزیز از امر تقدیر
مقامات عدم را جاده پیما
بر آمد از زبان خامه تاریخ
عزیزم رفت از مصر دنیا
۱۲۲۳ ھ

Translation.

When Mirza Aziz with fates' command,
Went to the realm of eternight.
This chronogram came out of the tongue of pen,
"My friend went away from the regions of the world."

1223 A.H.

Inscription.

هو الله الغنى الودود

۱۲۱۹

بمسجد بکن ذکر حق با ادب

۱۲۱۹

Translation.

" He is God, the Benevolent and the Loving."
1219.

" In mosque recite the name of God respectfully."
1219.

No. 66.

A child's tomb near Pir Damaria.

Near Pir Damaria mosque, which is very beautifully situated on a high plinth, by the side of the river are several tombs, one of which is of a child whose name was Jamal-ud-din Haidar. It has an inscription from which it appears that he died in 1219 A.H.

Inscription.

هوالغفور و الباقي

شده راقم غلام محی الدین
از قضا وارد عظیم آباد
شهر میرٹھ بود قدیم وطن
هست مشهور بارۂ میلاد
بعد عمری بآرزوے نزلک
پسر خوب روے صورت زاد
لفظ حیدر فزود نام اورا
به تمنا جمال دیں نهاد
مرت مشتاق صورتش گردیده
برمن فرصت حیات نداد
صرصر تند تیز اجل برخواست
نخل عمرش بسر زپا افتاد
عام تاریخ گفت آه غریب ۱۲۱۹
هر یک شافع و مشفع باد
۱۲۱۹

Inscription.

اضعف العباد حاجی منظور علي خان خواجه سراے سید هدایت علي خان بهادر اسد جنگ طبا طبائی در سنه یکهزار در صد و هفتده هجري تعمیر این مسجد نمود از جمیع المومنین امیدوار دعاے مغفرت است سنه ۱۲۱۷ ه

Translation.

The weakest of the slaves Haji Manzoor Ali Khan, eunuch of Saiyid Hedayet Ali Khan Bahadur Asad Jung Tabatabai[1] constructed this mosque in the year one thousand two hundred and seventeen Hijri. He expects from every believer a prayer for the pardon of his sins, 1217 A.H.

No. 64.

Madaroo's mosque.

Madaroo's mosque is in Danka-ki-Imli, a quarter of the city about four miles east of Gola. It was constructed by her in 1217 A.H.

Inscription.

تاریخ تعمیر مسجد مدارو مهترانی هفتم شوال سنه ۱۲۱۷ه

Translation.

The date of the construction of Madaroo Mehtarani's mosque seventh Shawwal 1217 A.H.

No. 65.

Kashmiri Bagh mosque.

The mosque in Kashmiri Bagh, a quarter of the city, has an inscription of two lines the first of which is in Arabic and the second in Persian. Both the lines are chronograms and gi e 1219 A.H. as the date.

---

[1] Saiyid Hedayet Ali Khan was the father of Saiyid Gholam Husain Khan, author of Syeurul Mutakhrin and he is referred at several places in that book. He was made pay master by Zain-ud-din Ahmad Khan (Volume I, page [illegible]6) and was subsequently appointed as deputy governor of Patna (Volume I, page 448). He was superseded by Rai Chintaman Das but when the Marhattas made havoc, "the citizens of Patna were very much alarmed and asked him to take the reins of government" (G. P. Sen—Patna during the last days of Muhammadans, Calcutta Review, Volume LXXIV, 1382).

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم اشهدان لااله الاالله وحده لاشریک له
و اشهد ان محمداً عبده و رسوله حافظ روشن محمد خان غفرالله له
سنه ۱۲۱۳ هجري

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement. I declare that verily there is no God but God, the One, who has no equal, and I declare that verily Mohammad is His servant and prophet. Hafiz Roshan Mohammad Khan, may God pardon him. 1213 Hijri.

No. 62.

Husaini Begam's m sque.

Husaini Begam's mosque is in D aulpura, about 6½ miles east of Gola. It was built in 1214 A.H.

Inscription.

بحسن طینت و صدق و صفا چو کرد بنا
حسیني بیگم ذی رتبه یک عبادگاه
ندا رسید ز هاتف بگوش هر مومن
ز دل نماز کن ایجا که هست بیت الله

Translation.

When with good disposition, truth and piety,
Husaini Begam of high position constructed the place of worship,
On the ears of every believer a voice reached from the latent informer,
" Pray here heartily for this is the house of God ".

No. 63.

Hajiganj mosque.

The beautiful mosque in mahalla Hajiganj, Patna City, which is known as Hajiganj mosque was built by Haji Manzoor Ali Khan in 1217 A.H.

---

[1] There is no date in figures in the inscription but زدل نماز کن ایجا که هست بیت‌الله gives 1214.

لا اله الله محمد رسول الله تعمير ساخته
بی بی مان في سنه ۱۲۱۲ هزار و دوصد و دوازده هجری

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement. God is Great, God is Great, there is no God but God, and God is Great, God is Great, and all praise is due to God. There is no God but God and Mohammad is his prophet. Constructed by Bibi Man in 1212 A.H. One thousand two hundred and twelve Hijri.

No. 60.

A tomb in Sultan Dumba's mosque.

In Moghalpura, a quarter of the city about 5½ miles from Gola, is a very large and old mosque without any inscription called Sultan Dumba's mosque. There is a tomb of a person whose name is not known, but it appears from the inscription that he died in 1212 A.H.

Inscription.

هوالکریم
بجنت جو بشتافت آن نیک تن
بسال وفاتش شدم رایے زن
زحوران شنیدم بتعظیم او
بیا و بیا باغبان عدن
سنه ۱۲۱۲

Translation.

He is benevolent.

When that good natured one went away to the paradise
I enquired of the date of his death.
I heard it from the *houris* who received him (and said)
" Come one, come on, the gardener of Eden "

1212 A.H.

No. 61.

Roshan Monammad Khan's tomb.

In the cemetery of Kashmiri Bagh near Moghalpura is the tomb of Roshan Mohammad Khan who died in 1213 A.H,

Nos. 57 and 58.

Mir Madarullah's mosque.

Mir Madarullah's mosque is in Dhoulpora, a quarter of the City. It has two inscriptions and was built by Mir Madarullah in 1211 A.H.

Inscription on *mihrab*.

افضل الذکر لااله الاالله محمد رسول الله

Translation.

The best of the sayings is "There is no God but God and Mohammad is his prophet".

Inscription on inner gate.

چون مدار المهام خانه دین میر عالی نسب مدار الله
مسجد نو باعتقاد آراست سال تاریخ شد ضرور آنگاه
از سرزهد گفت هاتف غیب شده موسوم کعبه دلخواه [1]
در عهد (۱۲۱۱) شاه عالم بادشاه

Translation.

When the minister of the house of religion,
Mir Madrullah of high lineage,
Constructed the new mosque out of faith,
The chronogram of its construction was necessary,
The latent informer with pious head said.
"It became known as a pleasant Kaaba".
In the reign of (1211) Emperor Shah Alam.

No. 59.

Keating's mosque.

The mosque known as Keating's mosque was built by Bibi Man, the mistress of Christopher Keating who was judge of Provincial Court of Appeal at Patna. It is on the main road near the Patna Civil Court within the compound of the house built by Christopher Keating. The house has recently under-gone much change. The mosque was built in 1212.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحیم الله اکبر الله اکبر لااله
الاالله و الله اکبر الله اکبر و لله الحمد

[1] شده موسوم کعبه دلخواه gives 1204 but accordingly to the hint ز = 7 is to be added to it.

No. 55.

Bulaki's mosque.

In Jaggis Chauraha, a quarter of the city about 5½ miles east of the Gola, is Bulaki's mosque which was built in 1208. A.H.

Inscription.

بلاقی داشت در دل این خیالے که سازد مسجدے اللہ واللہ

همادم گفت هاتف این زغیبش عبادت خانه اللہ اللہ [1]

۱۲۰۸ هجرالنبوی صلی‌الله علیه وسلم

Translation.

Bulaki had the idea in his heart,
That he might construct a mosque for God,
The latent informer said immediately,
" A house for the prayer to God."
1208 Hijri of the prophet may the blessing of God be on him and peace.

No. 56.

Shah Gholam Husain's mausoleum.

Shah Gholam Husain who was fifth in succession to Shah Arzani died in 1211 A.H. and was buried within the compound of mausoleum of that saint.

Inscription.

شاه حق آشنا غلام حسین حیف زین خاکداں محنت رفت

خواست عشقی چو سال رحلتش گفت هاتف بسوے جنت رفت

۱۲۱۱

Translation.

Shah Gholam Hussain the lover of God,
Alas! went away from this world of labour;
When Ishki wanted the date of his death,
The latent informer said " He went towards paradise "
1211.

---

1 عبادت خانه اللہ اللہ gives only 1205.

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.		
"May this place of worship be peopled for ever."		
The date when construction ended.	1208 Hijri.	In bayanat.

Inscription on outer gate.

لااله الا الله محمد رسول الله

در زمان سعید این مسجد که بناشد ز فضل ربانی
هاتف غیب سال تاریخش گفت بیت المقدس ثانی

فی سنه ۱۲۰۸ھ

Translation.

There is no God but God and Mohammad is His prophet.
At the auspicious time when the mosque
Was built by God's grace,
The latent informer said its date of construction,
" A second temple of Jerusalem ".

In 1208. A. H.

The founder was buried after his death in the compound of the mosque but no date is given on the inscription, nor any of the line is a chronogram.

Inscription.

پس از من بر سر خاکم چو آئی دعاے از براے من نمائی
زبان اهل دل تاثیر دارد بود شاید ز عصیانم رهائی

Translation.

When you come to my tomb after I have passed away,
Say prayer for me ;
The tongue of the pious has effect,
It may that I be absolved of my sins.

No. 47.

Uparka Bazar Mosque.

In Uparka Bazar, a quarter of the city near Gulzarbagh about 4½ miles east of Gola, is the Uparka Bazar mosque which was built in 1203 A.H.

Inscription.

لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ

سنہ ۱۲۰۳ھ

Translation.

There is no God but God and Mohammad is His prophet 1203 A.H.

Nos. 50–54.

Gholam Yehya's mosque.

The Mosque of Gholam Yehya[1] which is in Moghalpura, a quarter of the city, was built in 1207 A.H. It has several inscriptions.

Inscription above *mihrab*

مسجد گاہ غلام یحیی سنہ ۱۲۰۷ھ

Translation.

Gholam Yehya's place of prayer, 1207 A.H.

Inscription on inner gate.

مالل تواریخ غلام یحیی بانی مسجد

Translation.

Apt in history Gholam Yehya the founder of the Mosque.

Another inscription on inner gate.

بسم اللہ الرحمن الرحیم		
این عبادت گاہ ابداً آباد باد		
سال انجام	۱۲۰۸ الهجریه	در بنیات

1 This Gholam Yehya who in the inscription is described as "apt in history" may be the same learned man who is described in Sycural Mutakhrin as "prince of the learned of Azimabad, Mullah Gholam Yehya" (Volume I, Section VII, Page 13) and "learned and eminent men such as Gholam Yehya" (Volume I, Page 660).

Translation.

There is no God but God and Mohammad is His prophet.

When this mosque through the help of God,
Fortunately on an auspicious date
Was built through the agency of Shah Arzani,
It was written " A second Kaaba was constructed "
1202.

Constructor Makhmalunnissa Begam,
1202.

No. 48.

Nurpur Imambarah.

To the west of Mir Jumla's mosques in Nurpur, a quarter of the city about 7½ miles east of Gola, on the main road is a private cemetery on the gate of which is an inscription from which it appears that there was formerly an *imambarah* built in 1203 A.H. The imambarah building had also an inscription which is now buried in the debris.

Inscription on the gate.

میر فرزند علی مکان امام
ساخت مقبول خاص و عام شده
سال تاریخ از هاتف غیب
تعزیه خانه امام شده

Translation.

Mir Farzand Ali constructed the house of *imam*[1]
Which became popular with high and low.
The date of its construction by the latent informer,
Became " a house for the *tazia* of the *imam* ".
1203.

---

[1] Imam means a patriarch or a leader in religious matters. The reference here is to Imams Hassan and Husain, the grandsons of the prophet whose martyrdom is commemorated by mourning and making *tazias* or model of their tombs annually in the month of Moharram.

تمام از دولت فیروز جنگ است   که اورا ست این دولت خدا داد
رسیده از حضور اقدس او   برای سال تعمیرش چو ارشاد
نموده سجده شکرانه ساکن   بگفتا این عبادت خانه آباد
١٢٠٢

Translation.

May the construction of the beautiful mosque be auspicious to Begam Saheba.

It was finished through the labour and exertion of Haji Saadat. May he have full recompense.

This is all by the wealth of Ferozjung for he has got it as a God-send.

When an order was received from his honour for the chronogram of its construction,

Sakin prostrated in thanks giving, and said " May this house of prayer flourish "

1202.

No. 47.

Lodikatra mosque.

The mosque in Lodikatra, a quarter of the city about $5\frac{3}{4}$ miles east of Gola, was built by a lady called Makhmalunnissa Begam in 1202 A.H.=1788 A.D. Its inscription has fallen from the mosque and is kept with a local zamindar.

Inscription.

لااله الاالله محمد رسول الله

چون این مسجد بتائید الهی   بتاریخ همایون کلک تقدیر
طفیل شاه ارزانی بنا یافت   رقم زد کعبه ثانی بنا یافت
١٢٠٢

مسجد آرا مخمل النساء بیگم
١٢٠٢

Translation.

That [1]

the last of the prophets

Daughter of Syed Shah Mahfuz, alas!
Wife of Afzal Hosain of the holy religion
When she had passed the age of sixteen only
She went from this world to reside in heaven.
The parents and the husband of that Mary like lady,
All the three were full of grief.
Pity! it was only a year after her marriage
That she took her abode in the lap of the grave.
The day, date, month and the year of her death
When I enquired with intense sorrow,
On the headstone of her tomb was written fourteenth,
Friday and the month of Jamadi II

1201 A.H.

No. 46.

Fakhruddowla's mosque.

The mosque known as Fakhruddowla's mosque is situated on the main road about 6 miles east of Gola in Patna City. It was perhaps built by his wife who is called Begam Saheba in the inscription but her name is not mentioned. Fakhruddowla was Governor from 1725 to 1729. The mosque was built in 1202 A.H. = 1788 A. D. and has three domes.[2]

Inscription.[3]

به بیگم صاحبه فرخنده بانا   بنا کی مسجدے پاکیزه بنیاد
به سعی و کوشش حاجی سعادت   مرتب گشت اجرش بیشتر باد

[1] Some of the words of the inscription could not be read.

[2] Both Mr. James in Patna Gazetteer and Mr. R. L. Sinha in Pataliputra say that the mosque had originally 5 domes but its construction does not support the view.

[3] This inscription has also been given in Patna College Magazine (March 1913, page 96) but has been so wrongly recorded as to make it meaningless. It is mentioned as being from "an uninteresting mosque situated in Machrahatta" and no translation of the inscription has been given.

No. 44.

Dooly Ghat Mosque.[1]

The mosque called Dooly Ghat mosque is in Dooly Ghat, a quarter of the city. It was built in 1200 A. H. by Aminuddowla Azizul Mulk Ali Ibrahim Khan Bahadur Nasir Jung who was the "trustiest friend" of Mir Qasim and whose name appears in Syarul Mutakhrin at several places.[1]

Inscription.

هو الا حد

در سنه یکهزار در صد هجری امین الدوله عزیز الملک علی ابراهیم
خان بهادر نصیر جنگ تعمیر نمود -

Translation.

He is one.

In the year one thousand two hundred Hijri, Aminuddowla Azizul Mulk Ali Ibrahim Khan Bahadur Nasir Jung constructed this mosque.

No. 45.

A Lady's Tomb.

In the Muslim cemetery near Moghalpura, a quarter of the city about 5½ miles east of Gola, is an old tomb of a young lady who was daughter of Syed Shah Mahfuz. She died in 1201 A. H.

Inscription.

آن   آن ختم المرسلين
بنت سید شاه محفوظ آه   زوجه افضل حسین پاک دین
چون بعمر شانزده ساله گذشت   زین جهان گشت در جنت مکین
والدین وزوج آن مریم صفت   هر سه تن گشتندش اندوهگین
حیف چون یکسال رفت از ازدواج   گشت در آغوش مرقد جاگزین
روز و تاریخ ومه وسال وفات   چون طلب کردم برنجهاے حزین
بر سر قبرش رقم زد ده چهار   جمعه مه جمادی آخرین
سنه ۱۲۰۱ ھ

[1] Gholam Hossain Khan never lacks in praising him. He says "the illustrious and high born Khan, the beneficent, the munificent, the excellent and learned, the lord of one way of seeing (that is the sincere) Ali Ibrahim Khan, the Valiant, son to Doctor Mohammad Nassyr"—Syarul Mutakhrin, Volume I, section VII, page 12, English translation, 1789 edition.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

كل من عليها فان و يبقي وجه ربك ذوالجلال و الاكرام [1]

حكيم سيد احمد حسين ماه عيد يكشنبه　سنه ۱۱۹۸ ه

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.

All things are mortal and the face of God, the Powerful and Benevolent shall remain for ever. Hakim Syed Ahmad Husain. Month of Id, Sunday, 1198 A.H.

No. 43.

Mir Ibrahim's Tomb.

In the Shish Mahal mosque (Nos. 35—37) there is the tomb of Mir Ibrahim its founder who died in 1199 A. H.

Inscription.

ضمیمه جسم
جمل از قلم غلامی

در شب هفتم ماه شعبان
مرشد کامل ازین عهد که رفت
گفت تاریخ دل از روے جمل
بود قطب در عهد که رفت [2]

۱۱۹۹ در جمل یعنی ابجد

سال انتقال پیر و مرشدي حضرت میر ابراهیم سنه ۱۱۹۹ دربینات

Translation.

Addition of the body of Jamal. By Gholam ya

On the night of the seventh of Shaban
When the perfect guide passed away from this world,
The heart said the date according to *jamal*.
"He was a great saint of the time he died"

1199 in *jamal*, i.e., *abjad*.

The year of the death of religious monitor and preceptor Hazrat Mir Ibrahim 1199 A. H. in *bayanat*.[3]

---

[1] Holy Quran, Part 27, chapter LV entitled "the Merciful," verse 25.

[2] The chronogram بود قطب در عهد که رفت gives only 1109 but if we add the ل م according to the hint in margin still the total is 1179 which is short by 20.

[3] For *jamal* and *bayanat*, see introduction.

Abu Bakr, Umar, Usman and Haider.[1]
During the reign of Emperor Alam Shah
When the strayed persons of the world were shown the correct path,
It was one thousand one hundred ninety-one of the Hijri era
That the wisdom of the world founded this house of religion.

No. 41.

Danka-ki-Imli Mosque.

The mosque known as Danka-ki-Imli mosque is in Danka-ki-Imli, a quarter of the city about 5 miles east of Gola, and was built in 1196 A.H

Inscription.[2]

از کرم کریم گوید حیرت
۱۱۹۶ ھ
برمضان روز جمعه چون گلاب ھا کرد محراب رب الخلیق
چنیں ملہم غیب تاریخ گفت بود مسجد همچو بیت العتیق
سنه ۱۱۹۶ ھ

Translation.

"Hairat says this by the grace of the Benevolent"
1196 A. H.
In the month of Ramzan on a Friday like a rose
The arch of the house of Creator was constructed;
The latent voice said this chronogram,
"May this mosque be like the Old House".[3]
1196 A.H.

No. 42.

Hakim Syed Ahmad Hosain's Tomb.

Hakim Syed Ahmad Hosain's tomb is in Lodikatra about 6 miles east of Gola. He died in 1198 A.H.

---

[1] Ali the fourth Caliph his also called Haider.

[2] Both the lines از کرم کریم گوید حیرت and بود مسجد همچو بیت العتیق are chronograms and give 1195 as the date.

[3] Old House meaning Kaaba, the temple at Mecca.

Inscription,

۱۱۹۰	ذلک المسجد مسجدالحرام	در بئیات
سنه ۱۱۹۰ ھ	مسجد ابراهیم درجه دارد بکعبه ابراهیم	در ابجد و بئیات

Translation.

In Bayanat.	"This mosque is the Holy Mosque."	1190.
In Abjad and Bayanat.	"The mosque of Ibrahim has the position of Abraham's Kaaba."	1190

No. 40.

Gurhatta Bari Masjid (Mosque).

In Gurhatta, a quarter of the city about 5½ miles east of Gola, on the main road is the mosque known as Gurhatta Bari Masjid or the big mosque of Gurhatta which was built in 1191 A.H.

Inscription. [1]

بسم الله الرحمن الرحيم
لا اله الاالله محمد رسول الله
ابوبکر و عمر عثمان و حیدر
زمان سلطنت بادشاه عالم شاه
که گمرهان جهان را نموده راه یقین
هزار و صد و نود ویک زسال هجرت بود
که کرد راے جهان این بناے اخانه دین

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.

There is no God but God and Mohammad is his prophet.

---

[1] This inscription has also been described in Patna College Magazine (March 1913, page 93).

Translation.[1]

<table>
<tr><td>By Hazrat Haidar Baksh.</td><td>In the name of God the Merciful and Clement.</td><td>May his greatness prosper long.</td></tr>
<tr><td colspan="3">Our exalted Syed Ibrahim
Constructed this house of God which is pleasant to us.
I set this beautiful line
" For us the house of Abraham is the house of God."[2]</td></tr>
<tr><td>...</td><td>" This is the place of Abraham."</td><td>1190 A. H.</td></tr>
</table>

Inscription.[3]

كاتبه محمدعلي	بسم الله الرحمن الرحيم	قايله غلام يحيى
سنه ۱۱۹۰ ه	مسجد ابراهيم ازعنايت كريم آباد باد	درابجد

Translation.

Composed by Gholam Yehya.	In the name of God the Merciful and Clement.	Inscribed by Mohammad Ali.
In Abjad ...	" May the mosque of Ibrahim flourish by the bounty of God."	1190.

[1] The corners of the inscription are to be read together.

[2] The founder of this mosque was Ibrahim or Abraham and there is a pun on it as Abraham constructed the Kaaba, the temple at Mecca.

[3] It seems that the engraver began with the reverse side of the slab but left it, for the following inscription is on that side.

بسم الله الرحمن الرحيم
لااله الاالله محمد رسول الله

....

تاریخ عرش جالے رضوان بگوش جانم
گفتا که ر الفاطمه في جنت ما را

۱۱۸۹

Translation.

God is Great.

There is no God but God and Muhammad is His prophet.

....

The angel in the ear of my heart said the date of her reaching the paradise (thus)

" Verily Fatma is in paradise of rest. '

1189.

Nos. 37—39.

Shish Mahal mosque.

In Shish Mahal, a quarter of the city about 5½ miles east of Gola. there is a mosque called Shish Mahal mosque which was built by Syed Ibrahim in 1190 A.H. There are three inscriptions two of which have come out from the building and are kept there.

Inscription.[1]

از حیدر بخش	بسم الله الرحمن الرحيم	مد ظله العالي
سید ابراهیم عالی جاه ماه	کرد بیت الله بنا دلخواه ما	
مصرع دلخواه را کردم درست	بیت ابراهیم بیت الله ما	
دمه	ذالک مقام ابراهیم	سنه ۱۱۹۰ ه

[1] بیت ابراهیم بیت‌الله ما and ذلک مقام ابراهیم both are chronograms and give 1190 A. H. as the date. The word in the lower right-hand corner of the scription could not be read.

—O God ! be merciful to the founder
For this has been a cause of his happy return
(to the next world)—
The latent informer exclaimed the cry of its date,
" May it be the best of the mosques till the world lasts."
1187.

No. 35.

Mir Ashraf's Tomb.

The tomb of Mir Ashraf lies in the same compound in which his mosque is. The inscription of date of his death is on the gate of the enclosure where also is the inscription of that of Mir Afzal. Mir Ashraf died in 1189 A.H.

Inscription.

یا رحیم یا غفار یا کریم
چو افضل نسب سید نامور بدارالبقا شد زملک عدم
چوگل پیرهن چاك رضوان بگفت بیا میر اشرف میان ارم
۱۱۸۹

Translation.

O Merciful ! O, Forgiver ! O Benevolent !
When that famous Syed[1] of high extraction
Went to the permanent abode from the transient place,
The angel of paradise flower like torn of his garment said,
" Mir Ashraf come in the paradise."
1189.

No 36.

A lady's tomb in Mir Ashraf's compound.

To the south-west of the enclosure in which are the tombs of Mir Afzal and Mir Ashraf (nos. 29 and 33) there is a tomb of a lady on a high platform along with others which has an inscription from which it appears that she died in 1189.

Inscription.[2]

الله اکبر
لااله الا الله محمد رسول الله

....

[1] The descendants of the prophet are called Syeds.

[2] After لااله الاالله محمد رسول الله there are some lines in Arabic which could not be read.

jokes which were sometimes aimed at Mohammad Shah, which necessitated his exile from Delhi to Patna where he died in 1186 A.H.

Inscription.

کوکه خان آن بهار باغ سخن
سوے خلد برین زدنیا رفت
کرد مفتون چو فکر تاریخش
گفت هاتف سرور دلها رفت

۱۱۸۶ ھ

Translation.

Koka Khan that beauty of the garden of language
Went away from the world to paradise.
When Maftun thought of its chronogram
The latent informer said "The delight of hearts passed away"
1186 A.H.

No. 34.

Mir Ashraf's mosque.

The mosque of Mir Ashraf which was built in 1187 A.H. is in Chowk Shikarpore in the same compound in which he and his father lie buried. It is a very large and beautiful mosque with a big compound, in the middle of which is a reservoir and a fountain. The mosque is paved with Gaur tiles.

Inscription.

چون بعهده خجسته حامی دین شاه عالم بهادر باداد
مسجدے همچو کعبه اشرف معدن فیض خوش شده بنیاد
یا الهی بباریش رحمت کن که باعث شده بخیر معاد
بانگ تاریخ گفت هاتف غیب تا جهان اشرف المساجد باد

۱۱۸۷

Trans ation.

When it was the auspicious reign of the defender of the faith,
Shah Alam, the valiant and the just,
This mosque like the holy Kaaba
A fountain of benevolence was beautifully constructed,

Inscription.

هو الله اکبر جل جلاله وعم نواله وعظیم شانه واعلی برهانه
اللهم اغفر للمومنین والمومنات والمسلمین والمسلمات یا
مجیب الدعوات

در جنت کشاده رضوان گفت میر افضل بیا که منتظرم
۱۱۷۴

Translation.

God is Great, Majestic is His dignity, Common is His grace, Supreme is His proof.

Oh God pardon the faithful men and women and Muslim men and women! Oh the acceptor of prayers!

The angel of paradise opening its gate said.
" Come on Mir Afzal, I am waiting for you "

1174.

No. 32.

Shah Karimullah's Mausoleum.

Shah Karimullah who was fourth in succession of Shah Arzani died in the year 1185 A.H. and was buried in the compound of Shah Arzani where his mausoleum was erected over his tomb.

Inscription.

مالک ملک فقر شاهنشاه زده در کشور بقا خرگاه
گفت تاریخ رحلتش تقدیر یافت قرب نبی کریم الله
سنه ۱۱۸۵

Translation.

The lord of the province of saintliness, rather its emperor,
Pitched his camp in the country of eternity.
Fate said his date of death,
" Karimullah found proximity to the prophet."

1185.

No. 33.

..oka Khan's Tomb.

To the east of the mosque of Sher Shah in Dhaulpora about 6½ miles east of Gola is the tomb of Ashraf Ali Khan *alias* Koka Khan who was the foster brother of Emperor Mohammad Shah. Koka Khan was famous for his witty sayings and pointed

Because his name was Reza [1] and he was his chosen servant.
When the eighth of the twelve (*imams*) became his leader and guide,
The angel of paradise cried " You have become holy. Enter in it ".[2]

No. 31.

Mir Afzal's Tomb.

The burying ground of Mir Afzal which is now known as the burying ground of Mir Ashraf [3] is at Chowk Shikarpore, Patna City, about 6¼ miles east of Gola. Mir Afzal who was probably father [4] of Mir Ashraf, died in 1174 A.H. His tomb along with that of his son is within an enclosure over the entrance of which is the inscription. Mir Afzal who was a Kashmirian merchant was buried at the feet of the saint Shah Rustam Ali who also lies burried in the said enclosure. "It was for this following reason: The Merchant, who intended to embrace the same kind of life, and was attached to him personally, got him buried in that spot which he had bought for his own burial; and on his deathbed he ordered that himself should be buried at his feet ".[5]

---

[1] Ali Reza was the eighth imam.

[2] The chronogram طبتم فاد خلو gives 1173 as the date of his death.

[3] Mohammad Hasibullah's Tazkira-tus-Salhin, page 10.

[4] In spite of best efforts I could not learn from anybody the relationship of Mir Afzal with Mir Ashraf but there are certain facts which indicate that Mir Afzal was the father of Mir Ashraf. Both of them have the affix Mir and both of them lie buried within the same inclosure. The burying ground of the father which was once known after him, is after the burial of his son known after him (the son). The inscription of the date of death of Mir Ashraf (no. 35) has the words افضل نسب which means " of high extraction ", as well as " of the extraction of Afzal ". Mr. James while describing the river front at Patna in 1812 thinks that in Buchanan's map the word Afzal has been used by mistake for Ashraf and the diara surveyor correctly gives Ashraf (J. B. O. R. S., Volume XI, part I, page 88). It seems that in Buchanan's map the name of the father has been given while in surveyor's that of the son. Mir Afzal who was a big trader of his time was not less known than his son who was a gomasta of the company. But this Mir Afzal is a distinct person from Mir Afzal whose tomb is in Golakpur and after whom the name of a quarter of Patna, viz., Afzalpur, is derived.

[5] Syarul Mutakhrin, Volume I, pages 697-698. (English translation, 1789 edition)

Junge "[1]. He was the minister of Shah Alam and under the modest title of the steward of the household was his most trusted counsellor. After the battle of Baxar he assisted in the negotiations with the English which led to the grant of Diwani in August 1765.[2] He died in 1173 A. H. as the chronogram indicates at Benares but was burried here.[3] His family [4] was once one of the greatest land owners in the district but although little is now left it still enjoys high social standing in Patna .[5]

Inscription.

چونکه نواب منیرالدوله گردون وقار

داعي حق را اجابت گفت و پنهان کرد رو

خلق عالم هرطرف درماتم آن ذیجناب

دائما در سوگواری و فغان جستجو

بر در جنت معینش شد امام هشتمین

چونکه نامش بد رضا و هم غلام خاص او

ثامن اثناي عشر چوشد معین و رهبرش

داد رضوان بهشت آواز طبتم فاد خلوا

Translation.

As Nawab Moniruddowla of lofty position
Responded to the call of God and hid his face,
The people of the world lamented for him everywhere,
Always mourning and full of grief.
The eighth imam became his guide at the door of the paradise.

---

[1] Syerul Mutakhrin, volume 2, page 110.

[2] H. Beveridges' "The City of Patna" (Calcutta Review, Volume LXXVI. 1883.)

[3] After his death the title of Nawab Moniruddowla was given to his son and from a return, dated the 20th April 1782, it appears that his son was given Ba wank, Rampur, Shahjahanpore, out of estates confiscated from Raja Kyallirem—J. Reginald Hand, Early English Administration of Bihar, 1781—1785, page 82.

[4] It is now called the Bhiknapahari family.

[5] Patna Gazetteer (J.F.W. James), page 138.

Translation.

He died on Wednesday the nineteenth Rajab.

The latent informer said " Basant the saint of God and of high parentage "

1158.

No. 29.

Rahimunnissa's Tomb.

There is a tomb of a Muslim lady in the compound of Patna City charitable dispensary. The lady, whose name was Rahimunnissa and who was the daughter of Muhammad Yusuf Meshedi died in 1160 A.H.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

تاریخ وفات مرحومه مسماة رحیم النسا بنت آقا محمد یوسف
مشهدي یازدهم شهر محرالحرام سنه ۱۱۶۰ اللهم اغفرلها وتجاوز عنها
سیاتها و احشرها مع النبی وعلي وفاطمه والحسن و الحسین
وجمیع الایمة المعصومین صلواة الله وسلامه علیهم اجمعین

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.

Date of the death of Musammat Rahimunnissa, deceased—the daughter of master Muhammad Yusuf Meshedi—11th of the month of holy Moharram 1160. Oh God forgive her, and pardon her sins and congregate her on the day of resurrection with the prophet, Ali, Fatma, Hassan and Hosain and all the innocent *imams*. May the blessings of God and peace be on all of them!

SECTION III.

Inscriptions from 1757 to 1807 A. D.

No. 30.

Moniruddowla's tomb.

Nawab Moniruddowla's tomb is in the house of Nawab Vilayet Ali Khan in mahalla Guzri, Patna City. Moniruddowla's real name as the inscription indicates was Gholam Reza and his full title was " Moniruddowla Reza Cooli Khan Nadyr

Translation.

The servant of praiseworthy Nawab Fakhruddowla.
Who has got Hasan in conjunction with Ali in his name [1]
Constructed this court of justice, a fine place for adminitration of justice;
Its date of construction is one thousand, one hundred and forty-two.

No. 27.

Malsalami Mosque.

The mosque near the Malsalami police-station on the main road about seven miles east of Gola was built in 1150 A.H. by one Abdur Rahman Sajjad.

Inscription.

از فضل‌الله عبدالرحمان سجاد
با صدق و صفا نمود مسجدے بنیاد
باقر بدعا بگفت تاریخ
این خانۂ دیں همیشه آباد

Translation.

By God's grace Abdur Rahman Sajjad,
Founded this mosque with truth and piety;
Baqar praying, said this chronogram,
"May this house of religion be always populous." 1150.

No. 28.

Shah Basant's mausoleum.

The mausoleum of Shah Basant, who was third in succession to Shah Arzani, is within the compound of Shah Arzani at *mahalla* Dargah about two miles east of Gola. He died in 1158 A.H.

Inscription.

کرد رحلت چارشنبه نوزده ماه رجب
گفت هاتف عارف یزدان بسنت عالي نسب
۱۱۵۸

[1] Hassan was the grandson of the prophet and Ali his father, was the prophet's son-in-law.

Translation.

He, who was illustrious in the life of resignation
Passed away to the garden of paradise,
Shah Shahbaz the perfect holy man
Who was daring in the path of acquiescence to God.
The bird of the lote tree [1] said this chronogram
" He was a falcon [2] soaring in heaven "
1126.

No. 26.

Hssaan Ali's court of justice.

The court of justice built by Jafar who was in the service of Daud Khan Qureshi has been already noticed (no. 19). It was either repaired or rebuilt by Hassan Ali who was in service of Nawab Fakhruddowla, governor from 1725 to 1729 A.D. No trace of the building now remains and its inscription which is dated 1142 A.H. is at present affixed in one of the tombs in the Khwja Kalan police-station where the court of justice stood. The tombs are said to be of the kazis or judges of the court. This is the stone referred by Buchanan Hamilton in his report [3] while describing how soon even traces of large buildings in India are obliterated.

Inscription.

بندہ نواب فخرالدولہ ممدوح زماں
آنکہ در نامش حسن را با علي باشد قرآں
ساخت دار العدل جالینکو مناسب داد
در ہزار و یکصد و چہل و دو بناکرد [4] تاریخ آں

---

[1] By سدرہ which means lote tree is meant سدرۃ المنتہي the lote tree in the heaven.

[2] There is a pun on the word Shahbaz which means a falcon and which was also the name of the saint.

[3] Buchanan's report, J.B.O.R.S., Vol. VIII, parts III and IV, page 357, Mr. R. L. Sinha in his nice articles on the buildings of Patna in " Pataliputra ", page 42, wrongly mentions that the stone was found near the Chehelstoon. The mistake seems to have arisen by the fact that Buchanan cited both Chehelstoon and this court of justice as examples of buildings soon forgotten in India and a police-station also stands near the site of the Chehelstoon.

[4] بناکرد is not clear in the Inscription.

SECTION II.

Inscriptions from 1707 to 1757 A. D.

No. 24.

The mausoleum of Shah Kaley.

The mausoleum of Shah Kaley is near Pachim Darwaza or the western gate of the city about 5 miles east of Gola. Shah Kaley died in 1124 A.H.

Inscription. [1]

شاہ کالے حبیب یزدانی بافت نعمت زمرتضی ثانی
گفت رزاق سال تاریخش کو محب اتیت ربانی
۱۱۲۴

Translation.

Shah Kaley the friend of God,
Got the wealth (of saintliness) from Murtuza, the second [2].
Razzak said the date of his death (thus),
" Where is the divine loving ascetic "
1124.

No. 25.

The mausoleum of Shah Shahbaz.

Within the coumpound of the mausoleum of Shah Arzani is the mausoleum of Shah Shahbaz who was second in succession to him. He died in 1126 A.H.

Inscription.

کرد رحلت بسوے باغ جنان
آنکه در فقر بود ممتازے
شاہ شہباز عارف کامل
که براہ رضاست جانبازے
طایرے سدرہ گفت این تاریخ
بود شہباز عرش پروازے [3]
۱۱۲۶

---

[1] This inscription has also been described in Patna College Magazine (March 1913) but the Sanskrit word "atit" meaning " ascetic " which occurs in the last line has been taken to be " bait " and has been translated as " house ".

[2] Ali, the son-in-law of the prophet is known as Murtuza. Shah Kaley was perhaps a disciple of some saint whose name was Murtuza who is styled here as Murtuza II.

[3] بود شہباز عرش پروازے gives 1123 and not 1126 which is the date of his death, perhaps there is mistake of calculation.

the main road which is generally known as Pather-ki-masjid or the stone mosque was built in 1100 A.H.=1688-89 A.D. by Buzurg Umed Khan who was Governor from 1685 to 1693 A.D. It is partly built of stone and stands on a high plinth and it seems that it was surrounded by garden. The people of the locality say that formerly the road passed near the mosque but has been diverted after the mutiny.

Inscription.

تاج و العشمت بزرگ امید خان
آن که بر خلق جہان کرمش عمیم
چون ز ہاتف خواست تاریخش نجف
زود گفتا باد بیت المستقیم
۱۱۰۰

Translation.

Buzurg Umed Khan, (is) the Crown and the dignity
Whose generosity is common for all the people of the world.
When Najaf wanted the date of its construction from the latent informer,
He said immediately " May it be an erect house "
1100.

No. 23.
Sultangunj Mosque.

The mosque at Sultanguanj on the main róad about 2 miles and 6 furlongs east of Gola was built by Tajo, the wife of Shaikh Badri. About 40 years ago there was some litigation about it and some words and the date in the inscription were mutilated but the last line which is a chronogram gives 1114 A.H= 1701 A.D. as the date.

Inscription.

شیخ بدری زنش تاجو نام
خداست * * * *
مسجدے ساخت ہمچو بیت‌حرام
گفت ہاتف ز غیب این پیغام

Translation.

Shaikh Badri whose wife's name is Tajo
God is, * * *
She constructed this house like the sacred House.
The latent informer mysteriously said "this message ".[1]

[1] این پیغام which means " this message " gives the date 1114.

Translation.

The fortunate Emperor out of belief constructed this mosque for the delight of God.

The wisdom with much supplication said its chronogram "He showed a Kaaba for necessities in this world"

Under the superintendence of Anis Ahmad.

In the middle of the inscription—

Founder Aurangzebe, Alamgir, may God perpetuate his kingdom.

No. 21.

Ambar's Mosque.[1]

The mosque built by Khwaja Ambar, *nazir* of Shaista Khan, the Governor of Bihar,[1] is on the main road about 6½ miles east of Gola. This beautiful mosque was built in 1100 A.H.[2]=1688-89 A.D.

Inscription.

در زمان پادشاه دین پناه
شاه عالمگیر غازی ذو الکرم
خواجه عنبر ناظر شایسته خان
مسجد نو ساخت چون بیت الحرم
مظہر الحق سال تاریخ بنایش
معدن فیض الہی زد رقم
۱۱۰۰

Translation.

In the time of the Emperor who was bulwark of religion
Shah Alamgir, the victorious and generous,
Khwaja Amber, the nazir of Shaista Khan
Built this new mosque like the Holy House.
For its date of construction Mazharul Haque
Wrote "A mine for the bounty of God"

1100.

No. 22.

Buzurg Umed Khan's Mosque.

The large and beautiful mosque in Nagla, a quarter of the city of Patna about 7¼ miles east of Gola, a little to the south of

---

[1] The inscription from this mosque is also described in an article in Patna College Magazine for March 1913 at page 94.

[2] Mr. R. L. Sinha (Pataliputra, page 43) gives 1108 A.H.

[3] i.e., Kaaba, the temple at Mecca.

No. 19.
Court of Justice (Jafar's).

There was a court of justice where the Khwaja Kalan police-station now stands. It was built by Jafar who was in the service of Daud Khan as the inscription which is now in the building of the police-station shows. Daud Khan Kuraishi was governor from 1660 to 1665 A.D. The court of justice was built in 1074 A.H.=1664 A.D. as the inscription indicates. It was rebuilt in the time of Nawab Fakhruddowla by Hasan Ali the inscription of which is also recorded (no. 26).

Inscription.

بہر عدل و داد مظلومان ز دست ظالمان
ساخت دارالعدل جعفر بندہ داؤد خان
سنہ ۱۰۷۴

Translation.

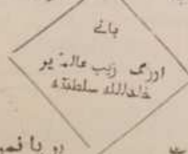
For justice and equity of the oppressed against the hands of the oppressor,
Jafar the servant of Daud Khan built this court of justice.
1074.

No. 20.
Roza Mosque.

The mosque called the Roza mosque is situated near the *roza* or tombs of two saints Taj and Mangan. Aurangzebe built this mosque in 1078 A.H.=1668 A.D. There are many tombs near the mosque and there is an *akhara* attached to it. The inscription on stone outside the hall is chronogram and gives 1078 A.H. as the date of construction. There are also some verses from the Quran above *mihrab* on the masonry but without any date.

Inscription on stone.

آراست مسجد از پئے خشنودگی خدا ‏ از راہ اعتقاد شہنشاہ کامران



تاریخ او خرد بہزاران نیاز گفت ‏ بر پا نمود کعبہ حاجات درجہان

باہتمام انیس احمد

The founder of this great mosque is the door keeper of Nawab Abdullah Khan. Inscribed by Mohammad Moqim, son of Mir Syed Abdur Rasul.[1] 1070 Hijri.

Inscription on masonry.

قل هو الله احد الله الصمد لم يلد ولم يولد ولم يكله كفواً احد [2]

Translation.

Say, God is one God; the eternal God, he begetteth not, neither is he begotten: and there is not any one like unto him.[3]

No. 18.

Dhai Kangura Mosque.

The Dhai Kangura mosque or the mosque having two turrets and a half is so named because it has a stone slab in the roof resembling two and a half turrets. It is in Dhaulpora, a quarter of Patna City about 6¼ miles south-east of Gola. It was built in 1072 A.H. by one Mirza Noori.

Inscription.

ساخت مسجد مرزا نوري آنچنان
وصف او شد در جهان افسانه
قدسیان شادند از تاریخ آن
بهر ایزد چون بنا شد خانه
سنه هزار هفتاد و دو

Translation.

Mirza Noori built such a mosque
That it became famous throughout the world;
The pious are happy from that date
When the house was built for God.[4]
The year one thousand and seventy-two.

---

[1] Abdur Rasul inscribed no. 12 in Haji Chand's mosque.

[2] Holy Quran Chapter CXII, entitled "The declaration of God's unity".

[3] This is G. Sale's translation.

[4] The part of the line چون بنا شد خانه gives the date 1072

Inscription.

عاشق مولا سجادل شاه شاه دیں پناه ٭
چوں ازیں دار فنا شد جانب دارالسلام
سال تاریخ وفات آن سریر آرائے فقر ٭
گفت دل جا یافته بر مسند وصل امام
درسنه ۱۰۶۴ ھ

Translation.

When Shah Sajawal, the lover of God, and the royal bulwark of religion

Passed away from this transient world to the abode of peace,

The heart said the date of the death of that king of the saints,

" He found place on the chair of the society of Imam."

In 1064 A.H.

Nos. 16 & 17.

Dargah mosque.

The large mosque which is south-east of the dargah of Shah Arzani (no. 6) was built in 1070 A.H. by the door keeper of Nawab Abdullah Khan, who was governor from 1637 to 1639 A.D. The inscription which is very beautiful is on a large slab of black stone and is in Arabic. It does not give the name of the founder but says that the mosque was built by the door keeper of Abdullah Khan. It is possible that the founder might have been in the service of the governor and out of humility he styled himself as the door keeper. There is another inscription on the masonry inside the hall.

Inscription on stone.

وان المساجد لله
فلا تدعو مع الله احد
بانی هذالمسجدالعالی دربان نواب عبدالله خانی کتبه
محمد مقیم ولد میر سید عبدالرسول سنه ۱۰۷۰ هجری

Translation.

Verily mosques are for God,

Do not call any body equal to God.

Translation.

....one thousand and fifty-nine
Had passed that sorrow increased in the heart.....................
He was courage from top to toe
Mohammad... ... .transitory
He soon passed to the dominion of eternity.
I enquired of wisdom about the date of the death,
Wisdom said that its date "was from sorrow".
Composed by Lutfullah. Inscribed by poor Mohiuddin.

No. 14.
Doondi Bazar Mosque.

The mosque known as the Doondi Bazar mosque called after the quarter of the city of Patna where it is situated is about a furlong west of the Mangle's Tank in Patna City. It is a unique mosque in the city as it has only one dome. It was built in 1061 A.H.=1651 A.D.

Inscription.

ساخت خوشنود از پے خوشنودی حق مسجدے
کز شرف کرو بیاں رو بند صحنش را ز بال
بہر تاریخ بناے او خرد گفت از ادب
قبلہ ارباب طاعت کعبہ اصحاب حال

سنہ ١٠٦١ھ

Translation.

Such a mosque was built for the delight of God
That the angels for their honour sweep its floor by (the lock of) their hair.
The wisdom said respectfully for its date of construction,
" An altar for the worshippers, a temple for the apostles of ecstasy,"

1061 A. H.

No. 15.
Shah Sajawal's mausoleum.

Shah Sajawal was the successor of the saint Shah Arzani the inscription on whose mausoleum has already been noticed (no. 6). Shah Sajawal died in 1064 A.H =1653-1654 A.D. and his mausoleum is in the compound of Shah Arzani.

Translation.

God, Mohammad, Abu Bakr, Umar, Usman, Ali.	There is no God but God and Mohammad is His prophet.	God, Mohammad, Abu Bakr, Umar, Usman, Ali.

Whoever in this world became generous and wisely made gift from beneficence and liberality got eternal life. For this reason Haji Chand founded this mosque that his mark may be remembered.	When for the chronogram of its date of construction Manvi was making calculations bending himself like a bow, After all he found one increasing from "May this house of goodness be ever populous".

The founder of this great mosque is Haji Chand Shaista Khani. Inscribed by Abdur Rasul Hasani.[1] One thousand fifty-six 1056.

No. 13.

A tombstone in a Shaikh Rajab's Mosque.

In Shaikh Rajab's mosque which is situated in *mahalla* Fasahat-ka-maidan about one half mile west of Patna City school, there is an old tombstone dating 1059 A.H.=1649 A.D., which was probably brought from the grave yard of the Kazis which is near-by. When Shaikh Rajab built the mosque about 150 years ago he thought that an inscription was necessary for it, as many other mosques had, but being an illiterate man did not realise its significance and instead of having one describing the construction he brought it from one of the graves and affixed it in the mosque. When the mosque was extended and rebuilt about thirty years ago the inscription which was out of place was removed and it is kept there ever since. The mason in removing it has injured it very much and many of the words are missing.

Inscription.

یکہزار و پنج و نه - گذشته بود کین غم بهر دل افزود
- سراسر همت و سرتا قدم بود
محمد ذاتی - بملک جاودانی رفت او زود
بجستم از خود سال وفاتش - خرد گفتا که تاریخش زغم برد
قایله لطف الله کتبه غریب محی الدین

[1] Abdur Rasul's son Mohammad Moqim engraved inscription no. 16 which is also large and beautiful.

Translation.

The wise Beg Mohammad constructed
This beautiful place of worship in the city of Patna.
The architect wisdom said its date,
" A beautiful and splendid mosque was built "

1056.

No. 12.

Haji Chand's mosque.

The mosque of Haji Chand is in Colonelgunj about four miles east of Gola. It is cut off from the main road by a few shops. The mosque which is itself beautiful and large has got a fine inscription on a big slab of black stone. Haji Chand is mentioned in it as Shaista Khani but how he was related to him is not made out. Shaista Khan was Governor from 1639 to 1648 A.D. The mosque was built in 1056 A.H. = 1646 A.D.

Inscription.

محمد الله ابوبكر عمر عثمان علي	لا اله الا الله محمد رسول الله	محمد الله ابوبكر عمر عثمان علي

معنوي از پے تاریخ بنایش	يافته عمر ابد هراه بدهر داد
چون کمان خم شده میکرد اعداد *	جود وكرم از دانش داد *
آخرش امر یکے افزون یافت	زين سبب كرد بنا حاجی چاند
بقعه خیر همی باد آباد [1] *	مسجدے تا اثرش ماند یاد *

بانی المسجد العالی حاجی چاند، شایسته خانی کتبه
عبد الرسول الحسنی الف وخمسین و ستة سنة ۱۰۵۶

[1] بقیه خیر همی باد اباد gives 1057 but there is a hint in the previous line that it is greater by one.

Inscription.

صفی، خدا سیفخاں آنکہ توفیق

....

....

بگفتا کہ مجموعہ خیر دنیا

....

کتبہ محمد علی کشمیری غفر اللہ ذنوبہ بیر کار این عمارت

Translation.

Saif Khan, the friend of God, by whose grace * *

* * * *

* * * *

He said " A collection of wordly benefactions " [1] * *

* * * * * * *

written by Mohammad Ali Kashmiri. May God forgive his sins ! The decorator of this building * * [2]

No. 11

Mohammad Beg's inscription in Begu Hajjam's mosque

Nazir Khan's inscription in the Begu Hajjam's mosque has already been described above (no. 1). The mosque has another inscription of the year 1056 A.H.=1646 A.D. by Mohammad Beg. who repaired it. The inscription unfortunately instead of indicating the repairs shows that the mosque itself was built by him.

Inscription.

ساخته بیگ محمد نیک رائے

معبد در شہر پٹنہ خوش نمائے

گفت معمار خرد تاریخ آن

مسجد زیبا و روشن شد بنائے

سنہ ۱۰۵۴

---

[1] مجموعہ خیر دنیا is the chronogram which gives 1039 as the date of construction.

[2] It seems that there were some more lines in 1913 which do not exist now. In an article on the mosques of Patna in the Patna College Magazine (March 1913) the following lines of the inscription are given :—

Safi-i-Khudá Saif Khan ánke tawfiq * * * —saun shud wa sákhtash (?) Kashe ánke (?) Bamulk-i-Bihar az imarat-i-áli, Barah-i-Khuda sákht chande * * * Namáz-i-tahajjud guzarand shama, Ke guftah (?) .... inja .... Begufta ke majmua-i-khair duniá Kutabah-i-Mohammad Ali Kashmiri, ghafarallah zunubuhu... wa ... sarkar (?) i-in-imarat.

Translation.

Thank God that this matchless and beautiful building.
Was constructed in the reign of Shah Jahan Sahebkaran II[1]
Emperor Shahabuddin Mohammad[2] a king like Jam[3] in dignity,
To whose orders even land and sky have become obedient.
Saif Khan, that wise ruler, with a magnificent heart,
By God's grace became the founder of this heaven-like structure.

Its elegance is more life increasing than the breeze of the garden of paradise,

Its space is more exhilirating than the eternal life.

When Atai wanted the date of construction, the heart said,

" May the foundation of the Idgah of Saif Khan remain for ever. "

No. 10.

Madrasa mosque.

The Madrasa mosque is situated by the Ganges about 6½ miles east of the Gola. This beautiful and large mosque and the madrasa (school) building near it were built in 103 A.H. = 1629-30 A.D. by Saif Khan who built the Idgah the inscription which is recorded above (no. 9). Its beautiful situation " made the place so remarkable for its coolness, retirement, salubrity and umbrage that it became the general resort of the best company[4]". There was richly decorated writing inside the mosque running along the walls which has now been obliterated, the only lines left are the chronogram which gives the date of construction as 1039 A.H. and those which show the names of the founder of the building and the scribe.

---

[1] Sahebkaran means the lord of conjuction i.e., one born under peculiarly favourable aspect of the planets, as was the case with Timurlane who is called as such by his biographers. Timurlane being the first Sahebkaran, Shah Jahan is styled as the second.

[2] Shahabuddin Mohammad was the real name of Shah Jahan. He assumed the latter name after his accession to the throne.

[3] Name of the ancient king of Persia famous for pomp and dignity.

[4] Syeirul Mutaqrin, Vol. 1, page 489 (English Translation, 1789 Edition).

Kai Khusro[1] of his time, and Jamshed[2] of his Kingdom (who)
On the royal throne (is) like the world conquering Alexander
Constructed this choice building under his supervision and which is
As firm as a rock in the pursuit of the precepts of Mohammad.
He demolished the fort and temple of Majhowli
And from the stone and wood of the temple
Was constructed this beautiful building.
I asked about the date of construction from the old wisdom,
Which said "Say, It is a place to walk to paradise"
1036 A.H.

No. 9.

Idgah of Saif Khan.

Saif Khan who was Governor of Bihar from 1621—1631 built this spacious idgah which is situated about 4½ miles east of Gola between the Main Road and Inglis Road. His real name was Mirza Safi and he had married Malika Banu, the eldest sister of Mumtaz Mahal, the lady of the Taj. He built this idgah in 1038 A.H.=1628-29 A. D. as the chronogram in the inscription shows. He also built the *madrasah* and the large mosque near it the inscription of which has also been recorded.[3]

Inscription.

شکر ایزد کاین بناے دلکشا و بے نظیر
شد بعہد ثانی صاحب قرآن شاہجہان
شاہ جم حشمت شہاب‌الدین محمد بادشاہ
آنکہ حکمش را مسخر شد زمین و آسمان
سیف خان آن داور دانا دل والا شکوہ
شد بتوفیق الہی بانی این عرش مکان
زینت از جان فزا تر از ہواے باغ خلد
وسعت از دلکشا تر از حیات جاودان
چون عطائی خواست تاریخ بنایش گفت دل
دائما بادا بناے عیدگاہ سیف خان

[1] and [2] Kai Khusro and Jamshed were two famous Kings of Persia.
[3] Vide no. 10, *infra*.

Translation.

I went to the threshold for the date,
I said "It is the holy door of pure truth"
1052.

No. 8.

Stone Mosque. [1]

The Pathar-ki-masjid or the stone mosque which is on the main road three miles east of Gola was built by Prince Parvez. The date on the inscription is 1036 A.H.=1626 A.D. but as Prince Parvez died on 6th Safar 1035 A.H. at Burhanpore it seems that although he began the construction it was finished after his death. Prince Parvez was the son of Emperor Jahangir and was Governor of Bihar from 1621 to 1624. The materials for the mosque were brought from Majhowli in Gorakhpur district.

Inscription.

لا اله الا الله محمد رسول الله

در عهد نور چشم جهانگیر بادشاه
پرویز شاه عادل و باذل بعقل راے
کیخسرو زمانه و جمشید سلطنت
بر تخت مملکت چو سکندر جهان کشاے
کرد این بناے خاص بنظر خویشگی که هست
در پیروی شرع محمد چو کرد پاے
مسمار ساخت قلعه مجهولی و بتکده
وز سنگ و چوب بتکده شد این نکو بناے
کردم سوال سال بنایش ز پیر عقل
گفتا بگو خرامی خیر المقام جاے
سنه ۱۰۳۶

Translation.

There is no God but God and Mohammad is His prophet.
In the reign of Emperor Jahangir, the light of the eye,
The just, generous, wise and intelligent Parvez Shah,

---

[1] The inscription from this mosque has also been given in an article on mosques of Patna in Patna College Magazine (March 1913, page 95) but some words are wrongly recorded and no translation has been given

Translation.

O, true believers, when you are called to prayer on the day of assembly, hasten to the commemoration of God, and leave merchandizing. This will be better for you if ye knew it. And when prayer is ended then disperse yourselves through the land as ye list, and seek gain of the liberality of God.[1] 1025 A.H.

Below it is the following inscription :—

فناداه الملائكة وهو قائم يصلى فى المحراب [2]

Translation.

The angel called them when they were praying in the *mihrab.*

Nos. 6 and 7.

Mausoleum of Shah Arzani.

The mausoleum of Shah Arzani, who is held in great reverence by both Hindus and Muhammadans, is situated in mohalla Dargah, south of Sultangunge, about two miles east of Gola. Shah Arzani died in 1028 A.H. = 1619 A.D.

Inscription.

رفت قطب زمان به آسانی * بریاض بهشت ارزانی
سال فوتش زفیض ملهم غیب * گفت دل شاد جنت ارزانی
سنه ۱۰۲۸

Translation.

The universal saint passed away peacefully
To the effulgent garden of paradise.
With the favour of mysterious inspiration about the date of his death
The heart said " Beautiful paradise of Arzani."
1028

At the outer gate of the mausoleum is the following inscription :—

بهر تاریخ درگهش رفتم * پاک درگاه خاص حق گفتم
سنه ۱۰۵۲

---

[1] G. Sale's translation.

[2] This is from the Holy Quran, Part III, Chapter III, entitled Family of Imran, part of verse 9.

Nos. 3, 4, 5.

Mirza Masum's mosque.

The mosque of Mirza Masum is situated on the main road at Pachchim Darwaza at Patna City about five miles east of Gola.[1] It is a large mosque built on a high plinth with shops to the north of it. The gate of the mosque has six carved blocks of stones which seem to belong to Gaur. The chronogram on the stone inscription gives 1023 A.H. (1614 A.D.) as the date of the construction but inside the hall there are two inscriptions in Arabic one of which is followed by the date 1025 A.H. It is possible that the work inside the hall was finished two years later.

The inscription on stone.[2]

بدور شاه جهانگیر میرزا معصوم
بساخت مسجد جامع بفیض باد رفیق
چو سال او خرد خواستیم زهاتف غیب
ندا رسید که بیت العتیق، شد تحقیق

Translation.

In the time of Emperor Jahangir, Mirza Masum
Constructed the *Jama* mosque with the favourable circumstances.
When I wanted the date of its construction from the invisible speaker,
A voice said that verily it had become the "Old House".[3]

The inscription inside the hall above *mihrab* is the following.[4]

يا يها الذين آمنو اذا نودي للصلواة من يوم الجمعة فاسعوا
الى ذكر الله وذر البيع ذالكم خير لكم ان كنتم تعلمون o فاذا قضيت
الصلواة فانتشروا فى الارض وابتغوا من فضل الله ١٠٢٥ ھ

---

[1] Gola or the granary erected in 1786 is a very prominent landmark in Patna from which distances are calculated and mile and furlong stones set up on the roads of the city.

[2] This inscription has also been given in an article on mosques of Patna in Patna College Magazine (March 1913. p. 93) but some words have been wrongly recorded and the translation is incorrect.

[3] Old House meaning Kaaba, the temple at Mecca.

[4] This is from the Holy Quran, chapter LXII, entitled the "Assembly".

Shah. May God preserve his dominion and rule. Founded by Khan Muazzam Nazir Khan, may his eminence be everlasting, in the year nine hundred and sixteen.

No. 2.
Muhammad Murad Shahanshah Sufi's tomb.

The mosque of Sher Shah which is situated in mahalla Dhaulpora, Patna City, is a massive structure unique in shape and construction in Patna. There is a large dome in the middle which is surrounded by four others but smaller in size which are constructed in such a way that not more than three can be seen at a time from any direction the building is observed. Inside at the base of the middle dome there are flowers made in masonry but at the four cardinal points between the flowers there seems to be inscriptions which are quite illegible from the floor. An attempt to read them from a ladder was not found possible as the persons there thought it to be dangerous as the building has become weak having suffered in earthquake and there was fear of its giving way. In the enclosed yard of the mosque near the southern gate is the tomb of Muhammad Murad Shahanshah Sufi who is regarded as a saint and his tomb is held in veneration. From the inscription on the octagonal tombstone it appears that he died in 949 A.H. = 1543 A.D. in the time of Sher Shah but the position of the tomb does not indicate that the mosque was built in his honour.

Inscription

محمد
مراد
شہنشاہ
صوفی
۹۴۹

Translation.

Muhammad
Murad
Shahanshah
Sufi
949

SECTION I.

Inscriptions up to 1707 A. D.

No. 1.

Nazir Khan's inscription in Begu Hajjam's mosque.

The oldest Muslim inscription in Patna is that in Arabic in the mosque known as that of Begu Hajjam which was built by Khan Muazzam Nazir Khan in 916 A.H.=1509-1510 A.D.,[1] in the reign of Allauddin Hosein Shah, King of Bengal, who built mosques and other buildings of utility in every district.[2] The floor of the mosque is paved with glazed tiles of Gaur and there is a beautiful stone doorway at the southern face of the mosque. The building on the other side of the road opposite to the mosque known as Satgharva or seven chambers seems to belong to the same period. Muhammad Beg who is commonly known as Begu Hajjam repaired it in 1056 A.H. = 1646 A.D. (no. 11 *infra*). The presence of this mosque, as has already been observed, indicates that Patna was not neglected even before the time of Sher Shah, who finding it to be of strategic importance built the fort and made other improvements and thus from an insignificant town it rose to a large city.

Inscription.

قال النبی صلی الله علیه و سلم من بنی مسجداً لله بنی الله
له بیتاً مثله في الجنة بنی هذا المسجد الجامع فی عهد السلطان
علاء الدنیا والدین ابوالمظفر حسین شاه السلطان خلد الله ملکه و سلطنة
بانیه خان معظم ناظر خان دام علوه في سنه تسعمائیه و سته عشر

Translation.

The prophet may the blessing of God be on him and peace said "God will make a house for him like it in the heaven who will make a mosque for God". This *Jama* mosque was built in the reign of Sultan Allaudunia-wad-din Abul Muzaffar Husain

---

[1] Mr. J. F. W. James gives 1499 A.D. as the date of construction and 1654 A.D. of the repair by Begu Hajjam (Patna Gazetteer) while Mr. R. L. Sinha gives 1489 and 1654 respectively (Pataliputra). Mr. Sinha has taken 1065 A.H. instead of 1056 A.H. to be the date of repair.

[2] Gholam Hossain Salim's Reazus Salatin, page 135.

Prince Parvez, Abdullah Khan, Shaista Khan, Daud Khan Qurieshi, Saif Khan, Buzurg Umed Khan and Fakhruddowla are the governors whose names are found on them. Amongst others the names of grandees, noblemen (e.g., Moniruddowlah, Koka Khan, Ali Ibrahim Khan, Syed Hedayet Ali Khan, Ali Qassim Khan), poets (e.g., Iurati, Gholam Yehya), saints (e.g. Shah Arzani) appear which throw a flood of light on the local history of the time.

Numeration of dates.

The inscriptions generally show the dates in chronograms according to the *Abjad* or *Jamai* system in which each of the letters has got a numeral. Some of the chronograms give the date according to *Bayanat*. The chronograms are also followed by date in figures. Generally the poet asks the *hatif* or the invisible informer or the wisdom or his heart about the date to which a reply is made in the chronogram. Sometimes when the figures are in excess or if there is any deficiency a hint is given in the previous lines to take out the excess or make up the deficiency, as the case may be, which is called *tamia* and *takhraja*. It is also mentioned in some of the inscriptions not by way of hint but explicitly (e.g., no. 101 *infra*).

No record has been made either of the size or the kind of stone but indication has been given where the inscription is particularly large. The inscriptions are chronologically arranged and have been translated literally. The total number of inscriptions recorded is 112 which is composed as follows:—

Mosques	71
Idgahs	2
Tombs	35
Courts of Justice	2
Imambara	1
Bath	1
Total ..	112

doubt improved the fortifications and assigned separate quarters to nobles, clerks of the government and others and aspired to make the city a second Delhi, "but his ambition was cut short by the fracticidal war that broke out on the death of Aurangzeb in course of which he met his death (1712) by being swallowed up alive in quicksand". Kaleidoscopic changes took places when the Saiyid brothers began to play the part of king-makers. The Mayis pillaged the city more than once. There being no settled life it is not strange that so little mater[illegible] is forthcoming for the period. Only six inscriptions have been recorded, which are thus composed—four from tombs, one from a mosque and one belongs to a court of justice.

(iii) Third section. After the grant of the Diwani in 1765 there was normal life in the city, so for the period 1757—1807 we have got many inscriptions from mosques and tombs. The beautiful mosque with large courtyard and fountains built by Mir Ashraf, the *gomasta* of the East India Company, and the mosque known as that of Fakhruddowla belong to this period. Ashraf Ali Khan, who was foster brother of Muhammad Shah, died in 1186 A. H. and the inscription on his tomb has been described under this head.

(iv) Fourth section. Sufficient material is also found for the fifty years ending with 1857 as there was perfect calm before the disturbance of the Mutiny. The rise of the democracy is noticeable as there are mosques built by barbers, drum-makers and the like. Co-operation is also visible as some of the mosques were built by subscription as their inscriptions indicate. Another characteristic is that many of the mosques under this section were built by women. The inscription in Golakpur mosque (no. 80) which informs that Farrukh Saiyar said his prayer there, belongs to this period.

Important names. Of the sovereigns, the names of Allauddin Hosain Shah (King of Bengal), Emperors Jahangir, Shah Jahan, Aurangzebe, Farrukh Saiyar, Shah Alam appear in the inscriptions recorded.

Burmah. The inscriptions belonging to later years, although numerous have not been noticed, as being modern and of little historical value.

Chief characteristics:

(i) First section.

The inscriptions of the first period are the most important not only because they are the oldest but also as they refer to the royalties, governors, their deputies and other servants. Mostly the inscriptions themselves are beautiful and are found in buildings that are characterised by strength, beauty and grandeur. The oldest inscription found is in the mosque popularly known as Begu Hajjam's mosque on the main road in the city dating 916 A.H. =1509-1510 A.D. The presence of this mosque goes to show that Patna was not neglected even before the days of Sher Shah. The next inscription in point of time is the octagonal headstone dated 949 A.H.=1543 A.D. on the tomb of Muhammad Murad Shahanshah Sufi who lies buried in the compound of the mosque of Sher Shah. No other inscription has been found of pre-Akbar days. Although the Emperor Akbar was himself for sometime in Patna, he was too much engrossed with the war against Daud Khan to construct any building here. Khwaja Kalan's mosque, which bore an inscription as the construction indicates, is now without it. All other inscriptions of this section belong to the reign of Jahangir, Shah Jahan and Aurangzebe. The Roza mosque (Inscription no. 20 *infra*) constructed by Aurangzebe is perhaps the only building in the city which is built by a Moghal emperor.

(ii) Second section.

The next fifty years after the death of Aurangzebe are not marked with any great building and the reason is not far to seek. There was a succession of weak rulers who were not great builders. The governors and their deputies generally imitated their sovereigns. This accounts for the presence of so many buildings of the time of Shah Jahan who was himself fond of them and their absence during the reign of these weaklings. Azimushan, who was governor from 1704 to 1712, no

religious institutions would be acquired for that purpose. The doubts of such persons had to be cleared and correct motive explained to them before the work began at any place. The vastness of the area and the situation of the buildings in lanes increased the difficulty. The main thoroughfare of the old city, the only one which can tolerably be called a street, is much frequented and notice has been taken of the buildings on it but the narrow lanes and the winding alleys which join it were practically unexplored. The ignorance of people of the locality made it necessary to go through all of them to find out any inscription worth recording and although an attempt has been made to make the list complete, owing to the nature of lanes it cannot be claimed that it is exhaustive, as some of the buildings must have escaped notice specially in the eastern part of the city where the work was pushed on hastily.

Divisions of the subject—4 sections.

The subject deals with inscriptions from the earliest time to 1857, the year of the Indian Mutiny, after which no inscriptions have been included as being comparatively modern. Without denying the continuity of the subject it is convenient to divide it into four sections. The first has been taken to commence from the earliest time and to end with the death of Aurangzebe, the last of the Great Moghals in 1707, which is a prominent landmark in Indian history being the date when the Muslim power in India, then at its zenith, began to follow a rapid decline. The remaining one hundred and fifty years are divided into three periods of fifty years each. Thus the next section commencing with the death of Aurangzebe ends in 1757, another memorable year in the history of the country, when the battle of Plassey determined the fate of Bengal, Bihar and Orissa and made the British supreme there. The third section ends after another fifty years, i.e., 1807 and the fourth and last commencing in that year ends in 1857 when the Indian Mutiny broke out after which the East India Company ceased to exist and the Crown assumed direct management of the country and the last of the Moghal kings was deposed and deported to

replace it by his own which instead of showing the repair gloriously indicates the construction of altogether a new structure. Many mosques which were formerly known by a certain name are now called by quite a different one,[1] and if perchance the older inscription is left undisturbed and a new one affixed, both of them show the different names of the founder of the same building![2]

Difficulties in recording inscriptions.

The condition of most of the inscriptions recorded was such that it was impossible to make out anything and some of them were said to be written in obsolete characters and even attempts to decipher them were laughed at. But on close examination it was apparent that years of deposit of dust and lime had made them illegible and after careful washing and scraping they could be easily read. The time taken for it was considerable which can be well understood from the fact that it took no less than five hours to make the old inscription of Dhai Kangura mosque (no. 18 *infra*) perfectly clear. This difficulty was also experienced by Father Gille while recording the inscriptions in Patna Church although only five of the inscriptions were prior to the nineteenth century and the oldest of them belonged to the year 1772. It took his mali "a full day to rub off the chunam and earth in which the lettering of no. 19 lay imbedded".[3] Difficulty in recording the inscriptions was also experienced by the hostile attitude shown by most of the trustees and managers of the mosques and *dargahs* who wrongly thought that it was an attempt to bring them under the arms of law to deprive them of the trust properties which they were misappropriating. The ignorant mass thought that it was a part of the scheme of widening the streets and their

---

[1] *e.g.*, Shaista Khan's mosque at Chowk, Patna City, is now known as Wahid Ali's mosque (vide inscription no. 102).

[2] Bega Hajjam's mosque has got two inscriptions, one showing the construction by Khan Maezzam Nazir Khan (Inscription no. 1) and the other by Muhammad Beg (Inscription no. 11).

[3] Record of the Inscriptions at the Catholic Church at Patna, p. ii.

(iii) Scarcity of stones.

Another reason for the inscriptions being not so numerous is the scarcity of stone in the locality which makes it a valuable object. Instances are numerous where for this reason stone has been carried to places far off. "The old Lakhnauti was robbed to build the medieval capital of Pandua, and later Gaur probably to build Rajmahal while in more recent times their brick and stone were transported as merchandise to Malda, Moorshedabad, Hoogly, Rungpore and even (as regards the more valuable kind of stone) to Calcutta."[1] Even in Patna "ancient carved stones of Gaur, hundreds of miles to the east are found built up into the mosques, *dargahs*, private houses and such fragments of Asoka's city of stone as have been dug up, have been turned to various ignoble uses such as *dhobis* washing stones."[2] When any inscription on stone comes out of its place no opportunity is lost by persons in the neighbourhood to appropriate it to their private use. Father Hosten could not find in the Patna Church 20 out of 30 tombstones mentioned by Father Anathony Mary only 45 years before although there were only seven which could not be deciphered.[3] This is in spite of the fact that the church is enclosed by a high compound wall and is guarded by a gate and servants reside there permanently. The old Muslim buildings being comparatively unguarded there was a greater opportunity to rob them of their inscriptions. Thus large and ancient mosques,[4] tombs of saints,[5] princes[6] and governors[7] and other buildings[8] have been deprived of their inscriptions which they originally must have contained.

(iv) Changes during repairs.

The absence of old inscriptions is also due to the fact that when old buildings are repaired, the repairer often removes the original to

---

[1] Encyclopædia Britannica, ninth edition, Vol. X, page 114, article Gaur.

[2] L. S. S. O'Malley, Patna Gazetteer, page 207.

[3] A record of the inscriptions at Catholic Church at Patna, page vii.

[4] *e.g.*, Khawja Kalan mosque, Mitan Ghat mosque, Mir Jumla's mosque, etc.

[5] *e.g.*, Pir Mansur.

[6] *e.g.*, Mirza Murad.

[7] *e.g.*, Jahangir Quli Khan.

[8] *e.g.*, At the gate of the fort (J.B.O.R.S., Vol. VIII, Pts. III and IV, page 349).

greatest city of the time in the province. Sher Shah from whose reign the greatness of Patna ranks built a fort and planned the city and from that time " Patna became the largest city of the province."[1] Akbar, who was for some time in Patna, left Monim Khan and after him Patna became the residence of the provincial governors of the Moghal emperors and was adorned with beautiful buildings. Thus it is not surprising that with the exception of two, no other inscription previous to the time of Akbar could be recorded.

(ii) Want of interest in old buildings.

But the lack of material is not only due to the fact that the subject has to be dealt with mainly from the sixteenth century. The want of archæological interest in the people allows the buildings to decay and no attempts have been taken in the past for their preservation. " The occupancy of men totally regardless of antiquity ", says Dr. Buchanan, " soon obliterates every trace and it is only in remote and wild parts of the country that the buildings are allowed to remain undisturbed or amongst nations very far civilized that an attention is bestowed on the preservation of monuments of arts. Chehelstoon,[2] the palace of the viceroys of Bihar which has accommodated many personages of royal birth and which fifty years ago was in perfect preservation and occupied by the king's son, can now be traced in a few detached portions, retaining no marks of grandeur and the only remains of a court of justice that had been erected in the year of the Hijri 1142 is a stone[3] commemorating the erection which was dug up in the year 1221 (A.D. 1807) when a police office was about to be erected on the spot where the other had formerly stood which in 79 years from its foundation had been completely obliterated ".[4]

---

[1] " Tarikh Daudi "—Elliot, History of India, Vol. IV, page 478.

[2] Chehelstoon was to the west of the Madrasa mosque on the bank of the river in Patna City. Its western wall is still standing.

[3] It is now affixed in a tomb in Khwaja Kalan police-station, vide inscription no. 26, *infra*.

[4] Buchanan's Journal, J. B. O. R. S., Vol. VIII, parts 3 and 4, page 257; Martin's Eastern India, Vol. I, pages 42-43.

Introduction.

A RECORD of the inscriptions of a city like Patna which has played such an important part in the history of the country cannot but be interesting and useful reading. The inscriptions of the Hindu times are very rare in the city and notice has been taken of them from time to time when the buildings in which they are found have been described or reference has been made to them.[1] A record of the inscriptions at the Catholic Church at Patna has been prepared by the Rev. A. Gille, S. J., with the help of rubbings taken by Mr. J. F. Blakiston, Assistant Superintendent of Archæological Survey, with notes by the Rev. H. Hosten, S. J., and published by the Government of Bihar and Orissa. Father Hosten had also published some of the inscriptions from this church and from other Christian tombs in the city in Bengal: Past and Present, even before it.[2] Father Gille when engaged in recording the inscriptions of the Catholic Church at Patna copied 26 inscriptions in graveyards other than those of the church which Father Hosten promised to publish in some historical review.[3] Thus it will be seen that the inscriptions on the Christian monuments of Patna have also been fully described and published by this time. It is unfortunate that although the city played no mean part during the Muslim times no record of the inscriptions of the Muslim buildings and the monuments has been prepared as yet.

Paucity of materials and its reasons.

(i) Late rise of the city.

In spite of the fact that the city covers a large area the number of inscriptions recorded is not as great as might be expected. This is due to several reasons. Although there are proofs that Patna had already risen from the state of wilderness described by the Chinese traveller Yuang Chwang and was inhabited before Moghal rule it was not a large city. The chief centre of activity whether commercial, political or religious in the locality during that period was Bihar town which was perhaps the

---

[1] *E.g.*, L. A. Waddell, Report on the Excavation of Pataliputra, page 15.

[2] Vol. IX, part I, 1914, pp. 28—34; Vol. IX, part II, 1914, pp. 176—180.

[3] Record of Inscriptions at the Catholic Church at Patna, p. ii.

Books referred in this work.

The Quran.
Encyclopædia Britannica.
Bengal : Past and Present.
Journal, Bihar and Orissa Research Society.
Patna College Magazine.
Beveridge, H. ... The City of Patna (Calcutta Review, Vol. LXXVI, 1883)
Elliot, H. M. ... History of India.
Gille, Rev. A. ... Record of Inscriptions at the Catholic Church at Patna.
Gholam Husain Khan Syarul Mutakhrin.
Ghosh, M. } Pataliputra.
Sinha, R. L. }
Hamilton, Buchanan Journal.
Hand, J. Reginald ... Early English Administration of Bihar.
Hasibullah, Muhammad Tazkiratus Salihin.
James, J. F. W. ... Patna Gazetteer (1924).
Martin, R. M. ... Eastern India.
O'Malley, L. S. S. ... Patna Gazetteer (1907).
Sale, George ... Translation of the Quran.
Salim, Gholam Husain Reazus Salatin.
Sen, G. P. ... Patna during the last days of the Muhammadans (Calcutta Review, Vol. LXXIV, 1882).
Waddell, L. A. ... Report on the excavation of Pataliputra.

Abbreviation.

J.B.O.R.S. ... Journal, Bihar and Orissa Research Society.

S ial no.	Inscription.	Date according to Hijri era.
86	Chowk mosque	1251
87	Shah Karim Bux's mausoleum ...	1252
88	Kaua Khoh mosque	1252
89	Gulzarbagh mosque	1255
90	Shah Gholam Husain's mosque ...	1255
91	Baqargunge mosque	1257
92	Tikia Shah's tomb	1257
93	Fazl Ali's mosque	1257
94	Lawn mosque	1258
95	Idgah (Dargah)	1258
96	Khadim Ali's mosque	1258
97	Ibadullah Shah's mausoleum ...	1260
98	Alamgunge mosque	1261
99	Najaf Ali's tomb	1261
100	Heegan's mosque	1261
101	Dafali's mosque	1263
102	Wahid Ali's mosque	1263
103	Shish Mahal private mosque ...	1264
104	City Court mosque	1265
105	Mir Abdullah's tomb	1265
106	Mehdi Ali Khan's tomb	1266
107	Nai Sarak mosque	1270
108	Mian Khan's tomb	1271
109	Shaikh Heegan's mosque	1271
110	Muhammadi Khanum's tomb ...	1272
111	Baqargunge lane mosque ...	1275
112	Headstone of Bibi Latifan's tomb ...	1276

Serial no.	Inscription.	Date according to Hijri era.
59	Keating's mosque	1212
60	A tomb in Sultan Dumba's mosque ...	1212
61	Roshan Muhammad Khan's tomb ...	1213
62	Husaini Begam's mosque ...	1214
63	Hajigunge mosque	1217
64	Madaroo's mosque	1217
65	Kashmiri Bagh mosque	1219
66	A child's tomb	1219
67	Mirza Aziz's tomb	1223
68	Bibi Man's tomb	1223
69	Shah Hassan Ali's tomb	1224
70	Dhoulpora mosque	1227
71	Qilia mosque	1229
72	Shah Rustum Ali's tomb ...	1230
73	Muradunnissa's mosque	1233
74	Pagal Khana mosque	1233
75	Moradpore mosque	1234
76	Shah Hamza Ali's tomb	1236
77	Gorhatta choti masjid	1240
78	Shaikh Bihari's mosque	1240
79	Kazim Ali's mosque	1241
80	Baam Saheb's mosque	1243
81	Nagla mosque	1244
82	Asalat Khan's mosque	1244
83	Balkhi Saheb's mosque	1247
84	Golakhpur mosque	1248
85	Bath	1249

S. N no.	Inscription.	Date according to Hijri era.
25	.ah Shabaz's mausoleum	1126
26	Court of Justice (Hassan Ali's) ...	1142
27	Malsalami [illegible]	1150
28	Shah Basant's mausoleum	1158
29	Rahimunnisa's tomb	1160
30	Moniruddowla's tomb	1173
31	Mir Afzal's tomb	1174
32	Shah Karimullah's mausoleum ...	1185
33	Koka Khan's tomb	1186
34	Mir Ashraf's mosque	1187
35	Mir Ashraf's tomb	1189
36	A lady's tomb in Mir Ashraf's compound	1189
37—39	Shish Mahal mosque	1190
40	Gorhatta Bari Masjid	1191
41	Danka-ki-imli mosque	1196
42	Hakim Saiyid Ahmad Husain's tomb ...	1198
43	Mir Ali Ibrahim's tomb	1199
44	Dooly Ghat mosque	1200
45	A lady's tomb	1201
46	Fakhruddowla's mosque	1202
47	Lodikatra mosque	1202
48	Nurpur imambara	1203
49	Uparka Bazar mosque	1203
50—54	Gholam Yehya's mosque	1207, 1208
55	Bulaki's mosque	1208
56	Shah Gholam Husain's mausoleum ...	1211
57 & 58	Mir Madarullah's mosque ...	1211

Old Muslim Inscriptions at Patna.

By Syed Mohammad, B.A., B.L.

List of inscriptions.

Serial no.	Inscription.	Date according to Hijri era.
1	Begu Hajjam's mosque (Nazir Khan's inscription).	916
2	Muhammad Murad Shahanshah Sufi's tomb.	949
3—5	Mirza Masum's mosque	1025, 1025
6 & 7	Mausoleum of Shah Arzani ...	1026, 1032
8	Stone mosque	1036
9	Idgah (Saif Khan)	1038
10	Madrasa mosque	1039
11	Begu Hajjam's mosque (Muhammad Beg's inscription).	1056
12	Haji Chand's mosque	1056
13	Tombstone in Rajab's mosque ...	1059
14	Doondi Bazar mosque	1061
15	Shah Sajawal's tomb	1064
16 & 17	Dargah mosque	1070
18	Dhai Kangura mosque	1072
19	Court of Justice (Jafar's)	1074
20	Roza mosque	1078
21	Ambar's mosque	1100
22	Buzurg Umed Khan's mosque ...	1100
23	Sultangunge mosque	1114
24	Shah Kaley's mausoleum	1124

Editor's Note

The present work "Old Muslim Inscriptions of Patna" by Late Syed Mohammd, was published in 1930 in the "Bihar and Orissa Research Society Journal", Patna, in the form of an article. Publication of the work, independently, in a book form, was long overdue. Khuda Bakhsh Library, while publishing Fasihuddin Balkhi's Urdu work on the subject, considered it desireable that Syed Mohammad's be also published afresh to enable a scholar and an interested reader to have a comprehensive study.

A.R.B.

Contents

1992

Price Rs.75/-

Printer	: Liberty Art Press, 1528, Pataudi House, New Delhi
Publisher	: Mustafa Kamal Hashmi for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone 650109, Tlx. 22-430 KBL IN)
Editor	: Dr. A. R. Bedar
Annual Subscription	: Rs.300/- (Inland) U$ 60 (Asian Countries) U$ 120 (Other Countries) Price (this issue) Rs. 75/-.

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

78 - 80

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL



78 – 80

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA